مئی 2018

ماہنامہ

کرن

کرن کا دسترخوان

جاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز



بیادِ محمود ریاض

انٹرویو

ناول

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے



مستقل سلسلے

مئی 2018

جلد 41 شمارہ 2

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

رمضان المبارک کا رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ ہم پر سایہ فگن ہونے والا ہے۔

رمضان المبارک اسلامی سال کا نواں مہینہ ہے جسے اس کی بے پناہ فضیلتوں کی وجہ سے مہینوں کا سردار کہا جاتا ہے۔ اس ایک ماہ میں انسان کو جتنی برکات حاصل ہوتی ہیں، وہ پورے سال کی مجموعی برکات سے بہت زیادہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لیے قرآن پاک اسی ماہ میں نازل فرمایا۔ قرآن پاک کی تلاوت کا بہت اجر و ثواب ہے لیکن اس کے اصل مفہوم تک رسائی کے لیے اس کا ترجمہ و تفسیر پڑھنا ضروری ہے۔ رمضان المبارک کی برکات سے فیض یاب ہونے کے لیے قرآن پاک کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے معنی اور مفہوم پر بھی غور کرنا چاہیے۔

رمضان کا اصل مطلوب تقویٰ اور تزکیہ نفس ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، غیر ضروری باتوں، بحث و مباحثہ، لڑائی جھگڑے، غصہ اور زبان کے غیر محتاط استعمال سے گریز کریں۔

رمضان المبارک ہماری دنیا اور آخرت کی بہتری کے لیے ایک ماہ کا تربیتی پروگرام ہے — اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مہینے کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمود ریاض صاحب،

بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ دوسروں کے لیے راستے بناتے ہیں۔ ان کے لیے آسانیاں مہیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا سے رخصت ہو جائیں تب بھی ان کے کام ان کا نام زندہ رکھتے ہیں۔ محمود ریاض صاحب کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔

انہوں نے خواتین ڈائجسٹ، کرن اور شعاع کا اجرا کیا جس سے بے شمار خواتین کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کا موقع ملا۔ انہوں نے علم و ادب کی جو شمع فروزاں کی، اس نے بے شمار ذہنوں کو روشن کیا۔

محمود ریاض صاحب آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی یادیں ہمارے ساتھ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

۱۵ مئی کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- بیاد محمود ریاض،
- "ماں جیسی چاہت کہاں" مدرز ڈے کے موقع پر مشہور شخصیات سے شاہین رشید کا سروے،
- فنکارہ "سینتا مارشل" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- فنکارہ "ماہم عامر" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ "ثانیہ مشعل اشرف" کے مقابل ہے آئینہ"
- "شب نم کی سحر" رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- "من عاجزم من بے کسم" ام طیفور کے مکمل ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
- "دردِ آشنا" شبانہ شوکت کا مکمل ناول، "ایک نظر چاہیے" صدف عمر کا مکمل ناول،
- "غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ ریاض کا ناولٹ، "دستِ شفا" نور احمد کا ناولٹ،
- میمونہ صدف، تمثیلہ زاہد، شمائلہ دلعباد، افشانہ آفتاب اور شمسہ الطاف کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

"کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

میرا رب سب کا ہی حاجت روا ہے
وہ مانگو جو بھی جائز مدعا ہے

سراپا مغفرت ہے ذات اس کی
خطا پوشی تو اس کی اک ادا ہے

وہی تو چارہ گر ہے کُل جہاں کا
مصائب میں وہی مشکل کشا ہے

سمجھ سے بالا ہے حکمت خدا کی
کسی پہ اس کا عقدہ کب کھلا ہے

ہے اس کے حسن کی رعنائی ہر سو
وہی از ابتدا تا انتہا ہے

ہر اک نعمت ملی اقبال کو بھی
یہ سب اس کا کرم اس کی عطا ہے

اقبال آرزو

نعت رسولِ مقبولؐ

مدح سرکار ہے کس کے دامان میں
آپؐ کی مدحتیں تو ہیں قرآن میں

اس کو کہتے ہیں تکمیلِ انسانیت
ساری اچھائیاں ایک انسان میں

وہ مجسّم شریعت، سراپا یقین
بولتی آیتیں شکلِ انسان میں

ہم نبیؐ کی محبت سے باہر کہاں
یہ محبت تو شامل ہے ایمان میں

اسوۂ مصطفےٰؐ کا چراغ آج بھی
جل رہا ہے ہواؤں کے طوفان میں

دیکھ محشر وہ چشمِ خطا پوش اٹھی
دفعتاً کیسی جنبش ہے میزان میں

محشر بدایونی

بیادِ محمود ریاض



برگد کا پیڑ

ایمل رضا

برگد کے پیڑ کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ یہ اتنا نہیں پھلتا ہے جتنی اس کی سکت ہوتی ہے بلکہ یہ اتنا پھیلتا ہے جتنا لوگوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کسی گاؤں میں چلے جائیں۔ وہاں چوپال پر لگے برگد کے حجم کو دیکھ کر اس گاؤں کی کل آبادی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ گاؤں کے باسی جتنے زیادہ ہوں گے، وہاں کا برگد بھی اتنا ہی وسیع اور گھنا ہوگا۔ چھاؤں بڑی سکون آور ہوگی۔ سارے اہم فیصلے اسی کے زیر سایہ ہوں گے۔

یہ بڑا درویش صفت ہے، کسی کا راز عیاں نہیں کرتا۔ سب گپت رکھتا ہے۔ کیسے بھی طوفان آئیں، یہ شان سے کھڑا رہتا ہے، کسی کو سائے سے محروم نہیں کرتا۔ کوئی تشخیص نہیں، ذات پات کی پوچھ پڑتال نہیں کرتا۔

گاؤں اور باغوں کے وسط میں جہاں آپ کو ایسے وسعت بھرے برگد ملیں گے وہیں انسانی بستی کے چوپالوں پر بھی آپ کا سامنا ایسے انسانوں سے ہوگا جو برگد جیسی فیاض خصوصیات رکھتے ہوں گے۔ ایسے انسان اپنی سکت سے کہیں زیادہ اس ضرورت کے تحت پھیل کر سایہ فگن ہونے لگتے ہیں جتنی دوسروں کو طلب ہوتی ہے۔ جو سوال نہیں کرتے، جواب بنتے ہیں۔ جو، ''تم کون ہو'' نہیں پوچھتے۔ ''تم یہ ہو۔ تم میں یہ قابلیت ہے'' کا عملی مظہر بنتے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کے بانی......محمود ریاض بھی ایک ایسا ہی پیڑ ہیں۔ برگد کا بھید بھرا اور فیاض پیڑ......جس کی جڑیں تو کراچی کے اردو بازار میں ہیں لیکن اس کی شاخوں کا پھیلاؤ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان کا قاری اس پیڑ کی چھاؤں تلے خود کو محفوظ کر رہا ہے۔ سستا رہا ہے۔ آرام کر رہا ہے۔ ہر نوع کی کہانی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کہیں کسی کہانی سے زندگی کا مقصد اخذ کر رہا ہے تو کہیں اپنی غلطیوں یا لغزشوں کا ازالہ کر رہا ہے۔ کہیں خود کو تلاش کر رہا ہے، تو کہیں خود کو پا بھی چکا ہے۔

ہماری وہ خواتین جو گھروں میں بند تھیں۔ اس پیڑ کی ہوا ان کے لیے بادِ صبا ثابت ہوئی ہے اور وہ خوشی سے سانس لینے لگیں کہ ان کے سینوں میں جو جذبات تھے، انہیں الفاظ مل گئے ہیں۔ کوئی ان کے دکھ درد جانتا ہے۔ کوئی انہیں سکھ کے راستے دکھا سکتا ہے۔ کوئی انہیں بھی زندگی کے سبق پڑھا سکتا ہے۔



شان سے ڈٹ کر کھڑے رہنے اور ہمت و حوصلے کی مثال بن جانے پر راغب کر سکتا ہے۔

خواتین نے کہانیوں کے ذریعے نام بنایا تو گھر والوں کو احساس ہوا کہ عورت بھی کچھ کر سکتی ہے۔ بے جا پابندیاں اٹھا لی گئیں اور پاکستان کی عورت نے اس پیڑ کی چھاؤں تلے خوب خوب ترقی کی......اتنی ترقی کہ اخباروں میں ان کی کامیابیوں کے قصے آنے لگے۔ میگزینوں میں ان کی بابت لکھا جانے لگا۔ ٹی وی پر ریکارڈ پر ریکارڈ بننے لگے۔

کون کہتا ہے کہ انسان مرجاتے ہیں۔ جو کچھ کر جاتے ہیں، وہ امر ہو جاتے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت خواتین ڈائجسٹ ہے۔ یہ پیڑ پہلے سے زیادہ ترو تازہ ہے۔ پہلے سے زیادہ طاقت ور ہے اور پہلے سے زیادہ بڑا ہو چکا ہے۔

محمود ریاض صاحب جہاں کہیں سے بھی اس پیڑ کو دیکھتے ہوں گے یقیناً بہت خوش ہوتے ہوں گے۔

☆☆

نرم لہجہ مہربان آنکھیں

فوزیہ فرخ

یہ ۱۹۹۸ کی بات ہے۔ جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا اس روز میں پہلی بار خواتین ڈائجسٹ کے دفتر گئی۔ امثل، سائرہ اور فاطمہ سے ملاقات ہوئی، بات چیت چل رہی تھی کہ امثل کو ایک دم خیال آیا اٹھتے ہوئے بولیں۔

''چلیں' آپ کو ریاض صاحب سے بھی ملوادوں۔''

امثل نے لفظ ریاض اتنی تیزی سے ادا کیا کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔ میری سماعت نے صرف لفظ ''صاحب'' سنا۔ اب جوان کے ساتھ جاتی ہوں تو ایک انتہائی نرم خو، مرنجان مرنج نظر آنے والی شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک رعب جو کسی ادارے کے مدیر کے نام سے خود بخود ذہن پر طاری ہوجاتا ہے۔ وہ مجھ پر پہلے ہی نہیں تھا۔ چنانچہ میں بہت اعتماد سے ان کے سوالات کا جواب دیتی رہی اور سوالات بھی ذرا سنیے۔

''کہاں رہتی ہو؟''

میں نے نام بتایا۔ حیران ہوگئے۔

''ہیں۔ اتنی خطرناک جگہ، تم تو بہت ہی بہادر لڑکی ہو۔''

اب میں خوش' پہلے ہی سوال پر بہادری کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔

اگلا سوال ایک آفر پر مبنی تھا۔

''شعاع کے لیے قسط وار ناول لکھوں گی؟''

''کیوں نہیں۔'' اتنی اچھی پیش کش کا اور کیا جواب ہوسکتا ہے۔

پھر کچھ دیر ناول سے متعلق باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد میں نے اجازت چاہی۔ وجہ یہ بیان کی کہ بھائی (فیصل) انتظار کررہے ہیں۔

''ارے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ فوراً بلاؤ اور ابھی تم لوگ آرام سے بیٹھو۔ کچھ کھا پی کے جانا۔''

''وہ...... اصل میں آج ان کا مایوں ہے۔ تو اس لیے۔'' میں نے اٹک اٹک کر کہا۔

''افوہ...... لڑکی تو انکشاف پہ انکشاف کیے جارہی ہے۔ یعنی کہ مایوں کے دولہا کو پکڑ لائی۔'' انہوں نے امثل سے مخاطب ہوکر کہا۔

اب امثل نے سوچا، مزید انکشاف کردوں۔ چنانچہ انہوں نے یہ بھی بتادیا کہ اگلے دن خود موصوفہ یعنی میرا مایوں بھی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ مگر تھوڑے فکر مند بھی۔

''چلو شاباش۔ پہلے تم سلسلہ وار ناول لکھنے کا وعدہ کرلیا۔ اس کے بعد شادی کی خوش خبری سنا رہی ہو۔ اب ناول کیسے پورا ہوگا؟''

''ہوجائے گا سر! آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے تسلی دی۔

اور شکر ہے کہ یہ وعدہ ایفاء ہوا۔

(یہ علیحدہ بات ہے کہ اس میں میرے بہن بھائیوں اور سب سے بڑھ کر فرخ کا بہت تعاون شامل تھا) مگر بہرحال' مجھے خوشی ہے کہ میں نے ریاض صاحب کو مایوس نہیں کیا۔

ہاں' انہوں نے بہت مایوس کیا۔ اتنی جلدی اپنے ساتھیوں' عزیزوں اور ہم عصروں کو اداس چھوڑ کر چلے گئے۔ اور پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اور وہ ملاقات جو پہلی تھی، آخری ثابت ہوئی۔ ذہن کے دریچوں میں اب بھی وہ نرم لہجہ، مہربان آنکھیں دستک دیتی ہیں۔

☆☆

ماں اور باپ، اس دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ ہیں۔ ان دونوں کے وجود سے ایک نسل جنم لیتی ہے اور ان دونوں کی اچھی تعلیم وتربیت سے یہ نسل پروان چڑھتی ہے اور ملک وقوم اور اس معاشرے کو سنوارتی ہے۔ اور پھر یہ کام نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ اللہ کے اس تحفے کی ہم جتنی قدر کریں کم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں مدرز ڈے اور فادرز ڈے نہیں منانا چاہیے اور میں کہتی ہوں کہ ہم کوئی دن منائیں یا نہ منائیں مگر مدرز ڈے اور فادرز ڈے ضرور منائیں لوگ کہتے ہیں کہ ماں باپ کے لیے تو ہر دن ہونا چاہیے اور میں کہتی ہوں کہ اس افراتفری میں کے دور میں اور مصروفیات کے دور میں ماں باپ کا حال چال پوچھنے کا تو ٹائم ملتا نہیں، ہر دن کیسے ان کا دن ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس دن ضرور منائیں محبت کا اظہار کریں کیونکہ محبت اظہار مانگتی ہے تحفہ ضرور دیں کیونکہ تحفہ دینا محبت کے اظہار کا بہترین طریقہ ہے۔

☆ ''سوال''

1۔ آپ کی نظر میں مدرز ڈے کی کیا اہمیت ہے۔ کیا یہ دن منانا چاہیے؟

2۔ ماں سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ مگر کیا آپ کی زندگی میں کوئی ایسی شخصیت ہے جس نے آپ کو ''ماں'' کی طرح چاہا ہو؟

ماں جیسی چاہت کہاں

شاہین رشید



ڈاکٹر شکیل: Consultant Diabetologist

میرے نزدیک ''مدرز ڈے'' کی بہت اہمیت ہے اور میں مدرز ڈے ضرور مناتا ہوں۔ دنیا میں سب سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت کرنے والی ہستی ''ماں'' کی ہی ہوتی ہے۔ اور جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ماں کے نام میں نے ایک قطعہ لکھا ہے کہ

دھوپ لگتا ہے وہ بھی اب ہم کو
سر پر جو سائبان رہتا ہے
ہم نے دیکھا ہے خالی رستہ بھی
منزلوں کا نشان رہتا ہے

میں نے بے شمار لوگوں کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا ہے ان کی زبان پر آخری لفظ ''ماں'' تھا۔

2۔ دنیا میں ایک ہستی ایسی ہے جس نے مجھے ''ماں'' کی طرح چاہا۔ وہ میری انگریزی کی ٹیچر جو کہ سیکنڈری کلاس کو پڑھاتی تھیں۔ ''مسز عشرت عالم'' تھیں۔ جو کہ ٹاؤن کمیٹی اسکول G-5 نارتھ کراچی میں ہمیں پڑھایا کرتی تھیں۔ ہم پڑھنے میں تیز تھے۔ مس کو تنگ کیا کرتے تھے۔ تو وہ بہت رویا کرتی تھیں اب پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ لیکن وہ بھی ''ماں'' کی طرح جدا ہوگئیں۔ اللہ پاک انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

مصباح نوشین (رائٹر، عشق تماشا)

1۔ ذاتی طور پر مجھے یہ دن بہت پسند ہے اور اسے سیلیبریٹ کرنا اس سے بھی زیادہ...... یہ سچ ہے کہ محبت کے اظہار کا کوئی ایک دن مخصوص نہیں ہوتا۔ لیکن آج کل تیز رفتاری کے دور میں والدین کو ٹائم دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن ایسے میں سال کے ہر دن نہ سہی مگر کسی ایک دن ہی سہی، اگر ہم اپنے ماں اور باپ کو ان کی اہمیت کا احساس دلائیں تو یہ بہت بڑی بات ہے میں عام طور پر اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کرنے میں ناکام رہتی ہوں۔ لیکن مدرز ڈے ہو یا فادرز ڈے۔ میں اپنے ابو امی کے لیے کوئی نہ کوئی گفٹ یا ان کی ضرورت کی چیز انہیں ضرور گفٹ کرتی ہوں۔ کیونکہ مجھے اپنی ان پیاری ہستیوں کو تحائف دینا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور ایسے موقع پر ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔

2۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے اور اس کا نعم البدل دنیا میں اگر کوئی ہے تو وہ بڑی بہن ہی ہوسکتی ہے اور آپ کے سوال کے جواب میں میں اپنی بڑی بہن ''مہرین'' کا نام لینا چاہوں گی۔ امی کے بعد اگر ماں جیسی محبت مجھے کسی ہستی نے دی ہے تو وہ میری بڑی بہن ہے۔ میں چھوٹی تھی تو امی کے آپریشن کی وجہ سے باجی نے مجھے سنبھالنا شروع کیا۔ جو اس وقت خود بھی چھ یا سات سال کی تھیں۔ لیکن وہ ایسا اٹوٹ رشتہ ہے کہ ہم تینوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں اور ایک ہی وقت میں ہم ایک ہی بات سوچ رہے ہوتے ہیں۔ سو اس لحاظ سے امی اور بہن دونوں ہی میرے لیے ''ماں'' کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور اگر آج میں اس مقام پر ہوں تو اپنی بہن کی وجہ سے۔ کیونکہ سب سے پہلے اسی نے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور میری امی اور میری بہن ہمیشہ میری ہر کامیابی پر مجھ سے زیادہ خوش ہوتی ہیں اور میرے لیے ہمیشہ دعاگو رہتی ہیں۔



وجیہہ ثانی (اینکر پرسن جیو نیوز)

1۔ اللہ تعالیٰ سب کی ماؤں کو سلامت رکھے صحت وتندرستی کے ساتھ اور میری نظر میں ہر دن ماں کا دن ہوتا ہے۔ جن کی مائیں سلامت ہیں ان کو 365 دن یہ دن منانا چاہیے لیکن چونکہ اب مدرز ڈے منانے کی روایت پڑ گئی ہے تو ہم بھی مناتے ہیں۔ اور سچ بتاؤں تو مجھے تو یہ دن یاد بھی نہیں رہتے جبکہ میری بیگم کو اس طرح کی محبت کا ہر دن یاد رہتا ہے اور وہی مجھے بھی یاد دلاتی ہے کہ امی کے لیے جوڑا لانا ہے۔ امی کے لیے پھول لانے ہیں ان کے لیے اہتمام کرنا ہے اور پھر ان کی پسند کی چیز یا جوڑا پھولوں کے ساتھ پیش کرتا ہوں اور چونکہ میری والدہ میرے ساتھ رہتی ہیں اس لیے میں تو 365 دن ان کو پیار دیتا بھی ہوں اور پیار لیتا بھی ہوں۔

2۔ ''ماں'' کا مقام بہت اونچا ہے اور ماں جیسی محبت کوئی نہیں دے سکتا۔ میری والدہ نے مجھے بڑے ناز ونعم سے پالا ہے۔ میں بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہوں مگر بیٹوں میں میرا نمبر پہلا ہے تو مجھے بہت محبت اور بہت شفقت ملی۔ مگر اعتدال کے ساتھ کہ کہیں بچہ بگڑ نہ جائے۔ میری والدہ چونکہ ٹیچر تھیں تو پڑھائی کے معاملے میں بھی تھوڑی سختی کی۔ بلکہ پٹائی بھی ہوئی۔ اچھا رزلٹ آتا تو انعام واکرام

سے بھی مجھے نوازا جاتا۔ تہذیب واخلاق کے معاملے میں کافی سخت تھیں اور ہم اپنی ماں کی آنکھ کا اشارہ سمجھا کرتے تھے کہ والدہ کیا چاہ رہی ہیں۔ ہم بڑے فرمانبردار بچے تھے اور امی کو اس وقت بہت فخر ہوتا جب محلے کے خواتین و حضرات میری تعریف کیا کرتے تھے۔ اللہ امی کو صحت دے۔ سلامتی دے تندرستی دے، طاقت دے، توانائی دے (آمین)
''ہیپی مدرز ڈے امی''۔



فرح محمد (شیف+اداکارہ)

''مدرز ڈے'' اس دن کو ضرور منانا چاہیے۔ سب کہتے ہیں کہ ''ماں'' کے تو سارے دن ہوتے ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ بے شک ماں کے سارے دن ہوتے ہیں، ہم ان سے جتنی محبت کریں پیار کریں کم ہے لیکن ''دن'' کو منانے کی وجہ یہ ہے کہ اس دن کو ہم اسپیشل طریقے سے منائیں کیونکہ یہ دن ان کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے میں یہ مثال دوں گی کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہم اس بچے کو روزانہ ہی پیار کر رہے ہوتے ہیں۔ روزانہ ہی لاڈ اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس کی پیدائش کا دن آتا ہے تو ہم اس کی ''برتھ ڈے'' اسپیشل طریقے سے منا رہے ہوتے ہیں۔ گھر سجاتے ہیں۔ کیک لاتے ہیں۔ اس کے دوستوں کو بلاتے ہیں۔ یعنی ایک خاص اہتمام کرتے ہیں کہ یہ اس کے لیے ایک اسپیشل دن ہوتا ہے۔ اس طرح مدرز ڈے کو اسپیشل طریقے سے منانا چاہیے تا کہ ماں کو خوشی ہو۔ احساس ہو کہ میرے بچوں نے میرے لیے دن منایا ہے کیونکہ ماں کی ''برتھ ڈے'' تو بہت کم لوگ سیلیبریٹ کرتے ہیں مگر یہ ''دن'' ضرور منانا چاہیے اور ماں کو گفٹ بھی دینے چاہیے۔

2۔ سچ پوچھیں تو میری زندگی میں کوئی بھی نہیں ہے کہ جس نے مجھے ماں کی طرح چاہا ہو...... اس دنیا میں سارے رشتے مطلب کے ہوتے ہیں۔ آپ کی حیثیت کے مطابق ہوتے ہیں آپ جس حیثیت کے ہوں گے رشتہ بھی اسی لیول کا ملتا ہے اور جس کو آپ سے کام ہو وہ آپ سے رشتہ بنالیتا ہے۔ کام ختم تو رشتہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا ہے۔ تو میری زندگی میں تو کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ ہاں...... میری بڑی بہن نے تھوڑا بہت ماں کا کردار ادا کیا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ کوئی بات ہو تو برداشت کرلینا۔ کسی بات کو سمجھانا اور انڈراسٹنڈ کرنا میری باتوں کو جو ایک ماں کرتی ہے۔ مگر پراپر ماں کی طرح نہیں۔ ماں کا رشتہ تو بہت الگ سے ہوتا ہے۔ بہت منفرد ہوتا ہے۔



عدیل رزاق: رائٹر

''مدرز ڈے'' گورے اور ترقی یافتہ ممالک کا دن ہے۔ وہ معاشرے، فرد کی آزادی اور مرضی کے

معاشرے ہیں۔ وہاں نابالغ بچوں کو بھی اپنی شخصیت سازی کا پورا پورا موقع دیا جاتا ہے اور یوں وہاں تقریباً ہر فرد انفرادی حیثیت اور شخصیت کے طور پر معاشرے کا ایک فعال پرزہ بن کر ابھرتا ہے۔ اس لیے وہ جذباتی طور پر وابستہ رشتوں کے لیے دنوں کو مخصوص کرتے ہیں۔ جیسا کہ ''مدرز ڈے''، ''فادرز ڈے'' اور ایسے ہی کئی دن

ہمارے ہاں مجھے اس دن کی عقلی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہمارے یہاں تو یہ عالم ہے کہ بچوں کے بچے ہوجاتے ہیں تب تک بھی ماں کا انفلونس ہم سب کی زندگیوں پر قائم رہتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں ''ماں'' ہر شخص کی زندگی میں لازم وملزم اور کلیدی کردار کے طور پر موجود ہے۔ ''ایجوکیشن''، پسند کے کپڑے پسند کی شادی، دیر تک باہر رہنے بلکہ گھر میں رہنے کے لیے بھی ہمیں اپنی ماؤں کی خوشنودی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ آسان کرکے کہوں تو یہاں ہر دن ماں کا دن ہے اور کبھی کبھی یہ انفلونس تعمیر سے زیادہ تخریب کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ بچے اپنے صحیح یا غلط فیصلے لینے میں ڈرتے ہیں۔ بلکہ ڈرتے رہتے ہیں اور پوری زندگی گزار کر بھی خود مختاری کی زندگی نہیں جی سکتے۔ بہرحال یہ دن برا نہیں ہے۔ لیکن ہم نے اس کی روح کو جذباتی طور پر نبھایا ہے اور اس کی منطقی وجہ پر بھی غور نہیں کیا۔ پھر بھی میں مدرز ڈے کو محبت کے ایک بہترین دن کے طور پر دیکھتا ہوں میں باقاعدہ طور پر مدرز ڈے نہیں مناتا لیکن میرا ماننا ہے کہ مدرز ڈے اپنی جذباتی خامیوں کے باوجود بے ضرر دن ہے اور اسے اپنی ماں کے ساتھ سیلیبریٹ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

2۔ یہ سو فیصد سچ ہے کہ ماں سے زیادہ کوئی اور عورت آپ کو چاہ ہی نہیں سکتی۔ میری زندگی کی بھی بہت ساری اچھی چیزوں کی وجہ اور بنیاد میری ماں ہی بنیں۔ جس کے لیے میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ کبھی کبھی ''اماں'' کے اور میرے درمیان کمیونیکیشن گیپ آجاتا ہے۔ لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی بات کبھی سمجھ ہی نہیں پائیں گے۔ لیکن اس رشتے کی سب سے پیاری بات یہی ہے کہ ہزار اختلافات کے باوجود اس رشتے کا خلوص اور پیار کبھی کم نہیں ہوتا۔



حنا ہنجرا (ماڈل+اداکارہ)

میں ہر تہوار بہت جوش وخروش کے ساتھ مناتی ہوں۔ ویلنٹائن ڈے ہو یا میرا جنم دن۔ میرا اپنا خیال ہے کہ خوشیاں نئی سجائی پلیٹ میں نہیں ملتیں۔ انہیں لگز رتے وقت سے کشید کرنا پڑتا ہے۔ آج کے اس یاسیت بھرے دور میں جب انسان، انسان سے بےزار رہتا ہے کسی کے پاس کسی کے لیے ٹائم نہیں تو یہ تہوار ایک دوسرے سے دوری کا احساس نہیں دلاتے۔ ایک ساتھ وقت گزارنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا ہے۔ مدرز ڈے کی میری نظر میں بہت اہمیت ہے۔ میں اپنی بورڈنگ لائف کی وجہ سے اپنی ماں سے بہت دور رہی ہوں اس لیے میرے لیے یہ دن بہت اہمیت کا حامل ہے اور مجھے چاہے کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو، اپنی ماں سے ملنے اس دن گاؤں ضرور جاتی ہوں اور ساتھ ہی کیک، پھول اور خوب صورت کارڈز ضرور لے جاتی ہوں اور کارڈز اپنے ہاتھوں سے بناتی ہوں جو میری ماں دیواروں پر لگاتی ہیں امی کے کمرے کی دیواروں پر میرے ہی ہاتھ کے بنے کارڈ چپاں

ہیں۔ جب تک گاؤں میں رہتی ہوں ان کے ساتھ لیٹ کے سوتی ہوں۔ میرے وش کرنے اور سرپرائز دینے کے اسٹائل بھی میری طرح یونیک ہی ہوتے ہیں۔

2۔ بے شک قدرت کا حسین تحفہ اس زمین پر ''ماں'' کا ہے۔ خدا نے فرشتوں کا روپ انسانی رشتوں میں ''ماں'' کو دیا ہے۔ اس دنیا میں ماں سے بڑھ کر نہ مخلص رشتہ مل سکتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ مگر میری زندگی میں ایک ایسا رشتہ، ایک ایسا تعلق اور ایسا دوست موجود ہے کہ جس کے پیکر کو خدا نے محبت، خلوص اور انسانیت کی محبت سے بھر کر اس دنیا میں بھیجا ہے جس کے ہونے کا احساس اور موجودگی مجھے احساس دلاتی ہے کہ نفانفسی کے اس دور میں ایسے پیارے اور مخلص رشتے موجود ہیں۔ میری عزیز از جان دوست میری بڑی بہنوں جیسی میری سہیلی جس سے مجھے اپنی ماں کی خوشبو آتی ہے اس کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ گزشتہ دس سال سے پاپولر فکشن لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان نام ''نایاب جیلانی'' ہے جس کے ہزاروں پرستار ہیں وہ میری پرستار ہے اور میں اس کی پرستار ہوں۔ بچپن سے لے کر آج تک ہم ایک ساتھ ہیں مجھ یاد ہے کہ میں اسکول میں ''میم'' کی نگاہ سے چھپ کر نایاب کے گھر چھپ جاتی تھی۔ ٹیچر کی ڈانٹ سے گھبرا کر میں نے اس کی آغوش میں پناہ لی۔ اس نے میری بہتی ناک سے لے کر اب تک میرے سارے شوق پورے کیے۔ اس کے علاوہ میری زندگی میں ایسا لمحہ بھی آیا جب میں بند گلی میں کھڑی تھی اور زندگی سے مایوس ہو چکی تھی تب نایاب ہی تھی جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جینا سکھایا اور آج بھی میری پریشانیاں وہی دور کرتی ہے میں آپ کے ڈائجسٹ کے ذریعے نایاب کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں اسے کتنا پیار کرتی ہوں۔ اور اس سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ''نایاب تم ناولسٹ سے لے کر ڈرامہ رائٹر تک یا کچھ بھی بن جاؤ میرے لیے وہی بجو میری بجیا ہو میری ماں، میری دوست اور میری شفیق بہن ہو۔



زاہد احمد (آرٹسٹ)

1۔ میری والدہ کا تو انتقال ہو چکا ہے اور مدرز ڈے پر میں خاص طور پر ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری والدہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے جہاں وہ بہت سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں اور خوش رہیں اپنی جنت میں۔

2۔ میں اپنے کام کو ''ماں'' سمجھتا ہوں اور وہ مجھے پیار اور عزت دیتا ہے۔

ڈاکٹر مدیحہ لطیف: سائیکو جسٹ

1۔ میں مدرز ڈے سیلیبریٹ نہیں کرتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ ماں کا ہم سے جو رشتہ ہے اسے ہمیں 365 دن سیلیبریٹ کرنا چاہیے اس رشتے کی جو اہمیت ہے اسے کسی ایک دن پر مختص نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے میں اس دن کو خاص طور پر سیلیبریٹ نہیں کرتی۔

2۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ماں کے رشتے کا کوئی نعیم البدل ہو نہیں سکتا جتنا غیر مشروط پیار، خیال، محبت یہ رشتہ دیتا ہے کوئی دے ہی نہیں سکتا۔ دوسرے



رشتوں کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ دوسرے بہت سارے رشتوں نے ہمیں پیار دیا ہوتا ہے مگر اس کو بھی ہم ماں کی محبت کے ساتھ موازنہ نہیں کر سکتے۔ ہاں میری زندگی میں بھی ایک خاتون ایسی ہیں جن کو ''ماما'' کہتی ہوں وہ میری دوست کی والدہ ہیں اور میرا ان کا اتنا کلوز ریلیشن ہے کہ میں ان کو بھی ''ماما'' کہتی ہوں وہ کراچی میں ہوتی ہیں اور میں بھی کراچی میں تو وہ مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتیں۔ ماں کی جو ذمہ داری ہوتی وہ اسے پوری کرتی ہیں میرا بہت خیال رکھتی ہیں ان کا نام پروین ہے اور میری اپنی والدہ پنجاب میں رہتی ہیں۔



کنزہ ہاشمی (آرٹسٹ)

1۔ میرے مطابق تو ہر دن ماں کا دن ہے۔ میں مدرز ڈے صرف مدرز ڈے پر ہی نہیں مناتی۔ ہفتے میں دو یا تین دن ایسے ضرور آتے ہیں جب مجھے اپنی امی پر بہت پیار آتا ہے اور پھر وہ میرے لیے مدرز ڈے ہی ہوتا ہے۔

2۔ ہاں میری زندگی میں بھی ایسی ایک شخصیت ہیں جو ماں کی طرح مجھ سے پیار کرتی ہیں۔ ان کا نام ارسہ غزل ہے اور وہ ماشاء اللہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس انڈسٹری میں اگر کوئی میری ماں ہے تو وہ ارسہ غزل ہی ہیں۔ وہ جس طرح مجھے پیار کرتی ہیں میرے بارے میں سوچتی ہیں اور جس طرح وہ مجھے سمجھاتی ہیں وہ میری امی کی طرح ہی سمجھاتی ہیں۔

سنیتا مارشل سے ملاقات

شاہین رشید



ابرارالحق کی ایک میوزک ویڈیو سے شہرت پانے والی آج کی مشہور ماڈل اداکارہ سنیتا مارشل ڈراموں کی کامیابی کی بھی ضمانت بن چکی ہیں۔ شادی اور پھر بچوں کی دیکھ بھال نے انہیں تھوڑا معروف کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی جب اسکرین پہ آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل ''خلش''، میں دیکھ رہے ہیں جو کہ جیو سے ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے۔

☆ ''کیا حال ہیں آپ کے؟''

o ''جی...... اللہ کا شکر ہے۔''

☆ ''آج کل آپ کو ڈرامہ سیریل ''خلش''، میں ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ کیا کہیں گی اس سیریل کے بارے میں؟''

o ''سیریل بہت اچھا ہے اور بہت اچھا رسپانس آ رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی کہانی دیگر کہانیوں سے بہت مختلف ہے۔ عموماً ڈراموں میں خواتین دوسروں سے انتقام لیتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر اس سیریل میں یہ کام ایک مرد کر رہا ہے۔ بہت منفرد کہانی ہے۔''

☆ ''آپ بھی اس انتقام میں شامل ہیں؟''

o ''یہ میں نہیں بتا سکتی...... اور اب تک تو کافی اقساط ہو چکی ہیں اور اس انٹرویو کے آنے تک مزید آن ایئر آ چکی ہوں گی تو میرا کردار بھی واضح ہو گیا ہو گا۔''

☆ ''جیو کی بندش نے اس سیریل کو نقصان پہنچایا ہے؟''

o ''بے شک...... ہو سکتا ہے کہ بندش کے بعد اسے دوبارہ دکھایا جائے۔ ویسے اب تو لوگ ''یوٹیوب'' بھی دیکھ لیتے ہیں۔''

☆ ''اب ٹی وی اسکرین پہ کم نظر آ رہی ہیں۔ گھریلو مصروفیات یا کچھ اور وجہ؟''

o ''دو وجوہات کی بنا پر کم نظر آتی ہوں۔ میری پہلی ترجیح میرا گھر، شوہر اور بچے ہیں۔ میری زندگی، میری جان، میرے بچے ہیں۔ ان کی اچھی تربیت میرا فرض ہے تو گھریلو مصروفیات کی وجہ سے کام کم کیا ہوا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اداکاری۔ ماڈلنگ اور کمرشلز اب مجھے ان کاموں میں یکسانیت سی نظر آنے لگ گئی ہے۔ اسی لیے اب میں وہ اسکرپٹ لیتی

ہوں جو بہترین ہو...... جیسے ''خلش''،

☆ ''جہاں سے پیسہ آ رہا ہو وہ کام بور کیسے ہو سکتا ہے؟''

o ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... لیکن آرٹسٹ کے لیے پیسے سے زیادہ کام کی اہمیت ہوتی ہے...... میں نہیں چاہتی کہ میں پیسے کی خاطر ہر کردار قبول کر لوں اور جو مقام میں نے اتنے برسوں میں بنایا ہے وہ خاک میں ملا دوں۔''

☆ ''حسن صاحب کی کیا ترجیحات ہیں؟''

o ''ان کی ترجیحات بھی ویسی ہیں جیسی میری ہیں۔ ماشاءاللہ وہ بھی کافی کام کر رہے ہیں اور بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ وہ بھی کردار کے لیے چوزی ہیں...... ہر آفر کو قبول نہیں کرتے...... اس لیے لوگ انہیں بھی اسکرین پہ دیکھ کر ضرور کہتے ہیں کہ سیریل اچھا ہوگا۔''

☆ ''میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ کیا روڈ پر ان دونوں کا چلنا بہت ضروری ہے یا ضروری ہے؟''

o ''ہنستے ہوئے...... یہ اچھی بات کی آپ نے کمانے کے حساب سے دیکھا جائے اور مہنگائی کے حساب سے دیکھا جائے تو واقعی ان کا روڈ پر چلنا بہت ضروری ہے...... اور اگر شوہر کا کام اچھا ہے تو پھر دوسرے پہیے کو گھر میں رہنا چاہیے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ عورت اپنے آپ کو گھر کے کاموں اور بچوں کی پرورش تک محدود نہ کرے بلکہ گھر سے نکل کر کچھ پوزیٹو کام بھی کرے۔''

☆ ''اللہ تعالیٰ نے جو عزت و شہرت دی ہے اس کے بارے میں سوچتی تھیں کہ میں فیلڈ میں آؤں گی تو سپر ماڈل یا سپر اسٹار بن جاؤں گی؟''

o ''نہ...... نہ...... کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ ہی اس ارادے سے آئی تھی...... بلکہ میں تو اتفاق سے آئی ہوں۔ میرا تو کوئی ارادہ ہی نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔''

☆ ''اچھا...... یہ اتفاق ہمارے قارئین کو بھی



بتائیے؟''

o ''ہوں...... بتاتی ہوں۔ جب میں کالج کی طالبہ تھی تو میری ایک آنٹی جو کہ میک اپ آرٹسٹ تھیں انہوں نے مجھے کہا کہ تمہارا قد کاٹھ اور تمہاری فٹنس ایک ماڈل کی طرح ہے تو تم پڑھائی سے فارغ ہوتے ہی اس فیلڈ میں قسمت آزمائی کرو...... اور میں نے بات سنی ان سنی کر دی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ جب میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی تو میری بہن کو ایک فوٹو شوٹ کے لیے جانا تھا لیکن وہ اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر جا نہیں پا رہی تھی تو اس نے مجھے بھیج دیا۔ اتفاق دیکھیں یا قسمت کا کمال...... میری فوٹو شوٹس بہت اچھی بن گئیں اور بہت ہٹ ہوئیں...... بس پھر ایک کے بعد ایک آفرز آنا شروع ہو گئیں اور مجھے بھی مزا آنا شروع ہو گیا...... یوں میں اتفاقاً آرٹسٹ اور ماڈل بن گئی۔''

☆ ''فرسٹ ایئر کی طالبہ تھیں...... تو پھر پڑھائی تو بیچ میں ہی رہ گئی ہوگی؟''

o ''جی...... جی...... بالکل پڑھائی ادھوری رہ گئی اور اس کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے۔ میں ماسٹرز کرنا چاہتی تھی مگر نہ کر سکی اس فیلڈ نے مجھے بہت زیادہ

مصروف کردیا۔"

☆ "آپ کی اس کامیابی میں قسمت کا عمل دخل زیادہ ہے یا محنت کا؟"

o "میں سمجھتی ہوں کہ میری کامیابی میں میری قسمت کا عمل دخل زیادہ ہے...... شروع سے ہی بلکہ فوراً ہی مجھے اچھے کمرشلز اور دیگر پروجیکٹس ملنے شروع ہوگئے اور میں کام کرتی چلی گئی۔"

☆ "سیکھنے کی نوبت نہیں آئی؟"

o "نہیں جی...... کیونکہ جو کام کرتی تھی وہ ہٹ ہوجاتا تھا تو سیکھنے کی نوبت نہیں آئی اور ویسے بھی اس شعبے میں لڑکیوں کو تربیت دینے والے ادارے نہیں ہیں...... البتہ اس فیلڈ کی سینئرز ماڈلز سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ فالو میں نے کسی کو نہیں کیا بلکہ اپنا ہی انداز، اپنا ہی اسٹائل لے کر آئی اور کامیاب ہوئی۔"

☆ "آپ متاثر تھیں کس سے؟"

o "اس وقت کی سب ہی ماڈل مجھے پسند تھیں لیکن آمنہ حق سب سے زیادہ پسند تھیں۔"

☆ "سنیتا آپ سپر ماڈل بھی ہیں اور بہترین پرفارمر بھی۔ کیسا محسوس کرتی ہیں اور کس کام کو کر کے تسکین ملتی ہے؟"



o "مجھے اپنی فیلڈ کا ہر کام کر کے تسکین ملتی ہے اور میں کام اس لیے نہیں کرتی کہ بہت پیسہ ملے گا بہت زیادہ شہرت ملے گی، میں کام اپنے ناظرین کے لیے کرتی ہوں کہ وہ مجھے پسند کریں اور میری صلاحیتوں کو سراہیں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں سپر ماڈل بن جاؤں گی اور مجھے سپر ماڈل کا اعزاز ملے گا۔ بہت شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ کی کہ اس نے عزت سے نوازا ہے۔"

☆ "وقت کون مانگتا ہے، ڈرامہ؟ کمرشل ماڈلنگ یا ریمپ ماڈلنگ؟"

o "اگر ان تینوں کا موازنہ کیا جائے تو ٹیلی پلے سے زیادہ سیریل وقت مانگتا ہے۔ کیونکہ سیریل کئی اقساط پہ محیط ہوتا ہے کئی کئی مہینے اور ایک دن میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ کمرشل اور ریمپ پہ ماڈلنگ میں دو تین دن سے زیادہ نہیں لگتے اور بندہ فارغ ہو جاتا ہے۔"

☆ "وقت اور حالات کافی بدل چکے ہیں اور لوگوں کے مزاج بھی اب ایک ماڈل کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟"

o "اب بہت تبدیلی آگئی ہے...... اب یہ فیلڈ ایک باعزت فیلڈ کہلانے لگی ہے لہٰذا اب کوئی اعتراض نہیں کرتا سوائے چند ایک کے اور اب اس فیلڈ کے ہر شعبے نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ ملک سے باہر نہ صرف ہمارے ڈراموں کو بلکہ ہماری ماڈلز کو اور ہمارے فنکاروں کو بہت پسند کیا جاتا ہے اور اب تو اس فیلڈ کے لوگ برانڈ ایمبیسڈر بھی ہیں۔"

☆ "سنیتا صاحبہ کہیں سے یہ آواز نہیں آئی کہ آپ فلموں کی طرف جارہی ہیں؟"

o "اس لیے کہ میں نے ابھی تک کسی آفر کو قبول ہی نہیں کی۔ کیونکہ مجھے اسکرپٹ پسند نہیں آئے اور ویسے بھی میرا رجحان...... آرٹ فلموں کی طرف ہے تو بس وہی کروں گی۔"

☆''اب کچھ نجی سوال......اجازت ہے؟''

o ''جی......کریں۔''

☆''عموماً کہا جاتا ہے کہ لومیرج کامیاب نہیں ہوتی مگر آپ نے اسے جھوٹ کردکھایا؟''

o ''جی......کچھ باتیں انسان کے اپنے اختیار میں بھی ہوتی ہیں۔دونوں کو انڈراسٹینڈنگ سے رہنا ہوتا ہے۔اپنی ذات میں مکمل کوئی بھی نہیں ہوتا۔''

☆''کیا پہلے سے آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے؟''

o ''نہیں......انہوں نے مجھے کہیں دیکھا تھا تو مجھ سے ایس ایم ایس پہ بات کرتے تھے......نمبر بھی ظاہر ہے کہیں سے لے لیا ہوگا۔بس بات ہوتے ہوتے ایک دن ملاقات بھی ہوگئی......اور شاید ہماری تیسری یا چوتھی ملاقات تھی کہ انہوں نے مجھے پروپوز کردیا......اور بس۔''

☆''اس بندھن میں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔تو کبھی بڑے مسئلوں نے جنم لیا؟''



o ''نہیں......شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ کبھی بڑے جھگڑوں نے جنم نہیں لیا اور ہم اپنے بچوں کے ساتھ بہت ہی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں، ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ لوگ عموماً کہتے رہتے ہیں......اصل میں اس فیلڈ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔''

☆''امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟''

o ''سچ بتاؤں......میں کھانے کی بہت شوقین ہوں۔مگر مجھے کھانا پکانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔اصل میں بچوں اور شوٹس کی وجہ سے تھک بھی جاتی ہوں اور ٹائم بھی نہیں ملتا اور پھر اتنا شوق بھی نہیں ہے۔''

☆''تو پھر کیا ریڈی میڈ سے کام چلتا ہے اور کیا میاں صاحب فرمائش کرکے کچھ نہیں پکواتے؟''

o ''نہیں......میری ساس بہت اچھا پکاتی ہیں اور وہ ہی پکاتی ہیں۔انہیں میری مصروفیات کا اندازہ ہے اس لیے وہ مجھے منع کردیتی ہیں پکانے سے......اور چونکہ حسن کو پتا ہے کہ مجھے کوکنگ کا شوق نہیں ہے تو وہ مجھ سے فرمائش بھی نہیں کرتے......کریں گے تو پکا بھی دوں گی۔''

☆''کبھی ادھیڑ عمر یعنی ماں کے رول کرنے پڑ گئے تو؟''

o ''تو ضرور کرلوں گی، اس میں کوئی برائی نہیں ہے......انسان جب بڑا ہوتا ہے تو پھر اس کے خیالات و احساسات بھی بڑے ہوجاتے ہیں۔اکثر لوگ کام چھوڑ دیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ویسے بھی جو شوبز میں ایک بار آجائے اس کے لیے اس انڈسٹری کو چھوڑنا مشکل ہوجاتا ہے۔''

☆''اس فیلڈ میں اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟''

o ''کچھ خاص نہیں......بلکہ کچھ بھی خاص نہیں۔اسمارٹنس مجھے اپنی فیملی کی طرف سے ملی ہے۔ہماری فیملی میں کوئی بھی موٹا نہیں ہے۔تو میں بھلا کیسے موٹی ہوسکتی ہوں۔''

میری بھی سنئے

ماہم عامر

شاہین رشید



1-میرا نام؟''

o ''ماہم عامر اور مجھے سب بلاتے بھی ماہم کے نام سے ہی ہیں کیونکہ یہ چھوٹا نام ہے، بگڑ نہیں سکتا۔''

2-''جنم لیا؟''

o ''1990ء میں کراچی میں 26 دسمبر کا دن تھا گھر والے بتاتے ہیں اور 26 دسمبر کے حساب سے میرا اسٹار کیپری کورن ہے۔''

3-''مادری زبان؟''

o ''پنجابی......اس لیے میرا قد 5 فٹ 10 انچ ہے۔''

4-''بہن بھائی؟''

o ''میں اور مجھ سے چھوٹا ایک بھائی''۔

5-''شادی؟''

o ''جی......الحمد للہ نکاح ہوگیا ہے۔رخصتی میں تھوڑا ٹائم ہے۔''

6-''تعلیم؟''

o ''گریجویٹ ہوں اور سی ایس ایس کرنے کا ارادہ تھا۔مگر اب مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔''

7-''ٹی وی اسکرین پر آمد؟''

o ''یقین کریں......جب 9 ماہ کی تھی تو ایک کمرشل میں کام کیا تھا۔اس کے بعد بچپن میں ہی کافی کمرشلز کیے۔''

8-''شہرت ملی؟''

o ''بابل کا انگنا۔''اور''رشتوں کی ڈور''اور اب ''سایہ'' بھی بہت پسند کیا جارہا ہے۔''

9-شوبز کی ایک بات جو بھول نہیں سکتی؟''

o ''جی......بالکل بتاؤں گی......ایک ڈائریکٹر نے مجھے آڈیشن کے لیے بلایا اور پھر کہنے لگے آپ بہت لمبی ہیں۔آپ اس فیلڈ میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں۔''

10 ''کس چیلنج نے مجھے بدلا؟''

o ''اس بات کو چیلنج سمجھ کر گرہ سے باندھ لیا کہ اب تو اس انڈسٹری میں ترقی کرکے دکھاؤں گی۔بہت محنت کی اور اللہ نے مجھے کامیاب کیا۔''

11-''بہت کچھ سیکھا؟''



o ''تھیٹر سے...... میں تو کہتی ہوں کہ جسے بھی اچھا آرٹسٹ بننا ہے وہ تھیٹر ضرور کرے۔''

12- ''مجھے نشہ ہے؟''

o ''چائے کا، صبح اٹھتے ہی چائے نہ ملے تو بستر پر ہی پڑی رہتی ہوں اور چائے چائے کی صدا لگاتی رہتی ہوں۔''

13- ''بہت ہنستی ہوں؟''

o ''یہ سوچ کر کہ جب میں اپنی دوستوں کے ساتھ کوئی پروگرام بناتی تھی تو امی کہتی تھیں کہ ''بھائی کو ساتھ لے جانا''۔ ہنستی ہوں اس بات پر کہ بھائی تو مجھ سے چھوٹا تھا۔ اور پھر لڑکیوں میں بھائی کا کیا کام؟''

14- ''میرا پسندیدہ کھانا۔''

o ''مونگ مسور کی مکس دال اور بریانی اور یہ چیزیں روزانہ بھی کھانی پڑیں تو میں شوق سے کھالوں گی۔''

15- ''میں پاگل ہو جاتی ہوں؟''

o ''جب مجھے غصہ آتا ہے۔ پورا جسم کانپنے لگتا ہے اور بی پی بھی ہائی ہو جاتا ہے۔''

16- ''میں افسردہ ہو جاتی ہوں؟''

o ''اپنے ملک کے حالات دیکھ کر، بے روزگاروں کو دیکھ کر، سرِعام بے لگام جانوروں کو پھرتا ہوا دیکھ کر میں واقعی بہت افسردہ ہو جاتی ہوں۔''

17- ''چائے پینا پسند کرتی ہوں؟''

o ''صبح کے وقت امی کے ہاتھ کی اور سارا دن میں میکڈونلڈ کی۔ بہترین چائے ہوتی ہے۔ میکڈونلڈ کی۔''

18- ''غصے میں میری استاد ہیں؟''

o ''میری امی...... ان کے غصے سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

19- ''ایک جملہ جو بہت برا لگتا ہے؟''

o ''جملہ تو نہیں ''لفظ'' برا لگتا ہے جب کوئی کھانے کے دوران ویٹر کو ''اوئے'' کہہ کر بلائے۔''

20- ''گھر میں کس جگہ کھانا کھانے میں مزا آتا ہے؟''

o ''اپنے بیڈ پہ ٹی وی لگا کر آرام سے...... ویسے مجھے چٹائی پہ بیٹھ کر کھانا کھانا پسند ہے۔''

21- ''لوگوں کا اصلی روپ دیکھا؟''

o ''پاپا کے انتقال کے بعد سب کے اصلی چہرے سامنے آ گئے۔''

22- ''بچپن کے کھلونے؟''

o ''باربی ڈولز اور ٹیڈی بیئرز بہت پسند تھے۔ باربی ڈولز تو بے تحاشا تھیں اور ابھی بھی تقریباً 100 باربی ڈولز میں نے ڈبے میں بند کر کے رکھی ہوئی ہیں۔''

23- ''پریکٹیکل لائف میں جب آئی؟''

o ''جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ لوگوں کے اصلی روپ سامنے آئے تو پھر سوچا کہ اب

خود ہی کچھ کرنا ہے۔ تو بس محنت کرنے والوں کا اللہ بھی ساتھ دیتا ہے۔''

24- ''میری خواہش ہوتی ہے کہ......؟''

o ''جب میں گھر آؤں تو کوئی یہ نہ کہے کہ جلدی سے میک اپ اتار کر فریش ہو جاؤ اور کھانا کھالو۔ کیونکہ میرا دل چاہتا ہے کہ پہلے میں اپنی امی کو سارے دن کی روداد سناؤں اور پھر کوئی دوسرا کام کروں۔''

25- ''کھانے کا مزا نہیں آتا؟''

o ''جب تک اچار نہ ہو۔''

26- ''میری بری عادت؟''

o ''غصہ جلدی آتا ہے۔ غصے میں آتے ہی سامنے والے کے لیے ''بکواس مت کرو'' کے الفاظ نکلتے ہیں۔ اسی عادت سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔''

27- ''کسی کو آزمانا ہو تو؟''

o ''تو اپنی ضرورت کے وقت یا اپنے برے وقت میں آزمائیں سب محبتیں اصلی نقلی کھل کر سامنے آجائیں گی۔''

28- ''میں کنجوس ہوں؟''

o ''اپنی ذات کے لیے۔ دوسروں پر بے دریغ خرچ کرتی ہوں مگر اپنے لیے صرف ضرورت کی چیزیں ہی خریدتی ہوں۔''

29- ''میں پرکھتی ہوں لوگوں کو؟''

o ''میں جب کسی سے ملتی ہوں تو ان کے ہاتھ پاؤں اور جوتے دیکھتی ہوں اور اس سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بندہ کیسا ہوگا۔ خاص طور پر مرد حضرات۔''

30- ''کس جگہ کا کھانا لذیذ ہوتا ہے۔''

o ''ویسے تو انسان جاتا ہی ادھر ہے جہاں کا کھانا لذیذ ہو۔ مگر پھر بھی جب کراچی میں کھانے کے لیے اسپیشل جانا ہو تو دو دریا پر ''کلاچی'' کی کڑاہی اور ''ہاشمی چوک'' کے دال چاول بہت پسند ہیں۔''

31- ''مردوں کے لیے میری سوچ؟''

o ''ایک تو صاف ستھرے ہوں۔ گریس فل اور پرسنالٹی بہت اچھی ہونی چاہیے۔ اور بہت ذہین ہونے چاہئیں۔''

32- ''سکون ملتا ہے؟''

o ''جہاں پر لوگ کم ہوں۔ سناٹا ہو اور جگہ بہت خوب صورت ہوں۔''

33- ''سگھڑ ہوں؟''

o ''اس معاملے میں کہ بیکنگ خود کر لیتی ہوں۔ ''کپ کیک'' بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔ گھر کے دیگر کام بھی کر لیتی ہوں۔ ہاں البتہ کھانا پکانے کے لیے کک ہے۔''

34- ''گھر میں کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟''

o ''میری امی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔ ان ہی کے ہاتھ کا پسند ہے اور ہمارا کک بھی اچھا کھانا پکاتا ہے۔''

35- ''شوبز انڈسٹری کے بارے میں میری رائے؟''

o ''اچھی ہے۔ کیونکہ میں نے ایسے اچھا ہی پایا۔ لوگ اسے برا کہتے تھے اور کہتے ہیں مگر مجھے ایسا کچھ نہیں لگا۔ برائی ہر شعبے میں ہے۔''

36- ''میری اچھی عادت؟''

o ''صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں۔ شوٹ پر جانا ہو تو ذرا زیادہ جلدی اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ تھوڑی دیر میں۔ صبح جلدی اٹھنا مجھے پسند ہے۔''

37- ''سست ہوں؟''

o ''بستر چھوڑنے کے معاملے میں۔ اٹھ جاتی ہوں جلدی مگر لیٹی رہتی ہوں کہ چلو تھوڑی دیر میں اٹھ جاتی ہوں۔''

38- ''اچھا لگتا ہے وہ دن؟''

o ''جب چھٹی ہوتی ہے اور میں سارا دن اپنی امی کے ساتھ گزارتی ہوں' ٹی وی دیکھتی ہوں اور مزے مزے کی چیزیں کھاتی ہوں۔''

39- ''ایک فضول خرچی جو اپنے لیے کی؟''

o ''ایک مہنگا والا موبائل خریدا اور پھر اسے خرید کر بہت روئی بھی کہ میں نے یہ فضول خرچی کیوں کی۔''

40- ''بچت کرتی ہوں؟''

o ''کوشش تو بہت کرتی ہوں کہ بچت ہو جائے مگر ہوتی نہیں اور اگر ہو بھی تو کیش کی شکل میں یا پھر ''سلور'' کی شکل میں کرتی ہوں۔ گولڈ مجھے پسند نہیں۔''

41- ''سائنس کا احسان ہے کہ......؟''

o ''کہ اس نے ہمیں موبائل فون دیا۔ سوچیے کہ اگر موبائل فون نہ ہوتا تو زندگی کیسے گزر رہی ہوتی۔ پتا نہیں کہ گزرے زمانے کے لوگ کیسے رہتے تھے۔''

42- ''لڑکیوں کو آزادی ملنی چاہیے؟''

o ''بالکل ملنی چاہیے۔ مگر اپنے وقت پر۔ تھوڑی سمجھدار ہو جائیں۔ اچھا برا سمجھنے کی عقل آجائے تب۔ اپنی بات بتاؤں کہ جب میں ''میٹرک'' کی طالبہ تھی تب مجھے موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت ملی تھی۔''

43- ''میں چاہتی ہوں کہ......؟''

o ''کہ میں دبلی ہو جاؤں۔ مجھے پتلا اور اسمارٹ ہونا ہے بہت زیادہ مگر ابھی تو سوچتی ہوں پتا نہیں ان سب کاموں کے لیے وقت کب ملے گا۔''

44- ''شدید بھوک ہو تو؟''

o ''شدید بھوک میں بھی اپنی پسندیدہ چیزیں ہی کھاتی ہوں اوٹ پٹانگ چیزوں سے پیٹ نہیں بھرتی۔ شدید بھوک میں پسندیدہ سبزی مل جائے تو کیا ہی کہنے۔''

45- ''میری پسندیدہ سبزی؟''

o ''آلو...... آلو میں پکا ہوا کچھ بھی کھلا دیں کھالوں گی۔ گوشت مجھے سخت ناپسند ہے۔ فرنچ فرائز ہوں آلو کی ہر ڈش' میری پسندیدہ ڈش ہے۔''

46- ''مجھے انتظار ہے؟''

o ''اس دن کا جب لوگ دور سے بھی پہچان کر میری طرف لپکیں اور میرے ساتھ تصویر بنوانے کی خواہش کریں اور پھر میری مرضی ہو کہ تصویر بنواؤں یا نہ بنواؤں۔''



47- ''بہت شوقین ہوں؟''

o ''اچھا اور لذیذ کھانا کھانے کی۔ کوئی آدھی رات کو بھی کہے کہ کھانے چلو تو میں تیار ہو جاتی ہوں۔ اور ہاں میں اچھے پرفیومز کی بھی شوقین ہوں۔ پرفیوم میری کمزوری ہے۔''

48- ''اگر میرا بیگ کسی کے ہاتھ آجائے تو؟''

o ''پہلے تو جو کوئی اسے اٹھائے گا تو اس کے منہ سے ''اف'' ضرور نکلے گا کیونکہ میرا بیگ ماشاءاللہ سے کافی بھاری ہوتا ہے اور ماشاءاللہ سے ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔''

49- ''محبت کیا ہوتی ہے؟''

o ''اندھی بھی اور کانی بھی' لولی لنگڑی بھی۔ بس اگر ہو جائے تو بندہ کسی کام کا نہیں رہتا۔''

50- ''پسندیدہ تاریخی شخصیت؟''

''دلائی لامہ۔ جتنا پڑھا ہے ان کو بہت متاثر ہوئی ہوں۔ بہت اچھی باتیں کی ہیں انہوں نے۔''

☆☆

مقابل ہے آئینہ

ثانیہ مشعل اشرف

ادارہ

س ''آپ کا پورا اور اصلی نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟''

ج ''پورا نام ثانیہ مشعل اشرف ہے۔ میری نانی کبھی کبھار مجھے ''رادھا'' کہا کرتی تھیں اور میرے ابو مجھے اکثر پیار سے ''میڈم'' کہتے ہیں۔''

س ''کبھی آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟''

ج ''کیا پوچھ لیا جی! آئینے سے تو ہماری کبھی بنی ہی نہیں۔ اتنا بے ایمان ہے کہ ہر بار ہی بیان بدل لیتا ہے۔ اور آئینہ کون سا ''گل'' ہے جو خاموش رہے تڑخ کر کہتا ہے ''ہونہہ! روٹھی رہو بی بی! میں تو سچ بولتا ہوں۔''

س ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

ج ''کینا سوہنا تینوں رب نے بنایا۔''

س ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج ''نوٹس، رجسٹر، پنسل، کچھ پیسے، اور ایم اے انگلش پارٹ 2 کا سلیبس۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''ناں جی ناں! بھوتوں سے کیا ڈرنا۔ بقول امی کے ہمارے تو گھر میں ہی بھوت رہتے ہیں جو کنگھا اور چھری عین اس وقت چھپا لیتے ہیں جب ان کی اشد ضرورت ہو۔ بھوتوں کی سمجھ تو آ گئی نا۔''

س ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج ''اف، میں مشرقی لڑکی ......اب اپنے منہ سے کیسے بتاؤں۔'' (انگلی منہ میں دبائی ہوئی ہے) مہمان تو بس ''وہ'' ہی اچھے لگتے ہیں۔ اب آگے خود ہی سمجھ جاؤ۔ (ہاہا)

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''سب کچھ ......ویسے آپ نے کیا کھلانا ہے۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''محسن نقوی۔''

س ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج ''بالکل نہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ لڑائی کو انگلش میں کیا کہتے ہیں۔''

س ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو؟''

ج ''پہلے مل جائے پھر اپنے انٹرویو میں بتاؤں گی۔ اب ایسے ہی میں اپنا ارادہ لیک آؤٹ تو نہیں نا کر سکتی۔''

س ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج ''نرم مزاج لوگ۔''

س ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی؟''

ج ''تو پھر بجلی بھی نہ ہوتی۔ لوڈ شیڈنگ کی بدولت ہم بجلی سے تو فیض یاب ہو رہے ہیں نا۔''

س ''اللہ پاک کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج ''ہر وقت۔ وہ تو ہر پل ہی متوجہ ہے۔ بس ہمارے پکارنے کی دیر ہوتی ہے۔''

س ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج ''میں کفایت شعار ہوں۔''

س ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج ''نہیں ......اللہ ہے نا۔''

س ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں؟''

ج ''میرا خیال ہے نہیں ...... میں نے آج تک کوئی ایسا نہیں دیکھا جو اپنے نام کا پرتو ہو۔''

س ''اگر آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے؟''

ج ''میں کتے سے ریس لگا دوں گی۔ جو نہ پہنچے وہ ہار گیا۔'' (ہاہا)

س ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج ''اپنی ٹیچرز کی۔''

س ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج ''ہم نے اپنے ٹی وی کو عزت و احترام کے ساتھ کرسی پر بٹھایا ہوا ہے۔ مگر چلایا کبھی نہیں۔ بچے پڑھتے نہیں ہیں اور ویسے بھی ہماری جوائنٹ فیملی ہے تو بھلا ٹی وی والے ڈراموں میں وہ مزا کہاں جو حقیقت والے ڈرامے میں ہوتا ہے۔''

س ''پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کر دیا ہو؟''

ج ''کوئی کامیابی نہیں۔ کچھ اچھا نہیں گزرا سال۔''

س ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟''

ج ''خوش قسمتی سے میری دوستیں کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوئیں۔ ہاں جو خود کو دوست ظاہر کریں میں تو ان کو بھی ناراض نہیں ہونے دیتی۔''

س ''حقیقی خوشی کب ہوتی ہے؟''

ج ''جب میرے کہے بغیر ابو وہ چیز لے آئیں جس کی میں نے دل میں خواہش کی ہو تو اس وقت جو خوشی ہوتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔''

س ''آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟''

ج ''اللہ سے محبت۔''

س ''اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟''

ج ''جب میرے ابو کسی مسئلے کی وجہ سے ہم سے دور تھے اور ہمیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ پھر اپنوں کے چہروں کے بھی نقاب اتر گئے اور پرائے بھی عیاں ہو گئے۔ پری تو خیر نہ رہی پر بے خبری ختم ہو گئی۔''

س ''وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''

ج ''میرے خیال میں تو ایسا کام کرنا ہی نہیں چاہیے جس کو کرتے ہوئے یہ سوچنا پڑے۔''

س ''مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟''

ج ''ایم اے انگلش پارٹ ٹو کے ایگزامز کی بہت اچھی تیاری کرنی ہے۔ ان شاءاللہ۔''

س ''کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہو؟''

ج ''اللہ بہت رحیم ہے۔''

س ''کوئی آخری بات؟''

ج ''آہ......''

ہمیں یہ زعم رہا کہ اب کے وہ پکاریں گے
انہیں یہ ضد تھی کہ ہر بار ہم صدا دیتے

☆☆

رخ چوہدری

شبِ غم کی سحر

لندن کے انتہائی سرد موسم میں بڑھیا نائٹ کلب کی عمارت کے نیچے بیٹھی ہر آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کر کے اپنے بیمار شوہر کی دوا اور کھانے کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ اچانک ٹمی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑھیا کی جمع شدہ رقم لے کر بھاگ جاتی ہے۔

"سلیم منزل" کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین جن کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری یعنی نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر نواب علیم الدین اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کر آتے ہیں اور اس پسند میں سلیم الدین اور دونوں بہنوں کی پسند شامل ہوتی ہے مگر حمیدہ خاتون مختلف زبان، مختلف ثقافت اور کم تعلیم یافتہ بہو کو دل سے قبول نہیں کرتیں اور دن رات کڑھا کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاجاً انتہا بد مزاج، اکھڑ، بات بات پر بیوی کی بے عزتی اور اس پر ہاتھ اٹھانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ظہیر احمد اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں اسما، ثمینہ، شکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد سخت ضرور تھے مگر بیوی پر ہاتھ اٹھانے کو مرد کی بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عابد اور ساجد جو اسما اور ثمینہ کے منگیتر ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو شکیل اور جمیل کی منگیتر ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے:۔

دوسری قسط



''اسٹاپ!'' سارجنٹ کی بائیک کو بریک بعد میں لگے، تیز آواز نے لمحہ بھر کوٹمی اور مائیکل کو رکنے پر مجبور کر دیا۔

''ڈونٹ بی سلی میکی۔''

''واٹ ٹمی ہی از کالنگ اَز اسٹاپ۔''

''یو آر اسٹوپڈ! اگر رک گئے تو سیدھے جیل جائیں گے۔ رن......'' ٹمی نے اپنے بوائے فرینڈ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

''سلی گرل! جیل تو ہمیں ہر حال میں جانا ہے، اگر مزید بھاگے تو یونو...... ہمارے ساتھ بہت برا ہوسکتا ہے۔''

مائیکل نے عقل مندی سے کام لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر روڈ کی طرف بڑھا جہاں سارجنٹ اپنی ہیوی بائیک سائڈ پر روک کر ہاتھ میں چالان بک اور پین لیے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹمی ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی اور البتہ مائیکل کچھ گھبرا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ٹمی سے اس کی دوستی نئی نئی تھی، وہ ابھی نہ تو ٹمی کو سمجھ پایا تھا نہ ہی اس کی حرکتوں کو مگر ٹمی کے جسمانی حرکات سے لگ رہا تھا کہ وہ ان فضول حرکتوں کی بھی عادی ہے اور ان کے انجام اور سزا کی بھی۔ تب ہی تو وہ بدتمیزی سے چیونگم چباتی رہی بڑے بڑے ببل بنا بنا کر پھوڑتی رہی۔

''یور نیم؟'' سارجنٹ نے چالان بک کھولتے ہوئے ٹمی کو دیکھا۔ وہ مسلسل ببل بنا کر پھوڑ رہی تھی۔

''یور نیم......؟'' سارجنٹ نے تحمل سے اپنا سوال دہرایا۔

''ٹمی!'' ٹمی نے بڑا سا ببل بنا کر اسے ہاتھ سے پکڑا اور پھر منہ میں رکھ کر چبانے لگی۔ مائیکل تمیز سے کھڑا رہا۔

''یور فادرز نیم؟''

''راہی! اینڈ ہی ہیز اے ہیوج جنرل اسٹور، یونو۔'' ٹمی چیونگم چباتے ہوئے بولی۔ سارجنٹ نے گھورا، لمحہ بھر کو اس کا چلتا منہ رکا۔ اس نے مائیکل کو دیکھا اور مائیکل نے اس کو ایسے گھورا کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ اوقات میں رہو۔ ڈبل ڈبل چارج لگ گئے تو برے پھنسیں گے۔ وہ دونوں ابھی آنکھوں سے بات کر رہے تھے کہ راؤنڈ پر ٹریفک پولیس کی کار آ کر رکی۔ باوردی بندہ باہر نکلا، سارجنٹ سے صورت حال پوچھی اس کے بتانے پر اس نے ٹمی اور مائیکل کو کار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔

''یو ایڈیٹ، اٹ از جسٹ بی کاز آف یو۔''

سارجنٹ کی گھرکی نے دونوں کو گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ راستہ بھر مائیکل ٹمی کو گھورتا رہا، جواب کسی حد تک سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔



''ٹائم دیکھ رہی ہو۔'' راہی صاحب نے وال کلاک پر دو کے ہندسے کو دیکھتے ہوئے کہا تو ٹی وی پر کسی فیشن شو کو دیکھتی ہوئی اپنی بیوی روبیکا کو دیکھا جو صوفے پر نیم دراز تھی، ٹانگ پر ٹانگ رکھے۔ کچھ کھانے میں مصروف تھی شوہر کی بات پر اسے دیکھا پھر وال کلاک پر نظر ڈال کر۔

''راہو! آخر تمہیں ٹائم دیکھنا کب آئے گا ڈارلنگ! دو بجے ہیں رات کے۔'' روبیکا نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور اپنا شغل جاری رکھا۔ راہی صاحب کو غصہ تو آیا مگر ایک نظر پر اکتفا کرتے ہوئے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''ٹمی! ابھی تک نہیں آئی۔''

''اوکم آن راہی ـــــ یہ تو تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہ حادثہ پہلی بار رونما ہوا ہو۔ مائی ڈیئر ڈارلنگ ہسبنڈ! یہ روٹین ہے اس کا۔'' بات کرتے کرتے روبیکا نے ایک گہری جمائی لی اور چینل بدلنے لگی۔ کبھی نیوز چینل آتے تو کبھی ٹاک شو۔

''اس کو بولو اپنا روٹین بدلے۔ اب وہ بڑی ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے۔'' راہی صاحب نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر گیٹ پر نظر ڈالی۔ جہاں ابھی ٹمی کی گاڑی نہیں آئی تھی۔

''راہی! ٹمی تو بڑی ہو گئی تم...... تم بتاؤ کب بڑے ہو گے۔ کب تمہارے اندر کا دقیانوسی مرد کب حقائق تسلیم کرے گا۔ ہونہہ...... سارا دن اسٹور پر چخ چخ بک بک کرو، رات کو تم شروع ہو جاتے ہو...... لیٹ ہر فری بچی ہے، اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی ایج انجوائے کر رہی ہے تو کرنے دو۔''

''او کے...... او کے بابا! اب تم بھی چپ ہو جاؤ اور فون دیکھو کس کا ہے۔'' راہی صاحب نے بھی چڑ کر کہا اور تیسری بیل دینے والے فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ خود کھڑکی میں کھڑے رہے۔

''اوہ راہی! تم بھی ناں، بہت لیزی ہو۔ خود بھی تو دیکھ سکتے ہوناں۔ چلو خود ہی پک کرو، کسی شیئر ہولڈر کا فون ہی ہوگا، بات کرو۔''

روبیکا کسل مندی سے صوفے پر لیٹے لیٹے اپنا خیال پیش کرتے ہوئے بولی تو راہی صاحب - چہرے اور نظر میں ناگواری کے تاثرات کے ساتھ بیوی کو گھورتے، فون کی طرف بڑھے۔

''ہیلو! لیس آئی ایم...... واٹ......'' راہی صاحب نے بے زاری سے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سارجنٹ کی اطلاع نے چاروں طبق روشن کر دیے۔ لہجے میں تندی آ گئی، روبیکا نے پل بھر کو شوہر کو دیکھا، ریموٹ سے ٹی وی کی آواز بند کر کے راہی صاحب کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ جن کے چہرے پر شدید غصہ جھلک رہا تھا، اس نے شانہ ہلا کر پوچھا۔

''واٹ ہیپنڈ......؟'' اس معصومیت پر راہی صاحب کا جی چاہا، ریسیور ہی بیوی کے سر پر مار دیں۔

''ٹمی از اِن پولیس...... کسٹڈی۔''

''واٹ...... کیوں...... کس لیے...... کیا کیا ہے اس نے؟''

''پولیس اسٹیشن چلو، سب پتا چل جائے گا۔ تمہاری لاڈلی نے کیا کیا ہے۔'' ریسیور رکھ کر راہی صاحب نے روبیکا کو گھورا اور اسٹینڈ کی طرف بڑھے۔ وہاں سے اپنا اوور کوٹ اتار کر پہنا اور ہیٹ سر پر رکھا۔ اس کارروائی سے صاف ظاہر تھا معاملہ سنجیدہ ہے لہٰذا روبیکا کو بھی یہ سب کرنا پڑا اور اگلے آدھے گھنٹے میں وہ دونوں پولیس اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور اب بیٹی کے کارنامے سن رہے تھے۔ راہی صاحب ـــــ کو شدید غصہ آ رہا تھا، انہوں نے ٹمی کو گھورا۔ وہ معصومیت سے مسکرائی گویا اس کا نہیں کسی اور کا ذکر ہو رہا ہو۔ راہی صاحب ایک مشہور جنرل اسٹور کے مالک تھے اور لوگوں کے علاوہ پولیس آفیسر بھی ان کو جانتا تھا۔

''شی از یور ڈاٹر! آئی ڈونٹ بی لیو......''

اعترافاً راہی صاحب نے نظریں جھکائیں تو پولیس آفیسر نے ٹمی کے خلاف لگائے گئے چارج کی ایک شیٹ ان کے ہاتھ میں تھمائی۔

وہ لوگ جس معاشرے میں رہ رہے تھے، جو زندگی جی رہے تھے ان کے مطابق تو یہ نیو جنریشن کی چل تھی۔ راہی صاحب ـــــ نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے ان خیالات کا اظہار بھی کر دیا تھا مگر بڑھیا

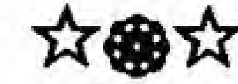
والا معاملہ ایسا تھا کہ راہی صاحب نے جیب سے پانچ سو پاؤنڈ نکال کر آفیسر کو دیے کہ اس بڑھیا کے نقصان کا ازالہ کر دیا جائے۔

"فائیو ہنڈرڈ ڈالر...... ایکسکیوزمی! اس بڑھیا کے ہیٹ میں صرف نائنٹی پاؤنڈ جمع ہوئے تھے۔" ٹی کو بڑھیا پر غصہ آ گیا۔ اس نے فوراً باپ کو بتایا، انہوں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"جسٹ شٹ اپ، اوکے!" راہی صاحب نے اٹھتے ہوئے جھڑکا۔

"مام! دیکھا آپ نے ڈیڈ کو؟" آفس سے نکل کر روڈ تک آتے آتے اس نے کئی بار باپ کو گھورا اور ماں سے شکایت کرتی رہی۔

"آئی نو، بٹ ابھی چپ رہو۔ تمہارے ڈیڈ اس وقت بہت غصے میں ہیں، اٹ واز یور فالٹ، بیٹھو گاڑی میں۔" وہ منہ بسورتی گرنے والے انداز میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔



"ارے بیگم صاحبہ ہماری طرف سے تو آپ دسترخوان تو کیا، دنیا سے ہی اٹھ سکتی ہیں مگر رضائے الٰہی سے۔" علیم الدین نے اٹھتی ہوئی بیگم کو دیکھا جو سلیم کے گرنے کا بھی سبب بن رہی تھیں۔

"جی! یہ رضائے الٰہی ہی کا کرم ہے علیم صاحب کہ ہم دنیائے فانی میں تشریف فرما ہیں۔ ورنہ آپ تو ہمیشہ ہی سے چاہتے آئے ہیں کہ ہم آج مریں اور کل چالیسواں بھی ہو جائے۔"

گرتے پڑتے حمیدہ بیگم نے توپ کا جواب میزائل سے دے دیا تھا۔ والدین کی نوک جھوک پر سلیم میاں شریر مسکراہٹ کو دباتے رہ گئے جبکہ ابا جان نے اپنے منحنی وجود کو پھرتی سے اٹھا کر گرتی ہوئی بیوی کو سنبھالنے میں اپنے بیٹے کی مدد کی۔

"ارے حمیدہ بیگم! ہمارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو پروردگار کی رضا میں راضی رہنے والے انسان ہیں۔ دیکھ لیجیے اب تک آپ کو برداشت کر رہے ہیں۔"

"دیکھ رہے ہیں منے میاں! آپ کے والد صاحب کیا فرما رہے ہیں۔"

"ابا جان مذاق کر رہے ہیں اماں جان! ورنہ تو آپ جانتی ہیں......"

"ارے میاں! مذاق نہیں، ہم واقعی آپ کی والدہ کا بوجھ بہ مشکل برداشت کر رہے ہیں۔ دیکھیے تو ہمارے ننھے منے پاؤں کا حال، ان کا ہاتھی جیسا پاؤں ہے، بخدا قلب حزیں بند ہوا چاہتا ہے۔"

والد کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا، سلیم میاں نے جو نظریں دوڑائیں تو ابا کے نازک پاؤں پر اماں کا بھاری بھرکم پاؤں تھا اور یہ منظر شگفتہ بیگم نے بھی دیکھ لیا تو ہاتھ میں پکڑی بکرے کی گودے والی ہڈی پلیٹ میں گری۔

"ہائے سلیم جی! اماں ہوراں کو کہو اپنا پیر پیچھے کریں۔" شگفتہ نے تیزی سے سلیم میاں سے کہا۔ سلیم میاں نے شگفتہ پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔

"شگفتہ بیگم! آپ اپنی پلیٹ پر دھیان دیجیے جو گودہ آپ اتنی دیر سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں، اس میں کامیاب ہو گئی ہیں۔" شوہر کے اشارے پر شگفتہ بیگم کی نظریں پلیٹ پر گئیں پھر انہوں نے گودا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور چپک چپک کر کے انگلیاں چاٹنے لگیں۔

"بس کر دیجیے بیگم! انگلیاں چوسنا بند کر دیجیے اس سے قبل کہ ہم سب بے ہوش ہو جائیں۔"

شگفتہ اتنی خوب صورت اور معصوم تھیں کہ ان پر یہ سب سوٹ کرتا تھا، اس وقت بھی وہ معصومیت سے بولے جا رہی تھیں۔ برتنوں کو سمیٹ رہی تھیں۔ سلیم میاں

"خیراں نی خیراں، کتے مرگئی ایں۔ دسترخوان سمیٹ تے نال لے...... اماں ہوراں لئی دودھ پتی بنا کے لے آ۔" وہیں بیٹھے بیٹھے خیراں کو بلایا تو درمیانے قد کی موٹی سی عورت خود کو گھسیٹتی برآمد ہوئی۔ خیراں......! جس کو شگفتہ بیگم اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھیں، جو کام کم کھانا اور باتیں کرنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس ملازمہ سے حمیدہ خاتون کو گویا خاندانی دشمنی تھی۔

"تسی سدیا سی، نکی بی بی۔"

"آہو جی، اے جرم ہو گیا سی میرے کولوں...... تے ذرا آ، مرجایا کر۔ جنی دیر دس آوازاں نہ پے جان توں اپنی تشریف لے کے نہیں آندی۔"

اس بات پر خیراں نے بھاڑ جیسا منہ کھول کر بڑی سی جمائی لی کہ بدقسمتی اس کی طرف ایک نظر ڈالنے پر سلیم میاں کی نظر خیراں کے حلق میں چھوٹی زبان پہ گئی۔

"استغفراللہ۔" انہوں نے وہاں سے اٹھ جانا غنیمت جانا۔

"خیراں، اپنی بی بی تو قربان ہو جائے ساری دی ساری، نکی بی بی میری ذرا ناں اکھ لگ گئی سی۔" خیراں نے منہ کھولا، بڑی سی جمائی لی اور اس بار ـــــ علیم صاحب کی نظر کی کم بختی کہ کھلے منہ پر جا پڑی۔ وہ بیگم کے قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنے صاحب زادے کو دیکھنے لگے۔

"کچھ لوگوں کو زندگی بھر برداشت کرنا، کتنا دشوار ہوتا ہے، ناں سلیم میاں!"

"جی، مجبوراً کرنے پڑتے ہیں۔ بخدا ہم آپ سے اور سب سے خصوصاً اماں جان سے شرمندہ ہیں کہ ہمارے دل نے آپ سب کو، یہ سب برداشت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔" سلیم نے شگفتہ کو دیکھا جو خیراں کو ڈانٹ رہی تھیں۔

"زیادہ بکواس نہ کر خیراں! اپنی نظراں نوں ذرا قابو وچ رکھ۔ دس لوکاں جنا کھانی ایں، تے کم......"

"میرے کھان پین تے نظر نہ رکھیا کرو، نکی بی بی! ہولا خون اے نظر بڑی چھیتی لگ دی جے۔"

"فیر گیتی بکواس، چک برتن تے او کرلی کتھے دے۔" شگفتہ نے بیٹھے بیٹھے برتن سمیٹ دیے تھے، خیراں کو پکڑا رہی تھیں۔

اسی دوران حمیدہ خاتون بڑبڑا کر اٹھیں، تخت ہلنے سے میاں اور بیٹا متوجہ ہوئے۔

"اماں جان! آپ ٹھیک ہیں؟" جواباً اماں جان نے ایک خفگی بھری نگاہ ان پر ڈالی، دوسری شوہر پر ڈالی

اور زور سے اپنی ذاتی ملازمہ چمنیا کو پکارا تو چند لمحوں ہی میں ایک بہت نحیف قسم کی خاتون گویا اڑتی ہوئی پہنچ گئیں۔

''اوئی نوج بوا...... یہ کیا ہماری دلہن کا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے۔ دولہا میاں آپ نے تو کچھ نہیں کہا ہماری دلہن کو، ننھے میاں آپ ذرا اٹھیے ہم اپنی دلہن بیگم کے شانے دبا دیں۔ دیکھیے تو کیا رنگت ہو رہی ہے گویا، ہلدی کا کھیت ہوں۔''

چمنیا بیگم، حمیدہ خاتون کو جہیز میں ملنے والی خادمہ تھیں جو عمر میں چند ایک سال کی کمی کے ساتھ ان کی ہم عمر مگر انتہائی چاق و چوبند، پھرتیلی، پکا چہرہ، پان زدہ دانت، چوڑی دار پاجاما اور ڈھیلی سی شرٹ پہنے۔ پیروں میں صاف کھسہ، کلائی میں ہر وقت چھوٹا سا پاؤچ جو اُن کی کلائی سے بندھا رہتا، لہراتا رہتا۔ منہ میں ہر وقت پان موجود رہتا، گویا پان اور دانتوں دونوں کی چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی تھی، چلتے رہو، چباتے جاتے رہو۔ حمیدہ خاتون ان پر نثار اور وہ حمیدہ خاتون کی عاشق۔

ابھی جو وہ حمیدہ خاتون کی آواز پر اڑتی ہوئی آئی تھیں تو راستے میں خیراں سے ٹکرائیں بھی مگر مجال ہے جو جنگی طیارے کی پرواز میں کمی آئی ہو۔ اپنے علاقے زبان ثقافت کو اسی طرح سنبھالے ہوئے تھیں جیسے حمیدہ خاتون کو سنبھالے ہوئے تھیں اور اسی لیے وہ پہلے دن سے جو حمیدہ خاتون کو دلہن کہنا شروع ہوئیں تو آج تک یہ ہی کہا کرتیں اور علیم میاں کو اسی بات پر اختلاف کی گدگدی ہوتی تو وہ چڑ جاتے۔

''چمنیا! بیگم حمیدہ خاتون صرف ہماری دلہن ہیں۔ ہماری ہی رہنے دیجیے، ویسے آپ بھی ان کی طرف کی خاتون ہیں تو آپ ان کو آپا بیگم کہا کیجیے ناں۔''

علیم صاحب نے چمنیا بیگم کے روانی سے پان چباتے ہوئے اطراف سے بہہ جانے والی پیک کو دیکھا اور کراہیت سے اپنا منہ ٹشو سے صاف کرتے اٹھ گئے مگر چمنیا خاتون ان کی بات کا جواب دینے ان کی پیچھے لپکیں۔

''اے نوشا میاں! کیسی بدفالیں نکالا کرتے ہیں آپ، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرمائے جب تک آپ حیات ہیں ہم تو اپنی حمیدہ خاتون کو دلہن کہتے رہیں گے اور قسم لے لیجیے جس دن آپ دارفانی سے کوچ کر گئے ہم ان کو آپا جان پکارنا شروع کر دیں گے۔'' چمنیا بیگم پان کی پیک کی پھوار برساتی بولے گئیں۔ علیم صاحب ٹشو سے اپنا دفاع کرتے آگے نکل گئے، مگر ان کی بات سلیم کو خاصی بری لگی تھی مگر حد ادب ملحوظ نہ رکھتے تو اماں جان کی ڈانٹ مقدر میں لکھ دی جاتی لہٰذا ادب کے تقاضوں کو سنبھالتے ہوئے وہ اٹھے۔

''خالہ جان! زیادہ بولنے سے کبھی کبھی زبان کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے، دماغ کی نس دب جاتی ہے اور زبان مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کلمات جو آپ نے ابا جان کے لیے ادا کیے استغفراللہ۔'' اب تو چمنیا بیگم کو خوف نے گلے لگا لیا، اپنی جان سے عزیز زبان پر وہ قربان ہو گئیں۔

''اوئی...... نوج نوج...... ننھے ایسا ہوتا ہے کیا؟'' خوف سے ان کی خاصی بڑی آنکھیں باہر کو اُمڈ آئیں، سلیم میاں کھسک گئے ویسے ہی میدان صاف تھا، دسترخوان شگفتہ سمیت غائب تھا۔

''جی خالہ جان! بلکہ اس سے زیادہ نقصان بھی ہو سکتا ہے، مگر اب بتاؤں گا تو ہو سکتا ہے، آپ کی زبان کی ٹانگ ٹوٹ جائے لہٰذا اماں کو دیکھیے۔''

اماں جان گھورتے ہوئے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں چمنیا بیگم کچھ دیر کے لیے خوف سے کھڑی رہیں پھر حمیدہ خاتون کے قدموں میں بیٹھ کر پاؤں دبانے لگیں۔

''دبانا چھوڑیے، چمنیا بیگم! ہمیں کوئی مقوی سا مشروب لا کر دیجیے، بخدا ہمیں اختلاف قلب کے آسیب نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔''

''اوئی نوج! دلہن بیگم آپ پر آسیب کا سایہ ہو گیا، کہیں ہمیں بھی نہ اچک لیں۔ ہم تو ہیں بھی بے وزن سے۔'' چمنیا بیگم بدک کر دور ہو گئیں، حمیدہ خاتون نے گھورا۔

''چمنیا بیگم! ہمیں اس وقت کوئی مقوی مشروب درکار ہے آپ کی فضول باتیں نہیں۔''

''ارے، ابھی لیجیے چمنیا یوں گئی، یوں آئی۔'' اور واقعی چند ہی منٹ کے بعد حمیدہ خاتون کے جہیز میں ملنے والے چاندی کے گلاس میں صندل کا مشروب حاضر تھا۔

''لیجیے دلہن بیگم! ذرا طاقت اترے آپ کے دل میں تو چمنیا کے دل میں بھی سکون کی بہار اترے۔'' چمنیا نے دو گلاسوں کے بعد تیسرا گلاس بھرا اور پیش کیا تو سوچوں میں گم حمیدہ خاتون نے کڑی نظر چمنیا پر ڈالی۔

''نہ چمنیا بیگم! آپ چاہتی ہیں کہ ہم شربت پی پی کر نڈھال ہو جائیں۔ ہمارا پیٹ ''آپھر'' جائے، اونہوں، لیجیے بہو بیگم کی زبان کے اثرات کے بیچ ہماری زبان پر آگنے لگے، ارے...... ہمارے لاڈلے اکلوتے سلیم میاں، یہ کیا کر دیا آپ نے۔'' حمیدہ خاتون کی زبان پر کبھی غلطی سے کوئی پنجابی لفظ آ جاتا تو وہ پہروں اسی سوگ میں بتا دیتیں کہ اب یہ وقت آ گیا ہے کہ ایک اہل زبان خاتون لفظ ''آپھر'' استعمال کرے گی۔

''صبر...... صبر کیجیے دلہن بیگم! صبر کا مقام ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ سنا ہے کہ پنجاب کی زمین جہاں بے حد زرخیز ہوتی ہے وہیں اپنے اندر ایسا طلسم رکھتی ہے کہ بندہ سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ اب اس میں ہمارے ننھے میاں کا کیا قصور، شگفتہ کے حسن کے سحر میں کھو گئے...... صبر۔'' چمنیا بیگم باقاعدہ ٹسوے بہا کر اپنی دلہن بیگم کے ساتھ اظہار یک جہتی کا اظہار کرتیں تو حمیدہ خاتون کا درد سوا ہو جاتا۔

''ارے صبر کیسے کریں چمنیا بیگم! ہماری تو نسلیں تیتر بٹیر ہو گئیں۔ ہم کیسے صبر کریں، ہمارا خاندانی جاہ و جلال، ہماری ثقافت، ہماری خاندانی روایات...... ارے نجانے کس کی نظر کھا گئی ہمارے اس اثاثے کو۔''

ابھی اس صدمے کے آنسو رومال میں جذب نہیں ہوئے تھے کہ تین سالہ منیزہ بھاگتی ہوئی آئی، دادی کی گود میں سوار ہو گئی۔ اب ننھی سی بچی کیا جانے کہ اس کی دادی کے اندر کون سی جنگ جاری ہے۔ منیزہ نے دادی کا افسردہ چہرہ اپنے ننھے ہاتھوں میں لیا، چوما اور اپنی والدہ کے لہجے میں گویا ہوئی۔

''دادی جی...... دادی جی کی ہویا اے، تواڈیاں اکھاں وچ اتھرو کیوں آئے نے۔''

''اُف اُف...... اتنی ننھی عمر، اتنی ننھی زبان، اتنا میٹھا لہجہ کوئل جیسی آواز اور الفاظ...... الفاظ تھے کہ گوہ گراں جو حمیدہ خاتون پر گراوہ پچھاڑ گئیں۔

''چمنیا بیگم! ہماری نسل تیتر بٹیر بن گئی۔''

''ہائے دلہن بیگم! ہم آپ کے صدمے میں آپ کے ساتھ ہیں، ہائے، ہم کیا کریں، کہاں چلے جائیں دلہن بیگم۔''

''آپ فی الحال باورچی خانے میں تشریف لے جائیے خالہ جان! شگفتہ بیگم کو آپ کی ضرورت ہو گی اور منیزہ! آپ ہمارے پاس آئیے۔'' سلیم میاں جو منیزہ کے پیچھے آئے تھے، جلدی سے جائے حادثہ پر پہنچے، معاملہ اپنی گرفت میں لیا۔ منیزہ اٹھ کر باپ کی گود میں چڑھ گئیں۔

''منیزہ! آپ نے جو بات اپنی دادی جان سے کی، وہی بات ذرا اپنے ابا جان کی زبان میں دہرایئے۔''

باپ کے کہنے پر منیزہ بھولپن سے اتر کر پھر دادی کی گود میں بیٹھ گئیں، پہلے کی طرح منہ چوما اور پیار سے ان کے لب و لہجے میں وہی بات دہرائی۔

''دادی جان! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آئے، خیریت تو ہے ناں؟ آپ کو کس کی بات ناگوار گزری ہے؟'' وہی ننھی عمر، وہی ننھی زبان اور وہی الفاظ...... حمیدہ خاتون کو لگا جیسے جلتے

کوئلوں پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔

''ارے دادی جان آپ پر فدا ہو جائیں، آپ...... آپ ایسے ہی بات کیا کریں، اپنے والد صاحب کی زبان میں۔''

''جی، جیسے آپ کا حکم دادی جان!''

''ہائے! چمنیا قربان جائیں دلہن بیگم آپ نے پوتی کی زبان پر عبور ملاحظہ کیا۔ واللہ ہمارا دل تو باغ باغ ہو گیا۔'' چمنیا بیگم نے پلٹ کر منیزہ کی ڈھیروں بلائیں اتار کر اپنے سر لے لیں۔ لمحہ بھر کو حمیدہ خاتون بھی نہال ہو گئیں، منیزہ کو گود میں لے کر ڈھیر سارا پیار کر لیا۔

''اور چمنیا بیگم ہمارا دل بھی۔''

''اماں جان! ہم اور ابا جان کہا کرتے ہیں ناں آپ فکر نہ کیا کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مسلمان ہیں سب زبانیں ہماری ہیں، ہمیں سب کے ساتھ جینا اور خوش رہنا ہے۔''

☆☆☆

اس خاندان میں چونکہ مرد کی حکومت تھی اور حکومت وقت سے اختلاف بڑا مہنگا پڑ سکتا تھا اور پھر اختلاف کی ضرورت بھی تو نہیں تھی؛ بچے سیٹ تھے مگر ذرا جلدی کی وجہ سے صدیقہ بیگم فکر مند تھیں۔

''چلیے تو ٹھیک ہو گیا، آج رات ہمارا ان کے ہاں ڈنر ہے، ہم کوئی مناسب سی ڈیٹ رکھ لیتے ہیں۔''

''بہتر، لیکن عابد بیٹے سے پوچھ لیجیے۔''

''کیوں! کیا مطلب...... کیا عابد کو ہماری کسی بات سے اختلاف ہو سکتا ہے۔'' شوہر نے تنک کر جوابی حملہ کر دیا تو صدیقہ گہرا سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''اختلاف کیوں ہونے لگا، یہ بات میں نے صرف اس لیے کی ہے کہ عابد کو کسی میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر نہ جانا ہو۔''

''اوہ، ہاں یہ بات میرے پیش نظر نہیں تھی۔'' کبیر صاحب ایک دم چونک کر بولے اور ان کو عابد کا شیڈول یاد آ گیا۔

''آپ کے نہیں مگر ماں کے پیش نظر ہر بات ہوتی ہے، بچے کو کس وقت کیا چاہیے، کس وقت کیا کرنا ہے، میرے حساب سے دو ماہ تک اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ شادی جیسی ذمہ داری اور مصروفیت میں بزی ہو جائے۔''

''لیکن اپنا شیڈول عابد نے مجھ سے شیئر نہیں کیا۔''

''شیئر تو مجھ سے بھی نہیں کیا، مگر یہ جانتی ہوں کہ ماں کو اللہ تعالیٰ نے باپ سے زیادہ حسیات اور سوچ عطا کر رکھی ہے۔'' صدیقہ کا لہجہ نارمل تھا نہ اپنی قابلیت کا رعب ڈالنا تھا نہ اہمیت جتانا تھا مگر کبیر صاحب اندر سے کھسیانے ہو گئے تھے مگر کھسیاہٹ کو یوں نکالا۔

''خود ستائی کی بھی حد ہوتی ہے بیگم صاحبہ! یعنی کہ ضروری ہے کہ آپ ہر وقت اپنی ممتا کا علم لہرا لہرا کر اپنی اہمیت جتاتی رہیں۔ حد ہو گئی عابد نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' یہ ہی شکوہ انہوں نے اپنے بیٹے عابد سے شام کی چائے پر کر ڈالا۔

''ارے ابا جان! امی جان بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، دو ماہ تک تو سوچیے گا بھی مت۔'' بیٹے نے بھی ماں کی بات پر مہر ثبت کر دی تو کبیر صاحب نے اپنے ہاتھ میں چائے کا مگ لیے سوچوں میں گم بیگم کو دیکھا۔

''مگر کیوں بھئی۔'' کبیر صاحب کچھ الجھ گئے تھے، صدیقہ نے ایک گہرا سانس لے کر شوہر کو دیکھا پھر بیٹے کو دیکھا۔

''اس لیے ابا جان کہ ہمارے پروجیکٹ میں کچھ نئے شیئر ہولڈرز آئے ہیں۔ بہت بڑا پروجیکٹ ہے اور ہمیں شیئر ہولڈرز کی ضرورت ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے اچھے شیئر ہولڈرز مل گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بزنس کے حالات سیٹ ہو جائیں باقی کام تو ہوتے رہیں گے۔''

اتنی پاور فل دلیل کے بعد تو کوئی اعتراض باقی نہیں رہا تھا مگر وہ اپنے بھائی کو بھی جانتے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ شادی دو ماہ میں ہی کرنی ہے۔

''بات تو تمہاری بالکل درست ہے بیٹا! مگر تمہارے چچا جان نہیں مانیں گے۔''

''تو پھر آپ ایسا کریں کہ شاہدہ اور جمیل کی شادی کر دیجیے، وہ بھی خوش اور ہم بھی۔ یوں بھی دو دو شادیاں ایک ساتھ بہت مشکل کام لگتا ہے مجھے تو۔'' عابد نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا تو صدیقہ نے سکون سے گہرا سانس لیا اور معنی خیزی سے نظر شوہر پر ڈالی، کہا تھا نہ کہ دو شادیاں ایک ساتھ کرنا مشکل کام ہے۔

''کیوں؟ بھئی تم بھی اپنی ماں کی طرح ہمت ہار رہے ہو، اس میں کیا مشکل ہے، لوگ تو چار چار شادیاں ایک ساتھ کرتے ہیں اور تم لوگوں کو...... خیر دو ماہ بعد نہیں مگر شادیاں ایک ساتھ ہی ہوں گی۔'' بیوی اور بیٹے کی بات پر کبیر صاحب برہم ہو کر اٹھ کر چلے گئے، اسی وقت ان کے چھوٹے صاحب زادے ساجد آ گئے۔

''لگتا ہے قربانی کا موسم چار ماہ کے لیے ٹل گیا ہے لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی، کیوں امی جان!'' ساجد نے شاہدہ کو اشارے سے چائے لانے کو کہا اور ماں کے ساتھ بیٹھ کر بسکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے عابد کو دیکھا۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم پر تو یہ وقت آنا ہی نہیں۔'' عابد نے مسکراتے ہوئے طنز کیا تو ساجد نے شاہدہ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے بغور ماں کو دیکھا۔

''ارے بھائی جان! جتنا بھی وقت مل جائے غنیمت ہے، میرا تو کیس ویسے بھی ذرا بگڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے اگر امی جان کیس اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ...... کیوں امی جان!'' ساجد نے صدیقہ بیگم کو دیکھا جو گہری سوچ میں گم تھیں، بیٹے نے شانہ ہلایا تو وہ ماحول میں واپس آ گئیں شاہدہ بھی ماں کے قریب آ گئی۔

''ایسی کون سی بات ہے امی جان ساجد کا کون سا کیس ہے۔'' شاہدہ نے ماں کا شانہ دباتے ہوئے پوچھا تو صدیقہ نے اس موضوع سے دامن بچاتے ہوئے پاؤں نیچے رکھے اور صوفے پر سے اٹھنے لگیں۔

''کہاں چلیں امی جان! کبھی تو سکون سے ہمارے درمیان بھی بیٹھ جایا کریں، ہر وقت کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔''

''وقت نہیں، شاہدہ تم بھی اٹھو اور رات کھانے پر جانے کے لیے سب کے کپڑے استری کر کے لٹکا دو، پھر جاتے ہوئے سب کو شکایت ہوتی ہے، یہ نہیں ہوا تو وہ نہیں ہوا۔''

صدیقہ بیگم نے ایک کڑی نگاہ ساجد پر ڈالی تھی، عابد اٹھ کر جا چکا تھا۔ شاہدہ برا سا منہ بنا کر کھڑی ہو گئی اسی وقت رفیقہ آ گئی جو گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔

''اوہو تو گویا آپا جان اور بھائی اور ساجد بھیا آج اپنے سسرال جا رہے ہیں ڈنر پر، بہت اچھی طرح تیار ہونا۔''

رفیقہ نے شاہدہ کو ٹھوکا مارا، تو برتن سمیٹتی شاہدہ نے گھورا۔

''وہ تمہارا بھی ہونے والا سسرال ہے، تم بھی ڈھنگ سے تیار ہونا۔''

''چلو بھئی آپ سب تو اپنے سسرال جانے کی تیاری کرو اور میں اپنے دوستو کے گھر جاؤں گا۔'' ساجد نے

میز پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور باہر کی طرف مڑا۔

''کیوں بھائی جان، وہ آپ اپنے سسرال نہیں جائیں گے۔'' رفیقہ کی شوخی نے ساجد کے قدم جکڑ لیے، وہ غصے سے گھوما۔

''نہیں! اور نہ ہی مجھے کوئی وہاں جانے کا کہے۔'' انداز لہجہ اور الفاظ اتنے سخت تھے کہ تینوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''امی جان! اگر ساجد بھیا نہ گئے تو ابا جان سخت ناراض ہوں گے۔''

''یہ ساجد اور تمہارے ابا جان کا معاملہ ہے، تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ اتنا ہی سنا اور کیا کرو، جتنا کہا جائے۔'' صدیقہ نے دونوں بیٹیوں کو نرم لہجے میں سخت بات سمجھا کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔



بڑے بھائی کی طرف سے فون آچکا تھا کہ شادیاں چار ماہ بعد ہوں گی اور یہ ہی بات ظہیر صاحب کا بلڈ پریشر بڑھانے کا سبب بن گئی تھی، وہ غصہ سے بھناتے بیٹھے تھے۔

''حد ہوتی ہے کسی بات کی یعنی کہ کتنا لایعنی سا جواز ہے کہ بزنس کی وجہ سے شادی موخر کردی جائے۔ ہمارے بھائی جان تو اپنی بیگم اور بچوں کے غلام ہیں، ارے بھئی آپ سربراہ ہیں، شوہر ہیں، باپ ہیں فیصلہ سنا دیجیے مگر اب بھائی جان کو کون سمجھائے۔'' جب سے کبیر بھیا کا فون آیا تھا، ظہیر صاحب تلملائے پھر رہے تھے۔ اب دائیں بائیں کام کرتی رقیہ یہ تک نہ کہہ پائیں کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے۔

''امی جان بریانی تو تیار ہے اور قورمہ بھی۔ شکیل بھیا سے کہیے گا کہ آتے ہوئے نان لیتے آئیں اور میٹھے میں ٹرائفل بنایا ہے، مناسب ہے یا کچھ اور بھی بنالوں۔''

اسماء نے اپنے ذمے لگائے کام کرکے تفصیل آکر بتائی، جو چہرے پر تناؤ لیے ظہیر صاحب نے بھی سنی۔ میٹھے پر آکر انہوں نے انتہائی کڑوی نظر بیٹی پر ڈالی۔

''کوئی ضرورت نہیں مزید کسی اور میٹھے کی اور سادہ سی سویاں نہیں بنا سکتی تھیں۔ ٹرائفل میں ستر چیزیں اور ڈالی ہوں گی، حد ہے کوئی فضول خرچی کی، بالکل ماں پر جارہی ہو۔''

''جی الحمدللہ۔ یہ شکرانہ اسماء نے سوچ میں ادا کیا تھا اور کبھی کبھی سوچ بے زبان ہوتی ہے، رقیہ بیگم نے ایک شاکی سی نظر شوہر پر ڈالی۔

''بات آپ کی درست نہیں ہے جی۔''

''جی ہاں، میری ہر درست بات کو آپ نے غلط ثابت کرنا ہوتا ہے اور یہ ہنر آپ میری بیٹیوں کو سکھا رہی ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے، ابا جان وہ......''

''اسماء! تم جاؤ کچن میں۔'' اسماء نے ماں کو دیکھا اور ایک نظر سخت باپ کو دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ رقیہ نے ہمت کرکے ظہیر صاحب کا سر دباتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''بخدا! ظہیر صاحب میں آپ کے خلاف جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی، مگر وہ اب چونکہ ہمارے بچوں کے سسرالی بھی ہیں اس لیے ہمیں ان کی زیادہ عزت اور خدمت کرنی چاہیے۔ بریانی تو عابد اور ساجد کو بے حد پسند ہے اس لیے بنالی کہ ہمارے ہونے والے داماد ہیں اور قورمہ نان بھائی جان کو پسند ہیں۔'' رقیہ کا نرم ٹھنڈی پھوار پھوار جیسا لہجہ تھا کوئی اور نارمل شوہر ہوتا تو ان کے لہجے میں کھو جاتا، ہاتھ تھام کر شکریہ ادا کرتا مگر اس خاندان کے

ہم آج کے ترقی یافتہ ماحول میں اتنا پڑھ لکھ کر بھی، دور جہالت میں جی رہے تھے۔

''بس...... بس بہت ہوگیا، زیادہ اداکاری کی ضرورت نہیں تشریف لے جایے۔'' ظہیر صاحب نے انتہائی سختی سے ان کے ہاتھ جھٹکے اور ٹی وی کی آواز فل کردی۔ رقیہ حسب معمول ماحول کو فساد سے بچانے کے لیے اپنی برداشت اور صبر کے سمجھوتے کے، پنجرے میں بند ہوگئیں اور اس پنجرے کا ایک دروازہ کچن میں کھلتا تھا۔

''اسماء بیٹا تم ابھی تک ویسے ہی گھوم رہی ہو، جاؤ جاکر اچھی طرح تیار ہوجاؤ تمہارے سسرال والے آرہے ہیں اور اس جھلی ثمینہ سے بھی کہو تیار ہوکر ڈھنگ سلیقے سے سامنے آئے، پچھلی بار بھی سر جھاڑ منہ پھاڑ اٹھ کر آگئی تھی تو تمہارے تایا جان کتنا خفا ہوئے تھے۔ اس بات پر کتنی باتیں بنائی تھیں انہوں نے۔''

رقیہ نے سارے کھانے کو دیکھا اور کباب کی ڈش نکال کر رکھی، اسماء نے ٹرائفل کا بڑا سا باؤل اٹھا کر فریزر میں رکھا اور مسکرا کر پلٹی۔

''ویسے امی جان! ہر جگہ ہر خاندان میں تو گھر کی عورتیں بی جمالو ہوتی ہیں، باتیں بناتی ہیں مگر ہمارے خاندان کے مرد یہ کردار ادا کرتے ہیں...... ہے ناں حیرت کی بات۔'' اسماء کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی طنز چھپا ہوتا۔ رقیہ سمجھ جاتیں مگر وہ بیٹی کو اس ماحول کے خلاف جانے دینا نہیں چاہتی تھیں، اسی لیے ہنس کر ٹال جاتیں۔

''ہوتے ہوں گے بیٹا! ہمیں کیا پتا، ہم کوئی ہر ایک کے بارے میں جانتے ہیں۔ چھوڑو یہ سب اور تیار ہوجاؤ، آخر تمہارے ہونے والا شوہر آرہا ہے بھئی......'' رقیہ پیار سے اسے چھیڑ رہی تھی، اسماء کو واقعی شرم آرہی تھی مگر شوخی میں آنچل کا کونا دانتوں میں دبا کر بولی۔

''ہائے اللہ! امی جان کیسی باتیں کرتی ہیں، ہمیں لاج آرہی ہے۔''

''جاؤ شریر کہیں کی جاؤ اور ثمینہ کو خود ہی تیار کردو۔ وہ تو بس میرے دل کا درد بن گئی ہے، کیا بنے گا اس کا۔''

ایک طرف جہاں رقیہ اسماء کے انداز سے خوش اور مطمئن تھیں، دوسری طرف ثمینہ کی صحت اس کے خوف اور خوف سے ہکلانے والی عادت سے پریشان تھیں۔ وہ اس کی شادی کے بعد کے مستقبل کے لیے سخت خوف زدہ تھیں۔

''یااللہ! میری بچی کی حفاظت فرمانا، اس کو بھی نارمل کردے۔ باپ بھائی تو شادی کے بعد اگر اللہ نہ کرے کوئی بات ہوتی ہے تو ہرگز اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھیں گے۔'' ان ہی خوف زدہ سوچوں کے ساتھ وہ کام میں مصروف ہوگئیں۔ ماں سے آرڈر لے کر اسماء جب اپنے اور ثمینہ کے مشترکہ کمرے میں آئی تو ثمینہ آنکھیں بند کیے ٹہل ٹہل کر پڑھ رہی تھی۔ چند دنوں میں اس کے امتحان ہونے والے تھے، اسماء دبے پاؤں آئی اور اس کے سر پر ٹھونگا مارا۔ وہ خوف زدہ ہوکر......

''کک...... کک...... اف آپا آپ بھی...... ڈرا دیتی ہیں۔''

قبل اس کے کہ وہ ڈر کر بے ہوش ہوتی اسماء کو دیکھ کر سانس بحال کرکے غصے سے بولی۔

''ثمینہ! تم بھی نہ، کیوں ڈر جاتی ہو؟''

''آپا آپ بھی مذاق اڑاتی ہو میرا، جاؤ میں نہیں بولتی۔'' ثمینہ ناراض ہوکر اپنے اسٹڈی ٹیبل پر آکر بیٹھ گئی، اسماء نے آگے بڑھ کر اس کے کرلی بال جو چٹیا سے نکل آئے تھے اس کے کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتوں میں لیا۔

''کتنی کشش ہے ناں تمہارے اس گندمی رنگ میں، سچ دل چاہتا ہے بندہ دیکھتا رہے۔''

''اوہو بھئی آپا! کیا ہوگیا ہے آج آپ کو۔ خود کو تو دیکھو ذرا آئینے میں، ابا کی طرح آپ گوری سی بہت ہی۔'' پلٹ کر ثمینہ نے اسماء کا ماتھا چوم لیا تو اسماء نے اسے محبت سے جکڑ لیا۔

’’نہیں، جتنی تم حسین ہوناں، اتنی نہیں بس تھوڑا سا نارمل ہوجاؤ۔‘‘
’’اور......اور......نارمل کیسے ہوتے ہیں؟‘‘
’’ایسے کہ زندگی کے حقائق کو ان کی خوب صورتی یا بدصورتی کے ساتھ اپنالو، نارمل رویہ اپناؤ اور جلدی سے تیار ہوکر آؤ۔‘‘ اسماء نے اسے الگ کرکے ہاتھ پکڑا اور اس کی الماری کے سامنے کھڑی ہوکر اس کے لیے کوئی لباس دیکھنے لگی۔ ثمینہ حیرت سے بہن کے مطمئن چہرے اور انداز کو دیکھتی۔
’’تیار ہوجاؤں، ہم کہیں جارہے ہیں کیا؟‘‘
’’اُف میرے اللہ، کیا بنے گا اس سادھولڑکی کا۔‘‘ اسماء نے اپنا ماتھا پیٹا اور خود ہی اس کے لیے خوب صورت سا استری شدہ جوڑا نکالا اور اس کے ہاتھ میں دبایا۔
’’ہم کہیں نہیں جارہے بلکہ تمہارے سسرال والے آرہے ہیں۔‘‘
’’ہائے اللہ، وہ......وہ......وہ لوگ آرہے ہیں۔‘‘ ثمینہ کا سانس رکنے لگا، کپڑے کارپٹ پر گرے۔ اسماء نے اسے دیکھا۔
’’ہاں وہ آرہے ہیں، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟‘‘
’’نن......نن......نہیں تو......مم......مم......مجھے کوئی اعتراض نہیں......مگر آپا!‘‘
’’جب اعتراض نہیں تو یہ مگر......کیا......؟‘‘
’’دیکھوناں آپا! وہ لوگ آئیں گے......آئیں گے تو شادی کی تاریخ بھی رکھیں گے اور تاریخ پر شادی بھی ہوگی۔‘‘
’’شادی ہوگی تو بچے بھی ہوں گے......یہ ہی ناں۔‘‘
’’یہ ہی تو......وہ......وہ میرا مطلب ہے۔‘‘ اسماء شرارت میں اسے چھیڑتی رہی اور وہ معصومیت میں سمجھے بغیر رہ گئی۔
’’وہ......وہ میرے امتحان کا پھر کیا ہوگا۔ میں......میں پھر پڑھائی بند کردوں یا نہ کروں۔‘‘ ثمینہ نے شرماتے ہوئے واقعی اپنی کتاب بند کرکے ایک طرف رکھ دی تو اسماء کو اس پر پیار آگیا، اس نے اسے پیار سے پھر لپٹالیا۔
’’دیکھو تو پڑھاؤ چور کو، ابھی کچھ اتا پتا نہیں، کتابیں پہلے بند کرکے رکھ دیں۔ بڑا شوق ہورہا ہے شادی کا۔ میں جانتی ہوں، تم ساجد پر مرتی ہو، ہے ناں۔‘‘ اسماء نے اسے گدگدا کر چھیڑا تو وہ بیر بہوٹی بن گئی، چہرہ اسماء ہی کے آنچل میں چھپالیا۔
’’آپا آپ بھی ناں، بس کمال کرتی ہو۔ اب وہ اچھے لگتے ہیں تو میں کیا کروں، ان کو اچھا لگنے سے روک بھی تو نہیں سکتی ناں۔‘‘ وہ اسماء سے لپٹ گئی۔
’’ہرگز......ہرگز روکنے کی ضرورت نہیں لیکن شادی بھول جایئے۔‘‘
’’ہیں......کیا مطلب شادی بھول جاؤں۔ وہ......وہ تو......‘‘ وہ اسماء کی بات سمجھے بغیر گھبرا گئی، سانس تیز ہوئی اسماء خوف زدہ ہوئی، کپڑے اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیے اور اسے باتھ روم کی طرف دھکیلا۔
’’بس بس......زیادہ سانس پھلانے کی ضرورت نہیں احمق لڑکی! اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پہلے شادی ہم بڑوں کی ہوگی، پھر تم چھوٹوں کی باری آئے گی۔ چلو جلدی سے تیار ہوجاؤ، وہ لوگ آنے والے ہیں۔‘‘ اسماء نے اسے دروازہ کھول کر اندر کیا، وہ شرما کر بھاگ گئی اسماء کمرے کی چیزیں سمیٹ کر، خود تیار ہونے لگی۔



’’کیوں بھئی، یہ ساجد میاں تشریف کیوں نہیں لائے کھانے پر۔‘‘ ظہیر صاحب نے سب کو آتے دیکھ کر، ساجد کی عدم آمد کو راستے ہی میں نوٹس کرلیا۔ صدیقہ بیٹیوں کو دیکھ کر خود میں سمٹ گئیں۔
’’ارے ظہیر میاں! ہم سے کیا پوچھتے ہو، تمہارا بھتیجا ہے مزاجاً تم پر ہی گیا ہے۔ عین وقت پر کہہ دیا، دوست کے ہاں کھانے پر جارہا ہوں، چچا جان سے معذرت کرلیجیے گا۔ لہٰذا ہم ان کی طرف سے ڈنر پر شرکت نہ کرنے کی معذرت چاہتے ہیں۔‘‘ کبیر نے بات ہلکے پھلکے انداز میں کی تاکہ ظہیر صاحب کا گرم مزاج مزید گرم نہ ہوجائے۔
’’رہنے دیجیے بھائی! آپ ساجد میاں کی اس گستاخی کو ہمارا ہم مزاج بنا کر ختم کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ حد ہوتی ہے نہ رشتوں کا احترام، نہ پروا۔ اب ان کے دوست احباب، چچا اور ہونے والے سسر سے زیادہ عزیز ہوگئے۔‘‘
ساجد نہیں آیا تھا، اس پر ظہیر صاحب کے جو تاثرات جذبات تھے اس کا اظہار وہ سرِ محفل کرچکے تھے مگر اپنے کمرے میں موجود ساجد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کونوں پردوں کے پیچھے چھپ کر دیکھنے کا منصوبہ بنائی ثمینہ کے دل کے اندر اداس سی شام اتر آئی۔ پھر غیر محسوس انداز میں ہاتھ کانوں تک گئے، چھوٹے سائز کے جھمکے اتارے، پھر ہونٹوں پر بہت ہلکے سے رنگ کی لپ اسٹک رگڑی اور آنسوؤں کا ایک تیز ریلا آیا اور آنکھوں کا کاجل بہا لے گیا۔
’’اسماء بھئی ہماری گڑیا سی بھابھی جان کیا کررہی ہیں؟‘‘ سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے شاہدہ کی آواز آئی تو ثمینہ تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔
’’ارے کہاں گئی، یہ لڑکی بھی ناں بہت سست ہے۔ دیکھو تو شاہدہ آدھا گھنٹہ پہلے میں اسے تیار ہونے کا کہہ کر گئی تھی ابھی تک واش روم ہی میں ہے۔‘‘ اب یہ اسماء کیا جانے کہ وہ ساجد کی آمد کا سن کر کتنی جلدی تیار ہوگئی تھی اور نہ آنے کا سن کر ساری تیاری، اشکوں میں بہہ گئی تھی۔
’’اوہو تو انٹر کی تیاری ہورہی ہے۔‘‘ ثمینہ کی ہم عمر رفیقہ اس کی پڑھائی کی میز پر کتابیں دیکھ کر بولی۔ اسماء اور شاہدہ ہم عمر تھیں اور دوستی بھی خوب تھی۔
’’ویسے شاہدہ! یہ ساجد بھائی صاحب کیوں نہیں آئے؟‘‘ اسماء اندر سے اداس ہوگئی تھی کہ ثمینہ کو اس کا بہت انتظار تھا اور وہ خوش تھی اس کے آنے کا سن کر۔
’’ارے واہ اسماء بہن واہ......آپ تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے کہ آپ کچھ نہ جانتی ہو۔ ارے ہونے والی بھاوج ہمیں کیا پتا کیوں نہیں آئے۔ وہ اس خاندان کے مرد ہیں اور......یہ بات تم بھی......ویسے تم یہ بتاؤ ناں تم نے ہمارے منگیتر صاحب کو کہاں چھپایا ہوا ہے، نظر ہی نہیں آرہے۔‘‘ اس بات پر اسماء خوب ہنسی۔
’’ارے واہ شاہدہ بہن! آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں جیسے کہ آپ کچھ نہ جانتی ہوں۔ میرے بھیا بھی اسی خاندان کے مرد ہیں۔‘‘ پھر دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر خوب ہنسیں تو رفیقہ متوجہ ہوگئی۔
’’اگر میں آپ لوگوں کی باتیں یہ ہنسی مذاق اگر اس خاندانی مردوں کو بتادوں تو پتا ہے ناں کیا ہوگا۔‘‘
’’ہمیں تو کچھ نہیں ہوگا، ہاں بس ہماری ماؤں کو ایک پاؤں پر رات گزارنی پڑے گی کہ یہ تربیت کی ہے ہماری اولاد کی۔‘‘ شاہدہ اور اسماء کی ہنسی میں دکھ اور کرب کی آمیزش تھی۔
’’ویسے کتنی عجیب سی بات ہے ناں کہ اتنی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ہمارے ہاں کے مرد عورت کو برابر ...ا ہونے کی اجازت نہیں دیتے، پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔‘‘
’’ارے ایسے بہت سے خاندان ہے جہاں مرد کی مردانگی کا غنڈہ راج چلتا ہے ورنہ بے شمار گھرانوں میں

عورت کو بہت محترم سمجھا جاتا ہے۔ بس اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔''

''اور دیکھو ناں اس خاندان کی ہر نسل کی عورت کے نصیب اسی خاندان کے نصیب سے جڑے ہیں۔''

اسماء اور شاہدہ بڑی تھیں معاملات کو گہرائی میں لیتی سوچتی تھیں۔

''ویسے شاہدہ! تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے، میرے جمیل بھیا بہت اچھے ہیں۔'' اسماء نے قدرے اترا کر کہا تو شاہدہ اس کے مقابل کھڑی ہوگئی۔

''اچھا جی، یہ خوش گمانی ہے آپ کو، ایسی بات ہے تو میرے بھیا عابد بھی اتنے ہی اچھے ہیں جتنے آپ کے بھائی جان۔ لیکن شادی کے بعد آپ کے بھائی جان اور میرے بھائی جان، اپنے اپنے ابا کی طرح اچھے ہو جائیں گے۔'' شاہدہ نے اسماء کی ناک کھینچی۔

''ہائے، نہیں شاہدہ! کیا واقعی؟'' اسماء نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''ہائے، ہاں...... اسماء! آزمائش شرط ہے۔''

شاہدہ نے بھی اسی طرح کہا تو دونوں پھر دل کھول کر ہنس پڑیں تو ثمینہ کے انتظار میں ٹہلتی رفیقہ جو ان کی باتیں سن رہی تھی، گھبرا کر ان کے قریب آئی۔

''اف توبہ ہے، کتنی خوف ناک باتیں کر رہی ہیں آپ لوگ۔''

''آزمائش ہے میری بہنا۔'' شاہدہ نے رفیقہ کو چھیڑا۔

''بالکل چھوٹی بھابھی جان۔'' اسماء نے بھی اسے گدگدایا۔

''اُف چھوڑیں بھئی، پہلے تو آپ لوگ آزماؤ۔ ہماری باری تو بعد میں آئے گی۔ ثمینہ...... ارے بھئی ثمینہ کی بچی! اندر سو تو نہیں رہی ہو، باہر نکلو بھئی۔ تمہاری اور میری آپا مل کر مجھے ہراساں کر رہی ہیں۔'' رفیقہ نے باقاعدہ واش روم کا دروازہ پیٹ ڈالا تو جیسے ثمینہ اندر کھڑی اسی دستک کی منتظر تھی۔ چہرہ دھو کر باہر آ گئی، اسماء نے غور سے اسے دیکھا اور اس کے قریب آ گئی۔

''تم روتی رہی ہو۔'' اسماء کو دکھ ہو رہا تھا کہ اس کی معصوم کلیوں جیسی بہن اس ہرجائی، جسے اس کی پروا ہی نہیں اس کے لیے روئی تھی۔

''نن...... نن...... نہیں تو...... منہ...... منہ دھویا ہے ناں تو اس کے قطرے ہیں آنکھوں میں اور چہرے پر...... پانی ہے یہ۔''

''نل کے پانی اور آنکھوں کے پانی میں واضح فرق ہوتا ہے، خیر دیکھو تمہاری دو دو نندیں آئی ہیں۔ ان سے پوچھو تمہارے منگیتر کو کیوں نہیں لائیں۔'' کسک کی ایک لہر دل میں اتار کر اسماء نے ثمینہ کو شاہدہ کے سامنے کر دیا۔

''نن...... نہیں اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے آپا! ان...... ان کو کوئی کام ہوگا، تب ہی تو نہیں آئے...... وہ......'' ثمینہ کچھ تو طبعاً ہی کم گو اور سادہ تھی اور کچھ وہ گھر کے مردوں خصوصاً باپ کی سخت گیری سے ہر وقت سہمی سی رہتی۔ اس وقت بھی وہ بہت دھیمے سہمے لہجے میں بولی تو وہ تینوں جو اسی کی طرح اسی ماحول کو جی رہی تھیں مگر نارمل تھیں ہنستے ہوئے دہری ہو گئیں۔

''اوئے ہوئے ان...... ان...... یہ ان کون ہیں بھئی۔'' رفیقہ نے اسے چھیڑا وہ مزید سمٹ گئی، چہرے پر لالی آ گئی۔

''ویسے چھوٹی بھابھی! تمہیں پتا کیسے چلا کہ ان کو کوئی کام ہوگا تب ہی وہ نہیں آئے۔ کیا انہوں نے آپ کو بتایا ہے۔'' شاہدہ نے بھی ثمینہ کو گدگدایا تو وہ اسماء سے لپٹ گئی۔

''آپا! دیکھیے ناں، ان دونوں کو۔''

''بس کر دو بھئی، میری بہن کو مت چھیڑو۔''

''کیوں نہ چھیڑیں...... ہم تو چھیڑیں گے بھئی، ہماری بھابھی جان ہیں۔'' رفیقہ شریر ہو رہی تھی۔

''اسماء!'' باہر سے جمیل کی آواز آئی شاہدہ نے جھٹ دوپٹا لپیٹا۔ ان تینوں نے شوخی سے شاہدہ کو دیکھا۔

''آ جایے بھائی جان! یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔'' اسماء نے شرارت میں جھوٹ بولا، شاہدہ نے من پسند بات پر خوشی سے مگر مصنوعی خفگی سے اسماء کو دیکھا۔

''اوہ السلام علیکم! ارے بھئی یہاں تو سب موجود ہیں۔'' جمیل بھی مصنوعی لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''جی...... جی جیسے آپ کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ بھابھی جان یہاں ہیں۔'' اسماء نے شرارت سے کہا۔ جمیل نے سمٹی ہوئی شاہدہ کو دیکھا، جس نے خاصا بڑا گھونگھٹ نکال رکھا ہے۔

''ارے پاگل وہ...... وہ ابا جان قہوہ کا کہہ رہے ہیں اور تم لوگ یہاں گپ بازی میں مصروف ہو، جاؤ قہوہ بناؤ۔''

''آپ چلیں بھائی جان! ہم قہوہ بنا کر لے کر آتے ہیں۔'' اسماء اور رفیقہ نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا تو جمیل میاں کان کھجا کر رہ گئے۔ قہوہ کا کہنا تو بہانہ تھا، اصل میں تو وہ شاہدہ کو دیکھنے آئے تھے جو لمبا گھونگھٹ نکال کر دانستہ طور پر جلا رہی تھی۔

''تت...... تت...... تم لوگ جاؤ میں آتا ہوں۔''

''تو یوں کہیے ناں دولہا بھائی کہ بات کرنی ہے منگیتر سے۔'' رفیقہ نے ہنس کر کہا تو وہ کھسیانا ہو گیا تینوں چلی گئیں۔ نیچے زور و شور سے شادی کی تاریخ پر بحث ہو رہی تھی۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا بھائی جان کہ آپ نے گھر میں سب کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے کہ ہر کوئی اپنے فیصلے سنا رہا ہے۔''

ظہیر صاحب کے طنز کا نشانہ صدیقہ بیگم بھی تھیں انہوں نے ایک نظر شوہر کو دیکھا۔ جو بات کرنے کے لیے پر تول رہے تھے، باقی سب تو سامع تھے، مقرر تو صرف ظہیر یا پھر کبیر صاحب تھے۔ لفظ ڈھیل پر گھر کی خواتین نے ایک دوسرے کو دیکھا، نظروں ہی نظروں میں لفظ ڈھیل کو دہرایا گیا۔

''دیکھو میاں!'' اس وقت کبیر صاحب ان کی بات کا جواب دینے کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے۔ وہ ظہیر سے بڑے تھے اور ظہیر صاحب لفظ ڈھیل کا جو ''بم'' ان پر پھینکا تھا اس کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اب وہ اتنے کمزور بھی نہیں تھے کہ بیوی یا بچے ان کو صرف فیصلے سنایا کرتے۔

''جی بھائی جان! بس سن رہا ہوں۔'' کڑے تیور کے ساتھ ظہیر صاحب تمام حسیات کے ساتھ متوجہ ہوئے۔ رقیہ اور صدیقہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کسی ممکنہ فیصلے اور دھماکے کے لیے تیار ہونے لگیں۔

''ہاں تو تمہارا خیال ہے کہ میرا، گھر یا اپنے گھر والوں پر کوئی کنٹرول نہیں اور اس بات کو تم نے ''ڈھیل'' کہہ دیا۔''

''جی تو اور کیا نام دوں، یعنی کہ اسماء چوبیس کی ہونے والی ہے۔ ثمینہ بیس کی ہو جائے گی اور ابھی آپ ایسی بات کریں تو غصہ تو آئے گا ناں۔'' ظہیر کی شخصیت کی سب سے بڑی برائی یہ تھی کہ غصہ میں ہر رشتہ لحاظ بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔

''میں مانتا ہوں ظہیر! میری بیٹیاں بھی بڑی ہوگئی ہیں مگر اس میں اتنی گھبرانے والی کیا بات ہے۔ رشتے

طے ہیں، گھر کی بات ہے اور پھر ہم کون سا چھ سال کی بات کر رہے ہیں عابد تو فقط......"

"کبیر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، ظہیر میاں! دراصل عابد چاہتا ہے......" کبیر صاحب کچھ الجھ سے گئے تھے اور یہ الجھن ان کی بیگم بھانپ گئی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے معاملے کا اسٹیئرنگ سنبھالا کہ شاید گاڑی آرام سے چلنے لگے مگر ظہیر صاحب نے زور سے ٹکر ماری۔

"تو یوں کہیے ناں بھائی جان کہ ساری پلاننگ بھابھی بیگم کی ہے آپ تو بلاوجہ عابد میاں کے سر الزام دھر رہے ہیں۔"

"اُف......اف......رقیہ اور صدیقہ نے ایک دوسرے کو دیکھا ماتھا پیٹا۔کبیر صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ہرچند کہ وہ بھی بیگم کے کچھ ایسے خیر خواہ تو نہیں تھے مگر حقیقت بتانا بھی ضروری تھا سو بتادی۔

"اب چھوڑیے بھی بھائی جان، گھر پر آپ کا اختیار نہیں۔ بات آپ کی مانی جاتی نہیں، آپ خواہ مخواہ دوسروں پر الزام لگا کر خود بری الذمہ ہو رہے ہیں۔" ظہیر صاحب نے قہوے کے بجائے اپنے غصے کے زہریلے گھونٹ بھرے مگر پھر اس کڑواہٹ کو وہاں پر موجود کسی نے محسوس کی۔

"بدتمیز، بدلحاظ......" صدیقہ بیگم نے بھی خیالوں ہی خیالوں میں دیور کو جھاڑ پلادی۔

"اچھا یہ بات ہے تو ظہیر میاں! اگلے ماہ کی کوئی بھی تاریخ رکھ کر آجاؤ، اپنی بہو لے آؤ، ہم اپنی بہو لینے آجائیں گے۔" تیر سیدھا نشانے پر لگا تھا۔کبیر صاحب نے اپنی مردانگی پر حملہ ہوتے دیکھا تو اس حملے کو پسپا کرنے کے لیے وہ فیصلہ کرڈالا جس کا انہوں نے خود بھی نہیں سوچا تھا نہ ہی کسی اور نے۔ کمرے میں ایک سناٹا چھا گیا تھا جہاں اس اعلان کے بعد مبارک سلامت کا شور ہونا چاہیے تھا وہاں سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔خود ظہیر بھونچکا رہ گئے تھے، دونوں خواتین کو تو گویا سکتہ ہو گیا تھا۔

"دیکھیں جی عابد تو......" کافی دیر کے بعد صدیقہ کے حلق سے ایک خوف زدہ سی لرزتی آواز برآمد ہوئی۔

کبیر کا چہرہ شدت ضبط اور غصے سے سلگ رہا تھا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو سب ہی اٹھ گئے۔

"بس اب ایک لفظ کوئی نہیں بولے گا، مرد کی ایک زبان...... کہہ دیا سو کہہ دیا۔ عابد اور اسماء، جمیل اور شاہدہ کی شادی ہوگی، ساجد اور ثمینہ کا نکاح ہوگا۔"

کبیر صاحب بھائی کی طعنہ زنی سے خاصے اپ سیٹ ہوئے تھے، ایک لمحے میں فیصلہ سنا کر وہ باہر نکل چکے تھے۔ظہیر صاحب کچھ چپ تو ہو گئے مگر مجال ہے جو شرمندہ ہو جائیں۔ بہت زیادہ خوشی بھی اچانک ملے تو انسان بوکھلا جاتا ہے اور یہ ہی حال ثمینہ کا ہوا تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ اسماء سے لپٹ کر شدت سے رو پڑی۔

"یہ...... یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

☆❁☆

"کل سے تم چار گھنٹوں کے لیے اسٹور پر رہو گی، کام کر کے کھانا ملے گا ناں تو تمہیں پیسے کی قدر ہوگی جو تم یوں اڑاتی پھرتی ہو۔ اسٹوپڈ گرل!" راہی صاحب —— نے ٹمی کو اس واقعے کے بعد خاصا آڑے ہاتھوں لیا تھا مگر وہ پاپ کورن کا باؤل لیے، کارپٹ پر اوندھی لیٹی کھاتی رہی۔ انداز ہی سے لگ رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"بولے جاؤ ابا، ہو کیئر۔" مزید برآں اس نے باپ کی بات اور آواز کو دبانے کے لیے ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا۔ اس حرکت نے راہی صاحب کے غصے کا گراف بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر ٹی وی آف کر دیا۔

"ڈیڈ! واٹ آر یو ڈوانگ...... مام...... مام......" ٹمی احتجاجاً اٹھی، باؤل میز پر پٹخا اور ماں کو بتانے چلی گئی، راہی صاحب بھی اس کے پیچھے گئے۔

"مام! مائی ڈیڈ از ویری ویری......" وہ کچھ غلط ہی کہنے والی تھی کہ راہی صاحب کو آتے دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ روبیکا سب سمجھ چکی تھی، یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں، باپ بیٹی کی ہر وقت کی جنگ تھی۔ اس نے مسکرا کر باپ بیٹی کو دیکھا۔

"یور ڈیڈ گوئنگ میڈ...... ہاہاہا۔" روبیکا کا بے باک قہقہہ ان کے فلیٹ میں گونج گیا مگر اس بات پر نہ تو ٹمی کی ڈھٹائی میں فرق آیا، نہ ہی راہی صاحب کا غصہ کم ہوا۔

"اس لڑکی کو سمجھاؤ کہ کل سے یوں یہ آوارہ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کہیں نہیں جائے گی۔ اپنی اسکول جائے گی، تمیز سے پڑھے گی اور بعد میں اسٹور کو ٹائم دے گی، اوکے۔"

راہی صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور واپسی کے لیے پلٹے، ٹمی نے زبان دکھا کر باپ کو منہ چڑایا۔ روبیکا نے سرزنش کے طور پر اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"ہی یور فادر۔"

"اوہ رئیلی...... ان کا ایٹیٹیوڈ دیکھا ہے، کیا کوئی فادر اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔" ٹمی نے باپ کو سنانے کے لیے زور سے کہا تو راہی صاحب انتہائی غصے سے پلٹے۔

"کیا...... کیا ہے تمہارے ڈیڈ نے تمہارے ساتھ، عیش کر رہی ہو، بدتمیزیاں کرتی پھرتی ہو اور تو اور اب خیر سے پولیس اسٹیشن بھی جانا شروع کر دیا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میری حیثیت اور دوستی کام آگئی ورنہ سڑتی رہتی وہیں پر۔" راہی صاحب کو جو شرمندگی تھانے میں اٹھانا پڑی تھی۔ اس کا سارا غبار انہوں نے ٹمی پر اتار دیا تھا۔ جسے ابھی بھی کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ جو کوریڈور عبور کر کے کچن میں جا چکی تھی اور فریج کھولے کھڑی کھانے کو کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"راہی! تمہیں کیا ہو گیا ہے، بالکل پاگل ہی ہو گئے ہو۔ ارے یہاں پر ایسا ہی ہوتا ہے، بڈھے ہو گئے ری ایکٹ ایسے کر رہے ہو جیسے کوئی نئی بات ہے۔ نوجوان لڑکیاں کیا نہیں کرتیں، ہماری بیٹی نے کچھ کر دیا تو کیا ہوا۔"

"اُف، تم تو بیٹی سے زیادہ پاگل ہو۔ اینی ویز میرے ہزار پاؤنڈ گئے ہیں، مجھے کل کے کل لوٹا دو۔"

"دے دوں گی، میڈ اولڈ مین۔ دے دوں گی واپس۔ گریڈی مین (لالچی آدمی)۔" روبیکا نے پیچھا چھڑانے کے لیے حامی بھر لی۔

"نہیں، یہ تم نہیں دو گی، نہ میں تم سے لوں گا۔ یہ ٹمی ہی دے گی۔" راہی صاحب شدید غصے میں تھے۔

"ٹمی...... ٹمی...... آر یو میڈ! ٹمی کہاں سے دے گی۔ وہ کوئی جاب نہیں کرتی، کہاں سے دے گی؟" اب روبیکا کا دماغ بھی گھوم گیا، وہ ٹی وی آف کر کے غصے سے بولی۔

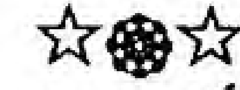
"تو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ کل سے وہ اسٹور پر بیٹھے گی اور وہ ٹائم جو اپنے آوارہ دوستوں کو دیتی ہے، اسٹور کو دے گی۔" دونوں ماں باپ ٹمی کی وجہ سے آپس میں لڑ رہے تھے، وہ بھی ان ہی کی بیٹی تھی اس نے گھر کے برتن توڑنے شروع کر دیے۔ بڑے اچھے قیمتی ڈیکوریشن پیس، دیواروں پر مار مار کر توڑ دیے۔

"ٹمی...... ٹمی...... ڈونٹ ڈو، دس۔" روبیکا نے اسے روکنا چاہا مگر یہ ٹمی تھی جسے غصہ آتا تو نہ ماں دیکھتی نہ باپ کو، کسی چیز کی حیثیت ہی کیا تھی اس کے نزدیک۔

"کروں گی، ضرور کروں گی...... آئی ول ڈسٹرائے...... میں...... میں سب کچھ تباہ کر دوں گی۔ ناؤ کاؤنٹ...... اب کاؤنٹ کرو...... کہ کتنا نقصان ہوا ہے، پھر بتانا خود کو سیل کر کے پے کر دوں گی۔"

ٹمی پاگل ہو چکی تھی اس نے لمحوں میں گھر کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ اپنے بال نوچ لیے تھے، بازو پر دانت کاٹ لیے تھے۔ بچانے کے چکر میں روبیکا بھی زخمی ہو چکی تھی۔ اب تک جو ٹمی نے کیا، راہی صاحب برداشت کر رہے تھے مگر ٹمی کا آخری جملہ خود کو سیل کر کے پے کر دوں گی نے انہیں پاگل کر دیا۔ انہوں نے ٹوٹا ہوا گلاس

اٹھایا اور پاگلوں کی طرح ٹمی کی طرف بڑھے۔
''ٹمی ......آئی ول کل یو۔''



سلیم منزل میں خیر سے منیزہ کا کوئی بہن بھائی آرہا تھا۔ خوب تیاریاں ہو رہی تھیں، حمیدہ خاتون پھر تسبیح تھام کر وظائف پر جت گئی تھیں۔ معمول کی عبادات کے علاوہ نفلی عبادات بھی شروع کر دی تھیں۔ ہر وقت تخت پر بیٹھی تسبیحات پڑھ رہی ہوتیں یا نوافل۔

''یا اللہ اس بار ہمارے سلیم میاں کے آنگن میں چاند چڑھا دیجیے، ہم آپ کے بے حد شکر گزار رہیں گے۔''

وہ بڑی خشوع اور خضوع سے دعا مانگ رہی تھیں' اس بات سے بے خبر تھیں کہ علیم صاحب ان کے تخت کے قریب پڑی اپنی ایزی چیئر پر آبیٹھے تھے اخبار لے کر۔ ایک نظر بیگم پر ڈالی، دعا چونکہ با آواز تھی، وہ چپ سنتے رہے۔ دعا مانگتی حمیدہ خاتون خاصی معصوم سی ماں لگ رہی تھیں، وہ بے ساختہ مسکرائے اور جب انہوں نے دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرا تو انہوں نے با آواز بلند آمین کہا۔

''آمین ......آمین ...... ہماری اللہ کریم سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلیم کو چاند سا بیٹا عطا فرما دے، لیکن ......''

اس ''لیکن'' کا شعلہ حمیدہ خاتون کے اندر تک کو سلگا گیا۔

''اللہ کے واسطے...... اللہ کے واسطے علیم صاحب لیکن کا لفظ استعمال مت کیجیے اب ہم ہر صورت اپنی گود میں اپنا پوتا کھلانا چاہتے ہیں۔'' حمیدہ خاتون نے تسبیح کو چوم کر ایک طرف رکھا اور پنج سورہ اٹھالیا۔

''بھئی جو آپ کی دعا اور خواہش ہے وہی ہماری بھی ہے مگر ہم اللہ کی رضا میں رہنے والے ہیں۔ ہمیں پوتا اور پوتی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔''

''ہاں ہاں، آپ کو اور آپ کے صاحب زادے کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شگفتہ بیگم آپ دونوں کی پسند سے جو آئی ہیں مگر ہمیں فرق پڑتا ہے، ہمیں پوتا ہی چاہیے۔'' حمیدہ خاتون نے کچھ ایسے حتمی انداز میں کہا گویا پوتا یا پوتی پیدا کرنا خود شگفتہ کے اختیار میں ہے۔ ہر چند کہ علیم صاحب کو بیگم کی باتیں احمقانہ لگ رہی تھیں مگر وہ ان کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے محتاط انداز میں مخاطب ہوئے۔ نظر، بیگم کے چہرے اور ہونٹوں پر تھی، ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے، ہاتھوں میں تسبیح پھر آ گئی تھی۔

''دیکھیے حمیدہ خاتون ہماری دعا ہے کہ اس بار اللہ تعالیٰ آپ کی گود میں پوتا ڈال دے، لیکن ......لیکن ......''

لیکن پر پھر بیگم نے شوہر کو تیز نگاہوں سے گھورا، وہ کچھ سنبھلے سلسلہ کلام جاری رکھا ہر چند کہ جو وہ کہنے جا رہے تھے اس کے نتائج اگرچہ مناسب آنے کے امکانات نہیں تھے۔

''اب لیکن کے بعد آپ کچھ ارشاد کریں گے کہ ہماری جان لے کر ٹلیں گے۔'' حمیدہ خاتون نے اپنی چاندی کے کٹورے میں رکھا ہوا پانی پیا۔ نجانے کیوں وہ اتنی خوف زدہ تھیں، دھڑکتے دل کے ساتھ میاں کو دیکھا۔

''بھئی بیگم صاحبہ، دیکھیے ہم فقط یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اللہ کرے آپ کی دعا قبول ہو لیکن اگر اللہ کی رضا سے پھر بیٹی ہو گئی تو کیا کیجیے گا تاکہ ہم حفاظتی اقدامات کر لیں۔''

''آپ کی تو عادت ہے، ہمیشہ ہمیں دہلانے والی باتیں کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس بار پوتا ہوگا، نہ ......نہ ہوا تو ہم زہر پی لیں گے۔''

''کیا......کیا واقعی سچ کہہ رہی ہیں آپ؟''

علیم صاحب بیگم کا موڈ دیکھ کر خوشی سے شرارت میں اچھلے تو حمیدہ خاتون راکھ ہو گئیں۔

''آپ کی تو یہ پیدائشی خواہش ہے کہ دیکھیے کب پوری ہو۔'' حمیدہ خاتون واقعی رنجیدہ ہو گئیں منہ لٹک گیا۔ علیم صاحب اٹھ کر ان کے قریب آکر بیٹھ گئے۔

''ارے بھئی بیگم بڈھے ہو گئے مگر آپ ہمیں سمجھ نہیں سکیں، دیکھیے ناں آپ ہماری عزیز از جان اکلوتی بیگم ہیں، ہم آپ کے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، منہ سے بری بات مت نکالا کیجیے ......او میری زہرہ جبیں تو بھی تک ہے حسیں اور میں جواں ......'' علیم صاحب کی پرانی عادت تھی کہ بیگم ناراض ہو جاتیں تو گانے گنگنا کر منا لیتے اور حمیدہ بیگم اس عمر میں بھی سرخ پڑ جاتیں۔

''بیٹے بھی، کچھ خیال کیجیے گھر میں جوان بیٹا بہو ہے اور ہم دو پوتا پوتی ......ارے ہاں میں کہے دیتی ہوں اگر بیٹا نہ ہوا تو ہم اپنے سلیم میاں کی دوسری شادی کروا دیں گے۔'' شرماتے شرماتے وہ اصل موضوع پر آ گئیں تو علیم صاحب کا عشق بھی ہرن ہو گیا۔ وہ کھنکار کر اٹھے اپنی کرسی پر نیم دراز ہو گئے، موٹے شیشوں والی عینک کو ناک پر بٹھایا۔

''اور اگر دوسری بہو سے بھی بیٹا نہ ہوا تو ......''

''تو ہم تیسری شادی کروائیں گے اپنے ننھے کی۔''

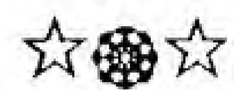
''اور اس سے بھی بیٹا نہ ہوا تو ......کیا کیجیے گا۔''

''کاش آپ ہمارے شوہر نامدار نہ ہوتے، تو ہم آپ کو کہتے اپنی منحوس چونچ بند کیجیے۔ میں پوچھتی ہوں آپ کی ان منحوس پیشن گوئیوں کا مطلب کیا ہے، کیا آپ نہیں چاہتے کہ......''

''ارے بیگم! آپ تو سدا کی پاگل...... مطلب ہم آپ کو پاگل کہہ ڈالتے اگر آپ ہماری بیگم نہ ہوتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو شگفتہ ہی ہمیں پوتے کی نوید سنائیں گی، نہ منظور ہوا تو دس شادیوں کے بعد......''

''کیا...... کیا مطلب ہے، آپ کا کہ ہمارے فرزند کی نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ نوابی خون سلیم میاں تک ہی رہے گا۔''

بس نوابی خون کی دائمی وفات کا صدمہ ہمہ وقت دامن گیر رہتا حمیدہ خاتون کے۔ وہ میاں سے ناراض ہو کر بڑا سا گھونگھٹ نکال کر پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئیں، یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔



''سنبھل کر چلیے، شگفتہ خاتون ابھی گر جاتیں۔'' عصر کی نماز کے بعد حسب عادت سلیم صاحب شگفتہ کو ہاتھ تھامے حویلی کے بڑے سے باغ میں لے آتے جو حویلی کی پہچان تھا کہ اچانک شگفتہ کے پاؤں کے نیچے پتھر آ گیا تو وہ گرتے گرتے بچیں۔

''اور فٹے منہ ہے، سلیم جی اس وٹے کا، جو میرے پیر تھلے آ گیا تھا۔ ویسے ہی میں آج کل بڑی پریشان ہوں۔'' حسین بیگم کے حسین چہرے پر انجانی پریشانی کا سایہ دیکھ کر سلیم صاحب فکر مند نظروں سے ان کو دیکھنے لگے اور پھر ان کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ بیڈ پر تکیے لگا کر بٹھا دیا۔

''جی تو بیگم اب آپ اس ناہنجار پریشانی کا نام بتایے، ہم ابھی اس کا گلا دبا کر سپرد خاک کرتے ہیں۔ بس آپ بولیے اور لاش اٹھایے۔'' سلیم صاحب بیگم کی دل جوئی میں مسکراتے ہوئے بولے تو شگفتہ نے ان کو دیکھا۔

''آپ کی اماں ہوری۔''

''ہائیں، ہماری اماں ہوری۔ مم......مم...... مطلب اماں جان......!'' سلیم میاں بیگم کی محبت میں ادا کیے اپنے ہی جملے کی وجہ سے شرمندہ ہو گئے۔ اب ان کو کیا معلوم تھا کہ شگفتہ کی پریشانی کا نام ''اماں ہوری'' ہے۔

’’یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں شگفتہ! دیکھیے ہماری زبان سے کیسا گستاخانہ کلمہ برآمد ہوگیا، اپنی ہی والدہ کے لیے۔ استغفراللہ۔‘‘ سلیم میاں پشیمانی میں دیوار کی طرف رخ موڑ کر بیٹھ گئے، شگفتہ کو افسوس ہونے لگا۔

’’وہ...... وہ بھی تو ہر ویلے میری گستاخی کرتی ہیں، سلیم جی!‘‘

’’کیا مطلب ہے آپ کا شگفتہ بیگم! وہ بڑی ہیں، گستاخی ان کی ہوئی ہے آپ ان کی بہو ہیں، بیٹی جیسی ہیں۔‘‘

’’آہو، تے ایسے واسطے وہ اپنی بیٹی کا دل مٹھی میں لے کر دباتی رہتی ہیں۔ ہر ویلے طعنے مار مار کے میرا کلیجہ آٹا چھانن والی چھاننی کی طرح چھلنی کرتی رہتی ہیں۔ ان کو تو پوتا چاہیے، کہتی رہتی اگر چے پوتا نہ ہویا تو...... تو......‘‘ شگفتہ تکیہ گود میں رکھ کر سسک پڑیں۔ سلیم میاں محبوب بیگم کے دکھ میں برابر کے شریک ہوگئے۔

’’تو...... تو...... کیا؟‘‘

’’تو یہ کہ وہ دوجی بہولے آئیں گی۔ مطلب آپ کا دوسرا ویاں کریں گی، پوتے کے لیے۔‘‘ اب شگفتہ کی آنکھوں کے بادل دھواں دھار برسنے لگے تھے۔

’’کک...... کک...... کیا، اماں جان نے ایسا کچھ کہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا، وہ...... وہ ایسا کیوں کہیں گی شگفتہ! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہیں۔‘‘ سلیم میاں کو یقین تھا کہ اماں جان نے ایسی بات کی ہوگی مگر چونکہ ان جانے میں وہ کچھ دیر قبل ماں کے لیے ایک جملہ کہہ چکے تھے، دوبارہ اس گناہ کے مرتکب ہونا نہیں چاہتے تھے۔ یقین سے بیگم کے الزام کی صحت سے انکار کردیا تو شگفتہ نے خفا سی نگاہ میاں پر ڈالی اور رخ پھیر کر لیٹ گئیں۔

’’خیراں کے کان ہیں تو بہت موٹے پر کام کی باتیں وہ بڑی باریکی سے سن لیتی ہے، سلیم جی! خیراں کی کنوں سنی بات ہے اور اس بات کی تصدیق اماں ہوراں کی وہ ٹٹی جئی بانسری جیسی جو خاندانی ماسی ہے ناں پھونکنی...... مطلب انگیٹھی کی چمنی اس نے بھی کہا ہے کہ بیگم صاحبہ نے لڑکی بھی دیکھ رکھی ہے آپ کے لیے، اگر پوتا نہ ہوا تو۔‘‘

ابھی سلیم میاں اس بات کی تہ تک پہنچے تھے نہ ہی خود کو تصدیق یا تردید کے قابل سمجھ رہے تھے۔ شام ہی کو، اماں جان نے اپنے چچیرے بھائی کے سپوت اچھے میاں کے ہاں جانے کا اعلان کردیا۔

’’سلیم میاں! ہمارا دل آج کل بہت گھبرا رہا ہے، کچھ دنوں کے لیے ہمیں اچھے میاں کے ہاں چھوڑ دیجیے، ہوسکتا ہے قلب حزیں کو قرار آجائے۔‘‘ سلیم میاں تو حیرت سے بھونچکا رہ گئے تھے، ان کو چمنیا بیگم کی افواہ میں صداقت بیگم صاف نظر آرہی تھیں۔ شگفتہ بیگم ان کا ہاتھ نہ تھام لیتیں تو فرش پر ڈھیر ہوجاتیں۔

’’جی۔‘‘ سلیم میاں تو شگفتہ کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے اتنا ہی کہہ پائے، مگر عصر کی نماز مسجد سے پڑھ کر آتے ہوئے علیم صاحب نے جو یہ خبر سنی تو اس نے ان کا بی پی ہائی کردیا تھا۔ اپنی اوقات سے زیادہ انہوں نے گرج برک ماری۔

’’آپ اچھے میاں کے ہاں نہیں جارہی ہیں بیگم!‘‘ سب نے پلٹ کر ان کو دیکھا، جلال جن کے چہرے پر نمایاں تھا حمیدہ بیگم اپنے دھان پان شوہر کی برک پر قدرے سہم سی گئیں، بیٹے اور بہو نے بھی اس سہمی خاتون کو دیکھا شگفتہ کی زبان پر شگفتہ سی گدگدی ہوئی۔

’’سلیم جی دیکھو...... دیکھو آپ کی اماں، اباجی کی برک سے کیسی سہمی ہوئی ہرنی لگ رہی ہیں۔‘‘

ساری بات تو سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر سہمی ہوئی ہرنی تو سمجھ میں آہی گیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ دبا کر بیگم کو مزید پھلجڑی چھوڑنے سے منع کردیا کیونکہ اباجان جلال میں تھے۔

’’حمیدہ خاتون آپ کا قلب حزیں حالت قرار میں ہو یا حالت بے قراری میں، آپ اچھے میاں کے ہاں

جائیں گی۔ ارے سب مرکھپ کے یہ ہاتھی کی دم کی طرح لٹک کر رہ گئے، وجود حیات سے۔‘‘

اباجان حالت جلال میں اپنی مڑی ہوئی گردن والی چھڑی کو بلاوجہ مسلتے رہے۔ سلیم میاں اپنی بیگم کے سامنے اپنی والدہ کی والد کے ہاتھوں یہ عزت افزائی دیکھ کر شرمندہ سے ہوگئے۔

’’میرا خیال ہے بیگم آپ کو چل کر آرام کرنا چاہیے، چلیے کمرے میں۔‘‘ سلیم میاں نے باقاعدہ شگفتہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا مگر شگفتہ نے کھینچ کر ان کو بھی بٹھالیا۔

’’ہا...... ہائے سلیم جی! آپ وی ناں کمال کرتے ہو۔ ابھی تو ڈرامہ شروع ہوا ہے، سچی مجھے اباہوراں کا یہ سلطان راہی صاحب والا انداز ای پسند آیا ہے۔‘‘ ہر وقت شیرنی کی طرح دھاڑنے والی جناتی سائز ساس کسی سہمی ہرنی کی طرح دبکی ہوئی تھیں، شگفتہ نے یہ سین پہلی بار دیکھا تھا، اسے اچھا لگا اور دوسری طرح حمیدہ خاتون کو بھی بہو کے سامنے شوہر کے ہاتھوں یہ باتیں سن کر بہت برا لگ رہا تھا تب ہی انہوں نے کچھوے کی طرح اندر گھسائی ہوئی گردن باہر نکالی۔

’’لیکن کیوں علیم صاحب! کیوں ہم اچھے میاں کے ہاں نہیں جاسکتے۔‘‘ اس سوال پر علیم صاحب کسی لڑاکا تیتر کی طرح گھومے، بیگم کے قریب آئے، وہ پیچھے ہٹیں۔ سلیم میاں نے آنکھیں بند کرلیں۔

’’کیوں آپ نہیں جانتیں کہ یہ اچھے میاں ہمیں کتنے برے لگتے ہیں۔‘‘

’’ہونہہ، بلاوجہ ہی آپ کو اچھے میاں سے بیر ہے۔‘‘

’’بلاوجہ...... بلاوجہ! ارے حمیدہ خاتون آپ کے یہ اچھے، آپ کے اس برے سے چچیرے کزن بھیا کی اولاد ہیں جو باقاعدہ آپ پر نظر رکھتے تھے۔ گستاخی کی حدیں پھلانگی کہ ہماری اور آپ کی منگنی کے باوجود انہوں نے آپ کے لیے رشتہ بھیج دیا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ بلاوجہ آپ کی عداوت ہے۔‘‘

باتیں تو اور بھی بہت سی تھیں مگر سلیم میاں نے زبردستی شگفتہ کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آگئے۔

☆❁☆

چونکہ شگفتہ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے منیزہ کو باجرہ اور ملک غیاث اپنے ساتھ گاؤں لے آئے تھے۔ ننھی

منیزہ بہت خوش تھی یہاں آ کر وہ گاؤں والی بن جاتی تھی۔ مامی کے ساتھ ساتھ گھومتی، بھینسوں کا چارہ بھی اکبر کے ساتھ مل کر مکس کرتی تو ماموں مامی نہال ہو جاتے۔

''چلو ملک جی سانوں ہن ''نو'' (بہو) تلاش کرنی نہیں پئے گی۔''

''کی مطلب؟'' ملک غیاث نے مٹی کا بڑا سا پیالہ جس میں دودھ تھا جو ابھی ہاجرہ نے لا کر دیا تھا ایک طرف رکھا، بات سمجھ میں نہیں آئی تھی ہاجرہ کی۔

''لو دسو، تسی وی ناں کدی کدی پولے بن جاندے او۔ سامنے تے دیکھو، جوڑی بنا دتی اے رب سوہنے نے۔'' ہاجرا کی نشان دہی پر غیاث نے سامنے بڑے سے صحن پر نظر ڈالی، جہاں بھینسیں بندھی تھیں، اکبر اور منیزہ ملازم کے ساتھ مل کر بھینسوں کا چارا ''کھرلی'' (جانوروں کے کھانے کا برتن) ہاتھوں سے ملا رہے تھے، ساتھ ہی ملازمہ ''کبے'' کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... واقعی جوڑے تے چن سورج دی اے، جے اللہ نوں منظور ہویا اے ساڈا کار (گھر) منیزہ نال سج جائے گا۔'' ملک غیاث خوشی سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''ان شاء اللہ...... ان شاء اللہ...... ملک جی! اللہ ضرور جوڑے بنائے گا، جے دادی من گئی تے۔''

''لے دس، اللہ نوں منظور ہویا تے کِدی مجال انکار دی۔'' اسی دوران منیزہ بھاگتی ہاجرا کے پاس آئی۔

''مامی جی! مامی جی! مینوں اپنا چلا (چولہا) جلانا وی سکھا دو۔''

''ہائے مامی صدقے، میری شہزادی دی زبان تے، پنجابی کنی سوہنی لگ دی اے۔''

''آہو، تینوں سوہنی لگدی اے۔ تے ایدی دادی نوں دل دا دورہ پیندا اے، پنجابی سن کے۔''

''او پین دے او بس میں تے اپنی مینوں نوں دس پڑھا کے ویاہ کے لے آنا، جے آ میری تی۔'' منیزہ مامی کی انگلی پکڑ کر چلی گئی، دوسری جانب حمیدہ خاتون کو پھر پوتی کی آمد کی خبر سنائی گئی تو وہ پچھاڑ کھا گئیں، چمنیا بیگم کے پتنگے لگ گئے۔

''ہائے...... ہم مر جائیں، ہماری دلہن بیگم...... ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا۔ ہماری دلہن بیگم یہ صدمہ کیوں کر برداشت کر پائیں گی...... دلہن بیگم...... دلہن بیگم......''

چمنیا مسلسل ان پر پانی اور اپنے منہ کی پیک کا چھڑکاؤ کر رہی تھیں اور علیم صاحب کو تے آ رہی تھی۔

''چمنیا بیگم! جایئے اپنے منہ کا اگل دان خالی کر کے آیئے۔ اتنے بے شمار خدمت گاروں میں سے ہماری ساس صاحبہ کو یہ لیک کرتا اگل دان ہی ملا تھا ہمیں تحفے میں دینے کے لیے۔ حد ہوتی ہے۔''

''ارے نوشا میاں! آپ بھی نا، ہمیں چھیڑنے سے باز نہیں آتے۔ اب ہماری دلہن کی یہ حالت ہے کہ صدمے سے بے ہوش ہوا چاہتی ہیں اور ہم اپنا اگل دان دھوتے پھریں، ہٹیے دلہن کی ٹانگیں سیدھی کرنے دیجیے۔'' خود تو کیا جاتیں ان کو اٹھایا، اسی دوران حمیدہ خاتون ہڑبڑا کر اٹھیں۔

''ہائے ہائے، ہمیں رات خواب میں پتا چل گیا تھا جب منیرہ خاتون نے اپنی گڑیا، ہماری گود میں اچھال دی تھی۔ ہائے چمنیا رات کے تین بجے تھے، تہجد کا وقت تھا اور یہ خواب تھا کہ پورا ہو گیا۔''

شادی کی تاریخ رکھے جانے پر عابد کو بھی غصہ آیا تھا اپنے چچا کی ہٹ دھرمی پر۔

''اب کیا کرتے میاں! وہ باقاعدہ میری غیرت کو چوٹ لگا بیٹھا تھا، سودے دی ہم نے تاریخ۔ اب اللہ کا نام لو اور تیاری شروع کر دو۔''

''آپ لوگ جو کر رہے ہیں کریں، مجھے کسی کی شادی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ امی جان! مگر آپ ابا اور چچا جان کو بتا دیں کہ میں اس پاگل نفسیاتی مریضہ ثمینہ سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔''

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

میمونہ صدف

امّاں چنّا کا کلمہ

''اماں چناں کیسے کلمہ پڑھ گئی؟'' وہ پک گئی، اُک گئی اور تھک گئی کہ اس کی مختصر سی ازدواجی زندگی کو بس یہ ہی اک جملہ کھا گیا، ناچتے الفاظ اور لرزتی بے بے......

وہ جب سے بیاہ کر سسرال آئی تھی اس نے اتنے کم دنوں میں اٹھتے بیٹھتے بس یہ ہی جملہ بے بے کے منہ سے سنا تھا۔ دس گھنٹوں میں سو بار، سو دنوں میں ہزاروں بار...... بے بے کو جیسے یہ ہی گردان یاد رہی اور باقی سب بھول گیا۔ وہ ژولیدہ ادھر اُدھر دیکھتی تو ایک اس کے سوا سب کان لپیٹے، کام سمیٹتے پائے جاتے۔ اسے لگتا بس ایک وہ ہی فاترالعقل ہو چلی ہے۔ جتنا وہ اس جملے کی عادی ہوئی تھی، اتنا ہی اس سے چڑی بھی تھی، وہ آٹا گوندھتے، جھاڑو لگاتے، سلائی کرتے، برتن مانجھتے، ہنڈیا بھونتے بس اسی جملے کو سنے جاتی اور تپے جاتی۔ باقی سب بہرے بنے اندر باہر ہوتے رہتے، وہ نئی نویلی دلہن مارے لاج کے بھلا کس سے پوچھتی کہ آخر ماجرا ہے کیا؟

فاطمہ ماں جو اس کی ساس اور گھر کی بڑی بہو تھیں، اس سوال پر ایسا بے تاثر چہرہ لیے پھرتیں جیسے تمام احساس ہی مرے پڑے ہوں۔ اس گھر کے سب ہی مکینوں میں سب سے زیادہ بے بے، شکورہ چاچی کے سامنے وہ سوال دہراتیں جو بالی عمر میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تھیں اور اب بچے بیاہنے کو آ گئی تھیں۔ مجال ہے کہ کبھی ان کے چہرے پر اس جملے کو سن سن کوئی ناگوار تاثر ابھرا ہو۔ ایک روز شرماتے، لجاتے، ہمت کرتے شکورہ چاچی سے پوچھ ہی ڈالا۔

''یہ اماں چناں کون ہے؟'' شکورہ چاچی دھونکنی سے مٹی کے چولہے میں پھونکیں مارتی آنکھوں کا پانی صاف کرتے بے نیازی سے بولیں۔

''شہزادی کے ساتھ جہیز میں آئی تھی۔'' بھلا وہ کیا جانے شہزادی کو، اسے تو اماں چناں کو جاننا تھا۔

''تھی کون بھلی مانس......؟''

''بھلی مانس ہی تھی جو بھلائی میں ماری گئی۔'' چاچی بڑے توے کو الٹائے، بڑی بڑی کاغذی روٹیاں ہاتھوں سے کلائیوں تک بیل بیل کر توے پر ڈالے جا رہی تھی۔ وہ منتظر رہی کہ اب چاچی بولی کہ بولی مگر چاچی بس روٹیاں بنا بنا کر سینکتی رہیں۔ اس سے مزید پوچھا نہ گیا، جیسے چاچی سے بتایا نہ گیا۔

☆❀☆

اب بے بے سوال کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ جوڑ کر دہائیاں دیتیں کہ کوئی شہزادی کو بلا بھیجے، جب ان کی حالت مزید خراب ہوگئی اور حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگیں تو ایک روز شہر سے بڑی گاڑی میں بیٹھ کر تبریز چاچا آئے اور ان کے ساتھ آن بان لیے سچ مچ کوئی شہزادی...... وہ ہی شہزادی جس کی ماما تھی اماں چناں، بچپن سے اسے پالنے والی، اس کی ہم جولی، منہ کی کوڑی، دل کی شفاف...... گھر بار تھا نہیں۔ اپنے بچپن میں شہزادی کی ماں کی خدمت گزار بن کر آئی تھی اور اب شہزادی کے ہمراہ اس کے سسرال......

تبریز پڑھی لکھی لڑکی چاہتا تھا اور شہزادی سے رشتہ اسی شرط پر طے ہوا کہ اماں چناں بھی شہزادی کے ہمراہ ہی آئے گی...... گویا جہیز میں اور کچھ آیا نہ آیا، ماما ضرور آئی۔ آتے ہی اس نے ایسے بھاگ بھاگ کر گھر سنبھال لیا کہ پھرکی کی طرح گھومتے سارے کام کر ڈالتی۔ شہزادی کو تو پلنگ پر بٹھا کر شہزادی بنایا ہی تھا لیکن شکورہ اور فاطمہ کو بھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ بے بے، جو گھر کی بڑی تھیں، کو اپنا اقتدار جاتا دکھائی دیا تو اماں چناں آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ انہیں لگتا کہ سب بہوئیں اب ان کے بجائے اماں کو ساس مانتیں، عزت دیتی ہیں اور بیٹے تو یوں بھی اماں کا دم بھرتے تھے۔

سو بے بے نے اماں پر بولنا شروع کیا...... پہلے پہلے کم اور پھر خوب۔

''یہ اماں کیوں ہر کام میں ٹانگ اڑاتی ہے؟''

''مدد کراتی ہوں حفیظاں......'' اماں کام کرے جا رہی ہے، بے بے تپے جا رہی ہیں۔

''تیرے ساتھ آئی ہے شہزادی تو تیرے ساتھ ہی رہے نا...... ہر کسی کے ساتھ کیوں گھستی ہے؟'' وہ شہزادی کو لتاڑتیں۔

''گھر کا ہر فرد شہزادی شہزادہ ہے، پھر کیوں نہ گھسوں ہر کسی کے ساتھ!'' اماں برا منائے بنا کہتی تو شہزادی کا منہ بن جاتا۔ اماں اسے ماں سی عزیز تھی، گودوں میں کھلانے والی کی توہین کہاں برداشت ہوتی پھر......

''ماما ہے تو ماما بنے، مالک کیوں بنتی ہے؟''

''رب مالکوں کو سلامت رکھے جو مجھے مان دیں، میں ماما ہی بھلی۔'' عاجز مزاج، عاجز انداز۔

بے بے بھلا کتنا ہی ٹوکتیں، اس کی فطرت میں کام گندھا ہوا تھا، کام ہوتا دیکھ...... پڑا دیکھ لگ جاتی۔

''کوئی بچہ، گھر بار نہیں ہے تیرا؟''

''اس گھر کے بچے میرے بچے، یہ گھر میرا گھر......'' وہ بے بے کی ٹانگیں دباتی جاتی، جواب دیتی جاتی۔

''کب جائے گی اس گھر سے؟ جان کو آ گئی ہے۔''

''اب تو موت ہی مجھے شہزادی اور اس گھر سے جدا کرے۔'' شہزادی کے بالوں میں تیل لگ رہا ہے اور فاطمہ، شکورہ اپنی باری کے انتظار میں بال بکھرائے بیٹھی ہیں۔

''رب تجھے جلد موت دے۔'' بے بے بڑبڑاتیں۔

☆❀☆

فاطمہ اور شکورہ اپنے اپنے بچے اماں چناں کے حوالے کرتیں، اپنے کمروں میں گھستیں، دوپہر کی نیند کے مزے کرتیں تو کبھی گھر بار اماں کے سپرد کرتیں، میکے سدھار جاتیں۔ اماں سے سلائی کڑھائی کروا رہی ہیں تو کبھی پکوان بنوا رہی ہیں، روئی دھنکوا رہی ہیں تو کبھی اوپلے تھپوا رہی ہیں...... مگر مجال کہ اماں چناں کے ماتھے پر کبھی شکن دیکھی گئی ہو۔ ہنستے ہنستے بہوؤں کے کام سنبھالے، انہیں آرام دیتی، بچوں کو پاس سلاتے کہانیاں سناتی۔

''ایک بچہ اپنے سوتیلے بھائیوں کے ہاتھوں کنویں میں ڈال دیا گیا......

''ایک رب کا بندہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے لے جا رہا تھا کہ اس نے خواب دیکھا تھا......

ایک شخص کے ہاتھوں کوڑھی اور برص زدہ صحت یاب ہو جاتے تھے......'' وہ نجانے کب کہاں کی سنی حکایتیں اپنے انداز سے سناتی۔

''استغفار...... پیغمبروں کی شان میں ایسی گستاخی......'' بے بے کے کانوں کو خبر ہوئی تو اماں پر فتویٰ لگ گیا۔ اماں جو دین، نماز، روزے سے نابلد ایک سادہ، دیہاتی، ان پڑھ عورت تھی، جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا خدمت تھا، کافر، لادین، لامذہب کہلائی جانے لگی۔

''جس عورت کو دین کے نام پر اللہ ہُو کے سوا کچھ آتا نہیں ایسی بے ہدایتے کو گھر رکھ کر بچے لادین کرنے ہیں کیا؟''

اور اماں خاموشی سے کام سمیٹتے اللہ ہُو کرتی جاتی، اب کوئی بچہ کہانیاں سننے نہ بھیجا جاتا۔ بچے اماں کی لوری سنے بنا سونے لگے۔ ان کی مائیں اب میکے جانا چھوڑ چکی تھیں، انہیں اب بہت سے کام ہوتے۔

☆☆☆

پھر وہ دن بھی چڑھا کہ ڈیرے کے بڑے احاطے میں بے بے سینہ کوبی کرتے اک افسانہ طراز عورت کا سا روپ دھارے کھڑی تھیں۔

''مولا قسم، اسی لادین نے چرائی ہیں، میرے سونے کی چوڑیاں...... دو ٹکے کی ماما نے اپنی اوقات دکھا ہی ڈالی۔'' شکورہ، فاطمہ اور شہزادی مورتیاں بنی کھڑی تھیں، گھر کے بیٹے زمین میں کیل کی مانند گڑے تھے اور اماں سگ گزیدہ مٹی پر پڑی تڑپتی تھیں۔

بے بے کے کہنے سے پہلے ہی دوڑ کر سامان سمیٹ لائی، وہیں بیٹھا اور سر پر ہاتھ رکھے قسمیں کھانے لگی۔

''لادین ہی سہی پر چور نہیں ہوں، رب کی بھلے نہ مانوں پر رب کو مانتے ہوں۔''

شہزادی نے آگے بڑھ کر اماں کو گلے لگانا چاہا

لیکن وہ پیچھے ہٹتے آنسو پونچھنے لگی۔

''نہ نہ بٹیا...... بہت ہوا، اب چلوں گی...... خالی ہاتھ ہی نکلوں گی...... مال یہیں پڑا ہے۔ جب عزت نہ رہی تو مال لے جا کر کیا کرنا؟ پر ایک بات کہے دوں حفیظاں کہ گر میں سچی اور تُو جھوٹی ہوئی تو مرتے وقت مجھے کلمہ نصیب ہو اور تُو بنا کلمے مٹی میں جا ملے۔''

اپنے گھونگھٹے کو آگے ڈالے احاطہ پار کر گئی، کہا تھا کہ موت ہی شہزادی اور اس گھر سے جدا کرے تو موت ہی واقع ہوئی پھر......

☆❁☆

بڑا غضب ہوا اور پھر غضب ہی تو ہوا۔ کماد کے کھیت بانجھ ہو گئے کہ بڑی نہر کا پانی سوکھ چلا تھا، زمین بنجر ہوتی گئی۔ بارش کی بوند کو ترس گئے تو مویشی کھڑے کھڑے مرنے لگے۔ گاؤں خالی ہونے لگے کہ مکین نقل مکانی کرنے لگے، اگلی نسلیں پروان چڑھیں اور بے بے کی بوڑھی ہڈیاں قبل از وقت گلنے لگیں۔ شہزادی تو اس روز کے بعد تبریز سمیت شہر جا بسی تھی، اماں چناں کو زمین نگل گئی یا آسمان کوئی نہ جان سکا۔

بے بے بستر سے جا لگیں اور خون تھوکنے پر آ گئیں تو ایک روز ایک رقعہ ان کے نام آیا۔

''اماں چناں آخری وقت کلمہ گو بن گئی حفیظ زہرہ!'' اس ایک سطر میں کیا کیا نہ جتا دیا گیا تھا، سب جان گئے تھے۔ سارے جی خاموش تھے، بس نگاہیں بولتی تھیں اور بے بے چیختی تھیں۔

''وہ چوڑیاں میں نے اپنے ہاتھوں اماں چناں کے سامان میں چھپائی تھیں کہ وہ نکال باہر کر دی جائے۔'' بے بے ہاتھ جوڑتے معافی مانگتے، نم آنکھوں سے شہزادی کو دیکھ کر اقرار جرم کر رہی تھیں جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''وہ تو کلمہ گو بن گئی اور میری قبر تنگ کر گئی۔'' وہ روئے جا رہی تھیں۔ ''لیکن وہ اس کے سامان سے کہاں گئیں یہ نہ سمجھ میں آیا۔''

''اتنا ناپسند تھی اماں! تو کہا ہوتا میں خود اسے چلتا کرتی۔'' شہزادی کے لہجے میں نہ حقارت تھی نہ شکایت۔

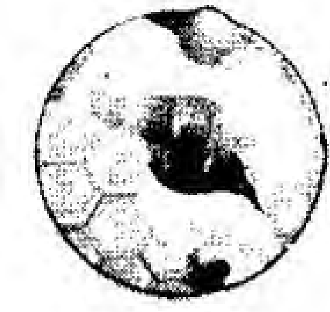
''اس کا بے ضرر وجود مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا اور اب دیکھ خود کا وجود مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ میری دنیا بھی لے گئی اور آخرت بھی......''

''اپنے آخری ایام اماں نے میرے ہاں گزارے، آپ پر رب کی رحمت بھیجا کرتی تھی۔''

''ہائے نی اماں...... کیسی ولی عورت تھی۔ سزا بھی دی اور معاف بھی کر گئی۔'' بے بے اب سر پیٹ رہی تھیں، انہیں سر ہی پیٹنا چاہیے تھا۔

شہزادی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، ہاتھ میں تھامی پوٹلی بے بے کی جانب بڑھائی جس میں وہ چوڑیاں تھیں جو شہزادی نے بے بے کو اماں کے سامان میں چھپاتے دیکھ کر اماں کی عزت بچانے کے لیے پہلے ہی نکال لی تھیں۔

☆☆







صدف عمر

اک نظر چاہیے

مکمل ناول

نواب شاہ سے کراچی تک کا سارا سفر ان دونوں نے بحث وتکرار میں مکمل کیا تھا جب کہ بیلا بے نیازی اور کچھ بے بسی سے انہیں اور راستوں کے مناظروں سے خود کو بہلاتی رہی تھی۔ سارہ گاہے بہ گاہے اسے بھی بحث میں کھینچنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ صرف ہونقوں کی طرح سر ہی ہلا کر رہ جاتی۔ بیدل کو اس بات پر ہنسی بھی آتی رہی اور یہ ہی بات سارہ کو تاؤ دلانے کا باعث بنی تھی۔

"تم سے تو اچھے یہ جگہ جگہ کھڑے کھمبے ہیں، تم تو صرف......" آخر کار سارہ تپ کر بولی تو مجبوراً بیلا کو اس کی ناراضی کے ڈر سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"ناراض مت ہو سارہ! میں کیا کہوں، تمہیں تو پتا ہے نا کہ بیدل سے باتوں میں کوئی جیت نہیں سکتا پھر میں جب بھی اس سے بحث کرنے کی کوشش کرتی ہوں، بول ہی نہیں پاتی۔" اس نے بڑی لجاجت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھی، سارہ نے سوچا اور پھر ہلکے سے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"غلط نہیں کہہ رہی ہو تم، یہ ہے ہی ایک نمبر کا کمینہ۔ پورا ڈرامے باز ہے یہ، ایسے ایسے بے تکے دلائل دیتا ہے کہ اگلا نہ بھی مانے پھر بھی اسے غلط ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔" اس نے ڈرائیو کرتے بیدل کے کندھے پر مکا مارا۔

"اوہ...... ظالم موٹی کہیں کی۔ میری ہڈی ہلا دی تم نے۔" بیدل مصنوعی کراہا تھا اور ساتھ ہی اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی۔

"موٹی......! ارے موٹی ہوگی وہ تمہاری شہلا زادی۔ تمہاری سالی اور تمہارے ہونے والے بچے۔ تمہاری شہلا کے کپڑے دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے تمبو ہو۔"

وہ حسب توقع فوراً لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئی تھی مگر اُدھر کمال کا اطمینان تھا۔

"تو تم کیوں جلتی ہو؟ تمہارے مسٹر رائٹ کو دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے بانس پر ہیٹ ٹانک کر کھیتوں میں کوؤں کو ڈرانے کھڑا کیا ہو۔"

اس بات پر بیلا کو بھی ہنسی آگئی، جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"خبردار بیدل! جو تم نے عبید کا مذاق اڑایا ہو تو...... تم جلتے ہو اس سے، اتنا پرفیکٹ اور اسمارٹ جو ہے وہ۔"

اسمارٹ والی بات پر بیدل کا باآواز بلند قہقہہ سن کر سارہ سیخ پا ہوگئی پھر تو وہ شروع ہی ہوگئی تھی مگر بیدل کی مسکراہٹ جلتی پر تیل کا کام کرتی رہی۔ بیلا بے چاری بیدل کو مسلسل باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی مگر نقار خانے میں توتی کی آواز کون سنتا ہے۔ بڑی مشکلوں سے جا کے سارہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور بیلا نے سکھ کا سانس لیا۔



کراچی پہنچ کر وہ خالہ کے گھر چلے آئے۔ خالہ کے گھر کا پرسکون ماحول اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں آنا اسے ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ آمنہ خالہ سارہ کی رشتے میں سگی خالہ جب کہ اس کی امی کی چچا زاد بہن تھیں۔ کراچی میں شوہر اور بیٹے کے ہمراہ اس بڑے سارے گھر میں رہتی تھیں۔ ہاشم انکل صبح کو آفس اور شام کو گھر آتے۔ بیٹا ان کا اعلا تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تھا۔ سارا دن ان کے گھر پر بلا کی خاموشی رہتی تھی اور اس خاموشی کو توڑنے کے لیے ہی وہ سارہ کو بلاتی رہتی تھیں۔

سارہ نہیں جائے بیلا نے بغیر، یہ تو ناممکن سی بات تھی۔ اس لیے یہاں آنا اور آکر رہنا بیلا کو ہمیشہ سے ہی اچھا لگتا تھا۔ سوئمنگ پول کے کنارے رات گئے تک بیٹھنا، کالونی میں واک کے لیے نکلنا، سارہ کے ساتھ یوں ہی شاپنگ مالز میں گھومنا، اس کی بے تکی باتیں سننا، ہاشم انکل کی لائبریری سے اپنی مرضی کی کتابیں پڑھنا یہ سب اس کے لیے نیا نہ تھا۔

گھر کے ملازمین تک اس کے گرویدہ تھے وہ اپنی سادہ عادات اور ہمدردانہ فطرت کی وجہ سے یہاں بھی کافی مشہور تھی بقول سارہ کے "سارے جہاں کا درد بیلا کے جگر میں ہے۔" چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش ہونے والی، معمولی باتوں پر پریشان

ہو کے رو دینے والی بیلا مزاجاً سارہ سے ذرا ہٹ کر تھی۔ سارہ کو اکثر اس بات پر غصہ بھی آ جاتا تھا کیونکہ وہ بعض دفعہ سادگی میں حماقت کی حد تک چلی جاتی تھی اور پھر اس کا وہ ریکارڈ لگتا کہ الاماں۔

گھر میں اس کی زیادہ دوستی سارہ اور بیدل سے تھی، فہد بھائی دس سال بڑے ہونے کی وجہ سے بہت سنجیدہ سے تھے ان کی اپنی سرگرمیاں تھیں۔ حمید چاچو کے بچوں میں سارہ، احسن اور حسن تھے۔ بیدل اور عادل پھپھو جان کے بچے تھے۔

خاندان میں لے دے کے دو ہی لڑکیاں تھیں سارہ اور بیلا اور دونوں میں دوستی بھی خوب جم کر تھی۔ جب کہ بیدل ان سے سال بھر بڑا تھا مگر چونکہ اس میں زنانہ عادات بقول سارہ کے کافی پائی جاتی تھیں اس لیے وہ ان دونوں کی پکی سہیلی تھا۔

گریجویشن کے بعد سارہ کی شادی قرار پائی تھی، اس لیے وہ دونوں ہی یہ سوچ کر بہت اداس تھیں۔ کمرہ، کپڑے، چاکلیٹ، شاپنگ، اکیڈمی، فنکشن سب وہ دونوں ساتھ ہی مل کر شیئر کرتی تھیں مگر چونکہ عبید کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اس لیے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ کراچی آمد کا ایک مقصد شاپنگ بھی تھا۔ دوسرے خالہ کی کوئی بیٹی بھی نہ تھی، اکلوتی بھانجی ہی ان کو بیٹی کی طرح عزیز تھی سو کچھ عرصہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں سو اس لیے اس بار ان کا قیام ذرا لمبا ہی تھا۔



فریش ہونے کے بعد وہ دونوں ملازمہ کے بلانے پر لابی میں ہی چلی آئیں۔ خالہ ملازمہ سے چائے کا سامان رکھوا رہی تھیں۔ مدہم مدہم چلتی ہوا اس ڈھلتی شام میں جسم کو گدگداتی ہوئی گزر رہی تھی، انہیں دیکھ کر وہ مسکرائیں۔

''آؤ بیٹھو تم لوگ۔'' کرسی سنبھالتے انہوں نے گرم جوشی سے دونوں کو بھی بیٹھنے کو کہا تھا۔

''اتنا کچھ خالہ...... کیوں ڈنر کروانے کا ارادہ نہیں ہے آپ کا۔'' سارہ کے شریر سے انداز پر وہ مسکرائیں۔

''درست کہا تم نے، عبید کا آرڈر ہے کہ تمہیں ڈائٹنگ کرواؤں۔''

جواباً خالہ نے بھی مسکراتے ہوئے اسے تنگ کیا تو وہ بے نیازی سے یہ کہتے ہوئے اپنی پلیٹ سے سینڈوچ اٹھا کر کھانے لگی کہ......

''جیسی ہوں ویسے ہی قبول کرے۔'' بیلا ان کی گفتگو سے بے نیاز لان کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اس دفعہ لان میں کئی خوب صورت تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں جن میں سب سے خوب صورت مصنوعی وادی اور آبشار کا منظر تھا۔

اس کی محویت خالہ کی نرم سی آواز سے ٹوٹی تھی۔ اس نے پلیٹ میں رکھا سینڈوچ اٹھا کر کھانا شروع کر دیا جب کہ سارہ نان اسٹاپ بول اور کھا رہی تھی۔

''بیدل بھی ٹھہر کر ہی چلا جاتا، کتنا روکا میں نے اسے مگر شاید اسے کچھ زیادہ ہی ضروری کام تھا۔'' خالہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

''تایا ابو کو جس شخص سے کام ہے اس نے آج رات ہی دوسرے ملک کو نکل جانا ہے سو بیدل کو ابھی اس سے ملنا ضروری تھا، آ جائے گا کچھ ہی دیر میں۔''

سارہ نے انہیں تسلی دی پھر بیلا کو ٹہوکا دیا تھا۔ ''کہاں گم ہو محترمہ؟'' وہ ہلکے سے چونکی پھر خالہ کو دیکھا۔

''اس دفعہ لان بہت خوب صورتی سے سیٹ کروایا ہے آپ نے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' اتنی دیر سے جائزہ لیتے آخر اس نے بے ساختہ اس نے تعریف کر دی۔ چائے پیتے ہوئے خالہ مسکرائیں۔

''عدی کا کمال ہے سب، یہ ساری تبدیلی اسی نے کروائی ہے۔''

چائے کا سپ لیتے ہوئے بیلا کو اچھو لگ گیا۔

''خیر تو ہے، کیا ہوا؟''

دونوں ایک دم سے فکر مند ہوئیں، اس نے نفی میں سر ہلا کر خود پر قابو پایا اور پھر گلہ آمیز نظروں سے سارہ کو دیکھا جو پھر سے خالہ کو کوئی قصہ سنانے میں مگن ہو گئی تھی۔

''عدی واپس آ گیا ہے اور سارہ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ خواہ مخواہ مجھے بھی ادھر گھسیٹ لائی۔'' بے چینی سے پہلو بدلتے اس نے کچھ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا مگر ادھر فکر کسے تھی۔

عدی اس کے لیے کوئی اتنا بھی اجنبی نہ تھا، بچپن میں ایک آدھ ملاقات کے بعد وہ براہ راست نہ سہی مگر سارہ کی زبانی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔

یو کے میں بزنس کی تعلیم کے ساتھ وہ اپنا ایک بینڈ بھی چلا رہا تھا۔ سوشل میڈیا پر بہت پاپولر تھا، ہینڈسم اور اسمارٹ پلس ذہین بھی تھا۔

لڑکیاں اس پر مرتی تھیں، مغرور بھی تھا۔ اپنی ایک میوزک بینڈ کی ویب سائٹ بھی تھی وغیرہ وغیرہ۔ سارہ کی اس سے خوب چیٹ رہتی تھی، بیدل سے بھی دوستی تھی۔ اس کے ہر کارنامے کی تفصیل سارہ بی بی کو زبانی یاد تھی۔ بیلا کو اس سے کوئی چڑ نہ تھی مگر نا آشنا لوگوں میں وہ آرام دہ محسوس نہیں کرتی تھی، اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا تھا۔ چائے پینا بھی دوبھر ہو گیا تھا، اب اسے بے چینی سے بیدل کا انتظار تھا اس نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔



بیدل کی واپسی رات کو ہوئی تب تک وہ بمشکل خود پر قابو پائے نارمل رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ نہیں تھا کہ عدی سے اسے کوئی چپقلش تھی یا لڑکوں سے اسے کوئی الرجی تھی۔ شروع سے کو ایجوکیشن میں پڑھتی رہی تھی مگر تب بھی وہ اپنی بنائی حدود میں رہتی تھی۔ دوسرے سارہ نے اسے عدی کی اتنی دوستیوں کے قصے سنائے تھے کہ اس کے سامنے اس کا امیج ایک فلرٹی لڑکے کا بن چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کل کو کوئی ایسی ویسی بات ہو اور اس کی ذات اور کردار گرفت میں آ جائے۔

سارہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی، اس کی بے چینی اور ناراضی محسوس کر رہی تھی مگر لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے بتا کر نہیں دیا۔ بیدل جوں ہی آیا سارہ نے اسے بلوا لیا۔

''پوچھو اس سے، کیا ہوا ہے؟ آئی تو ٹھیک ٹھاک تھی مگر اب غبارے جیسا منہ بنا کر رکھا ہے۔''

سارہ کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے، بیدل اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا بیلا! کہیں سارہ نے کاٹ تو نہیں لیا۔'' اس کے شرارتی تشویش بھرے انداز پر سارہ تپ گئی۔

''خبردار جو تم نے یہاں بھی اپنے چیپ جوکس شروع کیے۔ میں نے تمہیں یہاں کامیڈی نائٹ کرنے نہیں بلوایا۔'' اس کے وارننگ بھرے انداز پر بیدل نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''جانتا ہوں مس انجمن کہ آپ کی ایک انگلی مجھے دھول چٹوا سکتی ہے۔ میری یہ مجال کہ گاما پہلوان کی جانشین کو کچھ کہہ سکوں......''

''بیدل...... عقل سے پیدل......'' وہ زور سے چیخی تھی، اس کے موٹاپے پر وہ اکثر چوٹ کرتا رہتا تھا اور یہ ہی بات ان کے درمیان مہابھارت کو جنم دینے کا باعث بنتی تھی۔ بے چاری ہر حربہ کر کے تھک گئی تھی مگر نتیجہ چکی کے وہی تین پاٹ۔ ان کی بحث کے دوران بیلا خاموشی سے ٹکر ٹکر ان کی شکلیں دیکھتی رہی۔

''سور...... سوری...... ہاں تو بیلا! کیا مسئلہ ہے جو آپ ناراض ناراض نظر آ رہی ہیں۔'' اب کے توجہ اصل مدعا کی جانب مرکوز ہوئی تھی۔

''مجھے گھر جانا ہے واپس تمہارے ساتھ۔''

''کیوں؟'' سارہ چیخی۔

''کیوں بیلا! تم تو اس کے ساتھ رہنے آئی تھی نا۔'' حیرت بیدل کو بھی ہوئی تھی، یہاں آ کر رہنا اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔

''بس میری مرضی، مجھے واپس جانا ہے۔'' وہ اصل وجہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

''وہ ہی تو پوچھ رہا ہوں نا کہ کیوں نہیں رہنا ادھر۔''

''وہ...... وہ مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔'' اس کے پھسپھسے بہانے پر دونوں گہری نظروں سے اسے

دیکھنے لگے۔

''ہاں نا بے چاری بچی! کنڈرگارٹن میں پڑھتی ہے۔ ماما پاپا کے بغیر رہ نہیں سکتی، بے وقوف سمجھتی ہو ہمیں، اصل وجہ بتاؤ۔'' سارہ کو ایک فیصد اس کے بہانے پر یقین نہیں آیا اور وجہ وہ اگر اس نے بتادی تو دونوں اس کی ''وجہ'' نہیں مانیں گے۔

''تم یقین مت کرو، مگر مجھے گھر یاد آنے لگا ہے۔ پلیز بیدل! مجھے اپنے ساتھ لے چلو نا۔'' اس کے منت بھرے لہجے پر بیدل کچھ سوچنے لگا۔

''واپسی پر تو میرے ساتھ اللہ ڈنو اور شاکر ہوں گے۔ پاپا نے ہی اللہ ڈنو کو بلوایا ہے۔'' اس نے وضاحت دی۔

''میں ان دونوں کی موجودگی میں تمہیں ساتھ لے جا تو نہیں سکتا مگر......''

''اگر مگر چھوڑو بیدل! عقل سے پیدل...... وہ جو کہے گی تم مانو گے۔'' سارہ نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ ''محترمہ آئی تو ٹھیک ٹھاک تھیں اچانک ایسا کیا ہوا کہ...... اوہ کہیں اس کوچ کی وجہ عدی تو نہیں......'' سوچتے سوچتے سارہ ایک دم چونکی اور اس کے اس قدر درست اندازے پر وہ گھبرا گئی۔

''ہونا ہو یہ ہی وجہ ہے، جب سے خالہ نے عدی کی واپسی کا بتایا ہے تب سے ہی محترمہ کو ایک دم سے چپ لگ گئی ہے۔ ہے نا، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' وہ تصدیق چاہ رہی تھی اور ان دونوں کی کھوجتی نگاہوں سے وہ خود کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔ دونوں کو لمحہ لگا تھا اصل وجہ سمجھنے میں بس پھر کیا تھا۔

''ہائے......'' بیدل کی لمبی سی ہائے سن کر وہ سمجھ گئی کہ اب اس کا ریکارڈ لگنا تھا۔

''عدی کی وجہ سے واپس جا رہی ہو تم، بھئی تم نے کون سا اس کا کوئی ادھار دینا ہے جو اس سے چھپ رہی ہو۔ بچپن میں تو اس کے ساتھ گڑیا گڑیا کھیلتی تھیں اب اس قدر شرم......''

بیدل کی لن ترانی پر اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

''میں کب گڑیا گڑیا کھیلتی تھی اس کے ساتھ؟''

''اچھا...... چلو لکن میٹی تو خوب ہی کھیلا تھا نا تم نے۔''

''نہیں......'' اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر اس نے پھر سے بیان بدلا۔

''اچھا تو پکڑم پکڑائی...... رسی پھلانگ...... چور سپاہی...... پٹھو گرم...... کبڈی کبڈی...... گھر گھر......''

''بیدل......'' اس کی برداشت جواب دے گئی، اوپر سے سارہ کی کھی کھی۔ وہ جان بوجھ کر اسے زچ کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تو دونوں کو احساس ہوا، سارہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''ارے چلو مٹی ڈالو جو بھی کھیلا ہو تم نے، مگر فرار کی وجہ اتنی بھونڈی ہو گی میں نہیں جانتا تھا۔'' بیدل نے بڑے ہی افسوس سے سر ہلایا تھا، بیلا اب جانے کی بات کر کے پچھتا رہی تھی۔

''بیلا اس بات پر تم جا رہی ہو پاگل لڑکی! جلد ہی میری شادی ہونے والی ہے۔ میں تم سے جدا ہو جاؤں گی، میں تو اس لیے ہی تمہارے ساتھ آئی ہوں کہ خوب مزے کریں گے، گھومیں گے تاکہ یہ یادگار لمحے ہمیشہ میری یاد دل میں محفوظ رہیں۔'' سارہ ایک دم جذباتی ہو کر اس کے گلے لگ گئی، اتنی دیر سے خود پر قابو پاتی بیلا بھی رونے لگی۔

''ارے ارے...... یہ دریائے نیل کیوں بہا رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ چار آدمیوں کا کھانا اور سونے کی جگہ تمہیں ملے گی اور تمہاری اس سڑیل تیلی جیسی صحت پر بھی اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔'' بیدل کے تسلی در پردہ تیلی پر سارہ مزید جذباتی ہو گئی۔

''ہاں رکھو میرے کھانے پر نظر، جب چلی جاؤں گی نا تو کھا لینا تم میرے حصے کا بھی۔ پھر بلاؤ گے تو بھی نہیں آؤں گی۔'' سارہ کے رونے پر بیدل ذرا ہڑبڑا گیا۔

''لو یک نہ شد دو شد۔ خدا کے لیے یار! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اب اپنا یہ نلکا بند کرو، ورنہ میں بہہ جاؤں گا پھر بے چاری شہلا زادی تو مجھے ڈھونڈتی ہی رہ جائے گی۔'' وہ اب بھی چڑانے سے باز نہ آیا تھا۔

''کمینہ۔'' سارہ نے رونا بھول بھال کر اس پر مکوں کی برسات کر دی، وہ بلبلاتا فریاد کرتا مدد کو پکارتا رہا۔ بیلا ہمیشہ کی طرح بے بسی سے انہیں دیکھتی رہ گئی، اس کا مسئلہ ویسا ہی لٹکا رہ گیا...... آہ۔



صبح ناشتے کی میز پر بیدل نظر نہیں آیا پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ تو کب کا باہر جا چکا ہے۔ ہاشم انکل بھی آفس جا چکے تھے۔

''ہاں کہہ رہا تھا کہ اسے یہاں بہت سے کام نپٹانے ہیں، تایا ابو نے بھی کچھ کام کے سلسلے میں اللہ ڈنو کو بلوایا ہے۔'' سارہ، خالہ کو بتانے لگی۔

''اور یہ بے وفا عدی کہاں ہے، اتنا نہ ہوا کہ آ کر جلد ہی پرائی ہو جانے والی کزن سے مل لیتا۔'' سارہ نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔ عدی سے اس کی خوب چیٹ چیٹ رہتی تھی۔

''رات کو دیر سے سویا تھا، پوچھ رہا تھا تمہارا، میں نے کہا اب تک تو سو چکی ہو گی، صبح مل لے تم سے۔'' بتاتے ہوئے آملیٹ کی پلیٹ انہوں نے بیلا کی طرف بڑھائی۔

''لو بیلا! پھولن نے تمہاری پسند کا خاص کر بنایا ہے۔''

''شکریہ خالہ!'' اس نے پلیٹ ان کے ہاتھوں سے لی مگر خود پر پڑیں ان کی گہری نظروں سے وہ بہت کنفیوژ ہو رہی تھی۔

''ویسے بیلا کل سے بہت خاموش ہے، کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹا۔'' اس کی خاموشی انہوں نے بھی محسوس کر لی تھی، ان کی غلافی براؤن آنکھیں اسے اپنا ایکسرے کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں خالہ جان! بس ذرا سفر کی تھکاوٹ ہے تو اس لیے۔'' بروقت بہانہ سوجھ ہی گیا۔ سارہ نے اسے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ دبائی، بیلا کو غصہ سا آ گیا۔

''ہاں یہ تو ہے، سفر بہت تھکا دیتے ہیں۔''

وہ اب اپنی آرگنائزیشن کے ان ٹورز کے بارے میں بتانے لگیں جو اندرون سندھ ارینج کیے گئے تھے۔ اس نے شکر ادا کیا کہ انہوں نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد خالہ اور سارہ گھر کا سودا سلف لینے چلی گئیں۔ اسے بھی انہوں نے بہت کہا مگر وہ دل میں چونکہ سارہ سے ناراض تھی، اس لیے معذرت کر لی۔ ان کے جانے کے بعد وہ لان میں آ گئی۔

مالی چچا پودوں کو پانی دے رہے تھے وہ ادھر ادھر گھومتی ان سے باتیں کرتی، لان کی خوب صورتی محسوس کرتی رہی۔ سوئمنگ پول کے کنارے کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ اندر کچن میں چلی آئی۔ پھولن ماسی کچن میں موجود نہیں تھی، وہ باہر صحن میں تھی جہاں اس کی بہو صفائی کر رہی تھی۔ اس نے سنک پہ موجود برتنوں کے ڈھیر سے گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ جب ہی کوئی مگن سے انداز میں اندر آیا تھا۔

''پھولن ماسی! ناشتا بنا دو۔'' وہ اپنے دھیان میں تھی، ایک دم سے اچھلی تو تڑ تڑ کتنے سارے برتن آ کر اس کے قدموں میں شہید ہو گئے تھے۔ بدحواسی وہ آنے والے کی طرف پلٹی تھی جو حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

آنے والا یقیناً عدی تھا، بلیک ٹراؤزر اور گرے شرٹ میں بکھرے بالوں سمیت وہ یقیناً ابھی سو کر اٹھا تھا۔ وہ ایک دم جھکی تاکہ برتنوں کو ایک طرف کر سکے مگر اس کا سر زور سے شیلف سے ٹکرا گیا۔

''اوہ......'' بے اختیار اس نے ماتھا پکڑ لیا۔ آنکھوں سے حیرت اب غائب تھی، بڑے اطمینان سے مسکراہٹ دبائے اس کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

''آرام سے...... ریلیکس، چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔'' وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔

درد اور شرمندگی سے اس کا برا حال ہو گیا تھا، وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا تھا۔ اس کے قریب

پیچ کراس نے اس کے ماتھے اور سر کا جائزہ لیا۔ بیلا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''بیلا......! یقیناً تم بیلا ہی ہو۔'' اس کے ری ایکشن پر وہ میز کی طرف آ گیا، کرسی کھینچ کر بیٹھتے اس نے بڑے آرام سے اندازہ لگالیا۔

''آرام سے، ڈرو نہیں۔ میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں، ریلیکس۔'' اس کی گھبرائی شکل اور خفت سے لال پڑتے چہرے کو دیکھا تو بڑے مسکراتے ہوئے لہجے میں تسلی دی گئی۔ بیلا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چٹکی بجائے اور غائب ہوجائے ''یقیناً مجھ پر ہی ہنس رہا ہے۔''

''سارہ سے بہت کچھ سن رکھا ہے تمہارے بارے میں، کیسی ہو؟''

''ہاں یہ سن رکھا ہوگا کہ ایک نمبر کی بے وقوف اور گدھی ہے۔'' دل ہی دل میں خود کو کوستی وہ یوں ہی بُت بنی کھڑی تھی۔

''ہیلو میڈم! آپ سے مخاطب ہوں۔'' ہلکی سی میز بجائی گئی' اسے چند لمحے تو کچھ سجھائی نہ دیا پھر ایک دم سے سلام جھاڑ دیا۔

''السلام علیکم!'' اس کے سلام پر عدی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری تھی جو اس نے دبالی اور سامنے کھڑی اس کنفیوژ سی لڑکی کو دیکھا۔ سارہ نے اس کے بارے میں صحیح کہا تھا، اس نے سوچا۔

''وعلیکم...... جیتی رہو، پھلو پھولو۔'' اس کی مسکراتی آواز اور نظریں ایک لمحے کو تو بیلا کا دل چاہا وہ اپنا سر پھاڑ لے مگر اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ ماسی اندر آ رہی تھی، دونوں کا زوردار ٹکراؤ ہوا تھا کہ دن میں تارے نظر آ گئے۔ وہ اپنی چوٹ اور ماسی کی ''اللہ خیر'' کو نظر انداز کرکے نکلتی چلی گئی کیونکہ پیچھے موجود شخص اب کھل کر ہنس رہا تھا۔

کمرے میں آ کر اسے خود پر غصہ آ رہا تھا، اچھا تھا جو وہ بھی ان کے ساتھ چلی جاتی۔ کم از کم اتنا بڑا ٹکراؤ تو نہ ہوتا عدی سے۔



خالہ، سارہ اور بیدل کی واپسی آگے پیچھے ہوئی تھی۔ ان کی آمد کی اطلاع پا کر وہ باہر لاؤنج میں چلی آئی۔ ابھی کچھ بول بھی نہ پائی تھی کہ دیکھا سامنے سے وہ صاف ستھرا خوشبوؤں میں بسا یقیناً نہا کر آ رہا تھا۔ گیلے بال بڑے سلیقے سے بنے ہوئے تھے، بیلا کی سٹی گم ہوئی۔ بے اختیار اس کے ہاتھ اپنے ماتھے پر چلا گیا جہاں لگی چوٹ اب بھی درد کر رہی تھی، وہ اسے دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔

''ہائے مام، ہیلو ایوری باڈی۔'' اس کی فریش آواز پر خالہ نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تھا۔

''اٹھ گئے تم، ناشتا کرلیا۔'' ان کی فکرمندی پر وہ بیدل سے گلے ملتے ہوئے مسکرایا تھا۔

''جی مام! نہ صرف ناشتا کیا بلکہ پورا تھیٹر ڈرامہ بھی دیکھا ساتھ میں۔'' صوفہ پر بیدل کے قریب بیٹھتے اس کا اشارہ کس طرف تھا، بیلا مارے شرم و خفت کے سرخ پڑ گئی۔

''کیا مطلب؟'' کوئی نہیں سمجھا تھا، اس نے سمجھانا ضرور بھی نہ سمجھا اور سارہ کی طرف متوجہ ہوگیا جو سخت ناراض، لڑنے پر آمادہ تھی۔

''بے وفا کزن! یوں تو بڑے، سارہ میری دوست، میری بہن کرتے رہتے ہو مگر اتنا نہ ہوا کہ کب سے تم پاکستان آئے ہوئے ہو ملنے ہی آجاتے نواب شاہ۔''

''بے صبری لڑکی! بریک تو لو، اگر مجھے پتا ہوتا کہ نواب شاہ میں اتنے انٹرسٹنگ لوگ ملتے ہیں تو سیدھا وہیں لینڈ کرتا۔'' اس کی مسکراہٹ بیلا کی طرف نظر ڈالتے کچھ گہری ہوگئی۔

''چلو اب تو پتا چل گیا نا، اب کب آؤ گے؟'' بیدل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''جلد ہی ان شاء اللہ۔''

''تم لوگ باتیں کرو میں ذرا کچن کا چکر لگا کر آتی ہوں۔''

خالہ اٹھ کر چلی گئیں، بیلا کا بھی دل چاہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ ابھی وہ اٹھ بھی نہ پائی تھی کہ

سارہ کے متوجہ کرنے پر چونک گئی۔

''کہاں گم ہو، عدی تم سے تعارف چاہ رہا ہے۔ عدی! یہ میری کزن، میری سویٹ سی بہن اور بیسٹ فرینڈ بیلا ہے۔ تمہیں میں نے اس کے بارے میں بتایا تو تھا۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔'' عدی یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے ابھی یہ پہلی ملاقات ہو۔ بیلا بس خاموش ہی رہی۔

''انہیں کیا کوئی پرابلم ہے، کم سنائی دینے کا۔''

بیلا کا دل اس کا منہ نوچ لینے کو چاہا۔

''نہیں، آئرن ڈیفیشنسی (خون کی کمی)۔''

بیدل کے جواب پر وہ کھل کر ہنسا تھا اس کے خفت سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر سارہ نے تنبیہی انداز میں بیدل کو گھورا اور اسے ساتھ لگالیا۔

''خبردار بیدل! جو فضول میں کچھ کہا تو...... بیلا تمہاری طرح نہیں ہے کہ ہر وقت اوٹ پٹانگ بولتی رہے۔''

''میں تو مذاق کر رہا تھا، بیلا تو ہمارے خاندان کی سب سے ذہین و فطین اور عقل مند لڑکی ہے۔''

اب کے بیدل نے انتہائی سنجیدگی سے عدی کو یقین دلایا تھا مگر اس کا انداز اتنا مضحکہ خیز تھا۔ عدی کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

''آئی سی...... تم سناؤ تمہارا کام ہوگیا؟'' ایک نظر اس کے چہرے کی بے چارگی کو دیکھ کر دانستہ موضوع بدل دیا۔

''کہاں، کوئی ایک کام ہو تو جان چھوٹے۔ بیسیوں کام نپٹانے ہیں، تم نے اپنے دوست کا ریفرنس دیا تھا نا، آج شام کو جاؤں گا اس کی طرف۔'' وہ دونوں اپنی باتوں میں مصروف ہوگئے تو سارہ بھی راستے میں پیش آنے والے دلچسپ واقعات اسے سنانے لگی۔ بیلا بے دلی سے سنتی رہی، سارہ نے بھی یہ بات محسوس کرلی تھی۔



بیدل دو چار دنوں میں اپنے کام نپٹا کر چلا گیا، ،، چاہ کر بھی واپس جانے کی بات دوبارہ نہ کرسکی۔

اس دوران وہ دونوں خالہ کے ساتھ بازار کا ایک چکر بھی لگا آئی تھیں' سارہ کی سنگت میں وہ بہل گئی۔

اسے بہت مزا آیا تھا، خالہ بھی بہت خوش مزاج و زندہ دل تھیں سو سونے پر سہاگا ہوگیا۔ ہاشم انکل سے روز سارہ کی حالات حاضرہ بھی بحث ہوتی تھی۔ عدی سے البتہ اس کا سامنا کم ہی ہوا تھا، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا، سو اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

معمول کی طرح وہ اور سارہ رات کھانے کے بعد سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

''بیلا! عبید کی فرمائش ہے کہ میں ولیمے پر ساڑھی باندھوں وہ بھی ریڈ کلر کی۔ تمہیں تو پتا ہے نا کہ اسے ریڈ کلر کتنا پسند ہے۔'' وہ پریشان تھی اپنے موٹاپے کی وجہ سے۔

''ہاں تو پہن لینا نا، اس میں کون سی بڑی بات ہے۔'' اس کی پریشانی سمجھے بغیر وہ عبید کی حمایت کرگئی۔

''پاگل ہو تم بھی، میرا وزن دیکھو ذرا۔ کتنی تو موٹی ہوں، پوری ہتھنی لگوں گی میں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ بیلا نے اس کی روتی شکل دیکھی تو تسلی دی۔

''خیر اب اتنی بھی موٹی نہیں ہو تم، لمبے قد کی ہو تم، اچھی لگے گی تم پر۔ دوسرے میں نے تم سے زیادہ موٹی لڑکیوں کو ساڑھی باندھے دیکھا ہے۔''

''کہاں دیکھا ہے؟''

''وہ فلم...... اس میں ہیروئن کتنی موٹی تھی اور ساڑھی پہن کر مزے سے ڈانس کر رہی تھی۔'' اس کے تجسس پر بیلا کا جواب سن کر پانی پھر گیا۔

''بیلا...... بیلا...... فلموں میں تو یہ سب کچھ چلتا ہے مگر حقیقت میں سب میرا مذاق اڑائیں گے اور سب سے آگے ہوگا بیدل۔'' وہ اب بھی مایوس تھی۔

''کوئی نہیں اڑاتا مذاق، تم کسی سے کم ہو کیا۔ اتنی خوب صورت، اتنی پیاری۔'' بیلا کی محبت اس کے لیے بے لوث تھی، سارہ مسکرائی۔

''وہ تو میں تمہیں لگتی ہوں ناں، خیر چھوڑو۔ عبید کو منع کر دیتی ہوں، کوئی ضرورت نہیں اس شوشے کی۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''عبید بھائی خفا ہو گئے تو؟'' وہ ذرا گھبرائی۔

''نہیں ہوتا۔'' اس کے بے پروا لہجے پر اسے ایک نئی فکر نے آ گھیرا۔

''پھر بھی...... اگر انہوں نے شادی کے بعد اس بات کو لے کر تمہیں تنگ کیا یا تم سے انتقام لیا تو......'' اس بے وقوفی بھری بات پر سارہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''ڈونٹ وری، ابھی بات کرتی ہوں اس سے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تا کہ اندر کمرے سے اپنا موبائل فون لا سکے جیسے ہی وہ مڑی تو نظر کچھ فاصلے پر کھڑے عدی پر پڑی، جو نجانے کب سے کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا اور یقیناً انجوائے کر رہا تھا، سارہ چیخی۔

''عدی...... کمینے...... تم کب آئے لاہور سے۔'' اس کے چیخنے اور عدی کے نام پر وہ ایک دم سے پیچھے مڑی تھی اور سوئمنگ پول میں گرتے گرتے بچی۔ سارہ اس کی طرف لپکی تھی۔

''آرام سے بیلا...... اگر گر جاتیں تو، تیرنا بھی نہیں آتا تمہیں اور نہ مجھے۔'' اس کی خوف زدہ اور بدحواس شخصیت عدی کے لیے نئی بات نہ تھی۔ ہونٹوں کے کونوں میں مسکراہٹ دبائے اس نے سارہ کو دیکھا۔

''تو کیا ہوا؟ فلموں میں ایسے موقعوں پر ہیرو آ جاتے ہیں بچانے۔'' یقیناً وہ ان کی باتیں سن چکا تھا، بیلا شرمندہ سی ہو گئی۔

حقیقت میں یہاں کون سا ہیرو ہے؟'' سارہ نے کندھے اچکائے۔

''ڈیئر کزن! شاید تمہاری قریب کی نظر کمزور ہے غالباً۔'' اس کے جواب پر سارہ ہنس پڑی۔ بیلا نے اس کی خودستائی پر اسے غور سے دیکھا جو کافی کا مگ تھامے بے فکری سے کھڑا تھا۔

''رہنے دو تم، تمہیں تو دیکھ کر ہی اس کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ نجانے کون سا آسیب نظر آتا ہے تم میں۔'' سارہ کی اس لن ترانی پر بیلا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارہ کے منہ پر ٹیپ لگا دے۔

''یہ تو اب اسے معلوم ہوگا، ویسے ڈیئر کزن! اتنے ڈیشنگ بندے کو آسیب کہتے ہوئے تمہیں ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔'' اپنے لائٹ براؤن ہلکے گھنگھریالے بالوں میں ہاتھ پھیرتے اس نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

''میں نہیں کہہ رہی، مجھے تو تم ٹام کروز کے چھوٹے بھائی لگتے ہو۔'' سارہ کی تعریف پر وہ ذرا سا جھک کر مسکرایا۔ بیلا نے اس کے لمبے سراپے کو دیکھا۔ یوں ہی بے دھیانی سے اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ٹام کروز تو ٹھگنا ہے یہ تو بہت لمبے ہیں۔''

''تھینکس فار دی کمپلیمنٹ۔'' اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور بیلا پر منوں پانی پڑ گیا، سارہ بھی تائید کرنے لگی تھی۔

''بہت پریشان لگ رہی ہو اپنی ٹینشن؟'' عدی اب مکمل طور پر اسے نظر انداز کر کے سارہ سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں عدی! سخت مشکل میں ہوں، عبید......''

''سن چکا ہوں میں، تو پہن لینا ساڑھی، اس میں کیا حرج ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ہاں تا کہ بعد میں تم بھی مجھے ہتھنی ہتھنی کہہ کر پکارو۔'' اس کے خفگی بھرے انداز پر وہ ہنس پڑا۔

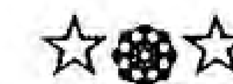
''تم لمبی ہو تم پر جچے گی، بیلا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ تم سے موٹی عورتیں ساڑھیاں پہنتی ہیں، فلموں میں۔''

فلموں پر خاصا زور دیا گیا تھا، بیلا نے ایک خفگی بھری نظر اس پر ڈالی جو بہت بے نیازی سے اسے نظر انداز کیے کھڑا تھا پھر اندر کی جانب جانے کے لیے وہ اٹھی، سارہ اس کے پیچھے لپکی۔

''بیلا رکو تو...... عبید سے بات نہیں کرنی کیا۔''

''اندر کر لیں گے۔'' وہ رکی نہیں۔

''سچ کہہ رہی تھیں تم، میں اسے آسیب لگتا ہوں۔'' اپنے پیچھے آتی عدی کی آواز پر اس کے قدم مزید تیز ہو گئے۔



اگلے دن عبید کے حکم پر وہ بڑی شرافت سے ساڑھی کے لیے مان گئی۔ دونوں خالہ کے ساتھ شاپنگ کرنے چلی گئیں مگر آدھی شاپنگ کے بعد ہی اس کے سر میں سخت درد شروع ہو گیا تھا۔ ڈرائیور اسے واپس چھوڑ کر پھر چلا گیا۔

گھر میں خاموشی تھی، پھولن بھی شاید اپنے کوارٹر میں تھی، چائے کی طلب اسے کچن میں لے آئی تھی۔ چائے بناتے ہوئے اسے کسی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی، وہ رک کر سننے کی کوشش کرنے لگی، آیا یہ اس کا وہم تھا یا نہیں مگر آواز کچن کے پچھلے لان سے آ رہی تھی۔ وہ دروازے کے پاس گئی مگر دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی۔

''تم میرے ساتھ یہ کیسے کر سکتے ہو، میں نے تمہارے انتظار میں صحراؤں جیسے دن اور صدیوں پر محیط راتیں کاٹی ہیں۔ صرف اس آس پر کہ تم ہر مشکل کو سر کرتے مجھے اس جدائی کی قید سے رہا کروا دو گے۔ میں نے دنیا کی مخالفتوں کو اپنے ان کمزور ہاتھوں سے روکا اور تم......'' ہچکیوں کی آوازیں، بیلا کے ساکت وجود میں کرنٹ دوڑا گئیں۔ چولہے پر موجود چائے ابل ابل کر سوکھ چکی تھی۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کیا، نجانے وہ کون تھی اور کیوں رو رہی تھی۔ سدا کی نرم دل بیلا بے چین ہونے لگی تھی، جب ایک جانی پہچانی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''میں نے بھی تو زمانے کی سختیاں اور ہجر کی تلخیاں کاٹی ہیں۔ میں بھی تو مجبور ہو گیا ہوں بلکہ کر دیا گیا ہوں۔'' عدی کی آواز سن کر بیلا چونکی، اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، پچھلے لان میں وہ دونوں اسے مکمل طور پر دکھائی تو نہیں دے رہے تھے مگر لڑکی کے لمبے سلکی بالوں والی پشت اسے نظر آ رہی تھی۔

''مجبور تو وہ ہمیشہ عورتیں ہوتی ہیں، تم مرد ہو کر حالات سے کمزور کیسے پڑ گئے؟'' تلخ آواز۔

''وقت کسی کو بھی مجبور و بے بس کر سکتا ہے، میرے حالات تم سے کوئی چھپے ہوئے تو نہیں ہیں۔ سب جانتی ہو تم، میری ہم راز ہو پھر تم کیوں سوال پوچھنے آئی ہو؟'' شدت سے کانپتا لہجہ بیلا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ نجانے وہ کون تھی، ان کے درمیان کیا مجبوری آ گئی تھی۔

''پھر تم بتاؤ کیا کروں میں؟ کیسے خود کو بہلاؤں؟ آج بھی اس آس پر آئی ہوں کہ شاید خوشی کا کوئی اڑتا جگنو تم میری خالی ہتھیلی پر رکھ دو۔ پلیز، مجھے تھوڑی دیر کو اس خوش فہمی میں رہنے دو کہ تم صرف میرے ہو، پلیز......!'' التجا آمیز لہجہ سن کر۔ چند لمحوں کو خاموشی چھا گئی، پھر کچھ بھنبھناہٹیں ہوئی جو اسے سمجھ میں نہیں آئیں۔

''ویل...... بہت اچھے، چائے پیو گی۔'' یہ واضح و صاف آواز عدی کی تھی۔ بیلا چونکی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی تا کہ کمرے میں جا سکے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عدی اسے یہاں دیکھ لے اور جان جائے کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے۔ کچن سے نکلتے ہوئے اس نے بیک ڈور کھلنے کی آواز سن لی تھی۔ کمرے میں آتے آتے اس کا سر درد مزید بڑھ چکا تھا۔

اب تک اس کے ذہن میں عدی کا امیج ایک فلرٹی لڑکے کا تھا مگر اب وہ جان چکی تھی کہ وہ ایک محبت بھرا دل رکھنے والا حساس انسان ہے۔ بستر پر بیٹھ کر وہ کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعہ کو سوچنے لگی۔ بظاہر خوش باش نظر آنے والا عدی اندر سے کتنا ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ لڑکی یقیناً اس کی محبت تھی۔ پرانی محبت، مگر اب کسی مجبوری کی وجہ سے انہیں جدا ہونا پڑ رہا تھا۔

''مجبوری کیا ہو سکتی ہے؟'' بیلا سوچنے لگی خالہ؟ نہیں وہ تو عدی سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ اس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتیں پھر کیا انکل؟ وہ تو بڑے دھیمے لہجے اور محبت کرنے والے انسان ہیں پھر کیا لڑکی کے ماں باپ مگر اس کی باتوں سے تو لگ رہا تھا کہ مجبوری عدی کو ہے، پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ سوچے گی مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا، آخر تھک ہار کر وہ لیٹ گئی مگر اب اس کی رائے عدی کے لیے یکسر بدل چکی تھی۔

سارہ کے گھر آنے پر لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اس سے یہ شیئر نہ کر سکی۔

''کسی کا پردہ رکھنا اچھی بات ہے۔'' اور وہ یہ پردہ چاک نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جانے انجانے میں

ان کے راز کی امین بن گئی تھی۔

رات تک اس کا سر درد بہتر ہو گیا، گھر والوں سے بات کر کے اس کا دل اداس ہو گیا۔ سدرہ کا رہنے کا پلان مزید کچھ دن بڑھ گیا تھا۔ خالہ بھی بہت اصرار کر رہی تھیں۔ رات کھانے کے بعد سارہ عبید کا فون سننے ٹیرس پر چلی گئی، وہ لان میں ٹہلتے ہوئے رات کی خاموشی کا مزا لینے لگی۔ دھیمی دھیمی چلتی ہوا کے ساتھ لان میں لگی مصنوعی آبشار رات کا فسوں بڑھا رہی تھی۔ آبشار میں جلتی بجھتی روشنیوں کو محویت سے تکتے وہ انیکسی کی طرف سے آتی گٹار کی خوب صورت دھن سنتے چونک گئی۔

اعتبار بھی آ ہی جائے گا۔ کی دھن گٹار پر بہت خوب صورتی سے بج رہی تھی، وہ بے اختیار انیکسی کی جانب کھنچی چلی گئی۔ عدی سیڑھیوں پر بیٹھا آنکھیں بند کیے بہت مگن سے انداز میں گٹار بجا رہا تھا۔ حسب عادت وائٹ پینٹ کے پائنچے چڑھائے، بلیو شرٹ میں وہ اس پرفسوں رات کا ہی ایک حصہ لگ رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا، بیلا کو دیکھ کر ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی مگر اگلے ہی پل ایک نامحسوس سی مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی۔

''آؤ بیلا۔'' اس کے دوستانہ مسکراتے لہجے میں نرمی تھی۔ دوپہر کے واقعہ کا شائبہ تک نہ تھا چہرے پر۔

''آپ گٹار بہت اچھا بجاتے ہیں۔'' وہ بے اختیار تعریف کر گئی، یہ سچ تھا۔

''شکریہ۔'' وہ کہہ کر پھر سے آنکھیں بند کر کے گٹار بجانے لگا۔ بیلا سائڈ پر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ یوں ہی بے دھیانی میں وہ گٹار بجاتے عدی کو دیکھے گئی۔ اتنا بھرپور، اتنا ڈیشنگ و خوب صورت نظر آنے والا عدی محبت میں ناکام تھا۔ سوچیں دوپہر کے واقعے کی طرف مڑ گئیں، شاید اس کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا تھا کہ اس نے ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ بیلا گڑبڑا گئی۔

''خیریت؟ لگتا ہے آسیب ڈھونڈ رہی ہو مجھ میں۔'' پچھلی بات کا حوالہ دیا گیا وہ محض سر جھٹک کر رہ گئی۔

''سارہ تو بس یوں ہی بولتی رہتی ہے۔'' عدی نے ذرا غور و حیرت سے اسے دیکھا۔ اتنے دنوں بعد وہ خود سے کوئی بات کر رہی تھی۔

''تم بولتی بھی ہو؟'' اس کے خفیف سے طنز پر وہ چپ ہو گئی اسے احساس ہو گیا تھا اس لیے بات بدل گیا۔

''کچھ سنو گی؟'' اس کی خاموشی پر اس نے گٹار سائڈ پر رکھ دیا اور پھر بڑی فرصت سے متوجہ ہوا۔

''فرسٹ آف آل، میں کوئی بھوت نہیں ہوں جسے دیکھ کر لوگ ڈرتے ہوں، اچھا خاصا ہینڈسم بندہ ہوں۔'' واہ رے خود ستائی۔

''دوسرے میں کوئی اچھوت بھی نہیں ہوں جس سے بات کرنا منع ہو۔ تیسری بات میں آسیب بھی نہیں ہوں جو چمٹ جاؤں۔ میں بھی تمہارے جیسا ایک عام سا انسان ہوں اور اسی وقت تم سے مخاطب ہوں۔'' چمٹنے والی بات پر اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

''فضول......'' اس کے آگے وہ سوچ نہ سکی اور اسے دیکھا۔

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔'' اس نے انکار کیا۔

''کہا تو نہیں مگر پوز تو یہی کرتی ہو۔'' وہ مکمل فراغت سے بحث کے موڈ میں تھا' وہ پچھتانے لگی کہ ادھر کیوں آ گئی۔

''جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''تو آپ دور کر دیں۔'' وہ کوئی موقع خالی جانے نہیں دے رہا تھا، وہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''ہیلو مس اسٹیچو! آپ سے مخاطب ہوں۔'' اس نے ہلکی سی چٹکی بجائی۔ اس نے پریشانی سے سوچا۔

''یا اللہ کہاں پھنس گئی ہوں، سارہ تم ہی آ جاؤ۔''

''اب دیکھیں اندر ہی اندر پچھتانے سے بہتر ہے کہ آپ کھل کر کہہ دیں میں جانا چاہتی ہوں۔'' اس کے درست اندازے پر اس کے چہرے کے

تاثرات دیکھ کر اب کے عدی کھل کر ہنسا تھا۔

''ایڈیٹ! کھل کر بولنا سیکھو، جانا چاہتی ہو تو جاؤ مگر یوں ہونقوں والی شکل مت بناؤ۔'' اس کے تبصرے پر اس کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بولتی ہوں، مجھے کسی ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں۔'' وہ ناراض لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ڈیٹس گڈ، یہی تو میں بھی سمجھا رہا ہوں۔'' اس کی مسکراہٹ میں رتی بھر فرق نہیں آیا وہ منہ پھلائے جانے لگی۔ پیچھے سے آتی گٹار کی آواز اور اس کی گنگناہٹوں پر اسے خود پر غصہ آیا کہ وہ کیوں اس طرح آ گئی۔

☆❁☆

سنڈے کو وہ انکل کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں مختلف کتابیں ترتیب سے رکھوا رہی تھی۔ سارہ کو کتابوں سے الرجی تھی بقول اس کے کتابیں چاٹنے سے بہتر ہے کہ بندہ چورن چاٹ لے، سو وہ خالہ کے ساتھ کچن میں تھی۔

''آگے مزید کیوں نہیں پڑھنا تم نے؟'' اس کے آنرز کے بعد مزید نہ پڑھنے کے ارادے کو جان کر انہیں سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس کی جواز پر کہ وہ سارہ کے بغیر مزید نہیں پڑھ سکتی، وہ اسے سمجھا رہے تھے۔

''بیٹا! دوسروں پر اتنا انحصار کرنے والے اکثر خالی ہاتھ بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔''

''مگر میں ایسی ہی ہوں، بزدل سی، دوسروں پر منحصر کرنے والی۔'' اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا۔

''بیٹا! ایسے لوگوں کو دنیا روند کر آگے بڑھ جاتی ہے، خود میں اعتماد پیدا کرو اتنا کہ تمہیں تنہا چلنے سے ڈر نہ لگے۔ سارہ بے شک تم سے محبت کرتی ہے مگر تم اس کے سہارے کے بغیر چلنے کی عادت ڈالو۔ تم ذہین ہو، کتابوں سے محبت رکھتی ہو۔ پڑھائی ذہن اجاگر کرتی ہے، شعور دیتی ہے۔'' وہ ان کا محبت بھرا لیکچر خاموشی سے سن رہی تھی، جب عدی لائبریری کے اندر آتے ہوئے بولا۔

''اور شعور عقل کو راستہ دکھاتا ہے۔'' اسے دیکھ کر وہ رخ موڑ کر کتابیں شیلف میں رکھنے لگی، انکل عدی کو دیکھ کر نرمی سے مسکرائے۔

''تم سناؤ برخوردار! یزدانی صاحب سے ملے کہ نہیں۔'' عدی بے پروائی سے بولا۔

''ملا تھا، اگلے ہفتے تک میرا پروجیکٹ مکمل ہو جائے تو جوائننگ دوں گا۔'' وہ شیلف سے ٹیک لگائے بڑی فرصت سے کھڑا تھا۔ بیلا بے نیازی سے اپنے کام میں لگی رہی۔

''چلو ٹھیک ہے، تم تب تک یہ کچھ فائلز اسٹڈی کر لو، اگلے ہفتے میٹنگ میں تم پریزنٹیشن دینا۔'' انہوں نے اسٹڈی ٹیبل سے بلیو فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی وہ جو بڑے دھیان سے اس کی ہلتی پونی دیکھ رہا تھا، چونک گیا۔

''ٹھیک ہے ڈیڈ!'' فائل ان سے لے کر اس نے کھول کر ایک نظر دیکھی پھر بند کر دی۔

''اور ذرا جلدی گھر آ جایا کرو، اتنے عرصے بعد آ کر بھی تمہاری شکل دیکھنے کو ترس جاتا ہوں۔'' ان کے محبت بھرے شکوے پر وہ مسکرا پڑا۔ وہ بظاہر بے نیاز تھی مگر خود پر پڑنے والی اس کی نظروں دل سے بے خبر نہ تھی۔

''دل پھینک، نظر باز کہیں کا۔ کل کسی اور کے لیے آہیں بھر رہا تھا اور آج مجھے لائن مار رہا ہے۔'' اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے کتابیں اپنی دانست میں جیسے شیلف پر پٹخی تھیں۔

''کیا ہوا بیلا؟'' انکل اور عدی دونوں نے اسے سوالیہ انداز سے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے عدی کو نظر انداز کر کے بظاہر نارمل لہجے میں جواب دیا۔

''شاید کوئی چھپکلی دیکھ لی ہوگی۔'' وہ اس کے تاثرات سے سمجھ تو گیا مگر انجان بن کر بولا۔

''جی نہیں، میں اس سے نہیں ڈرتی۔'' اور

واقعی اسے عام لڑکیوں کی طرح چھپکلی سے ڈر نہیں لگتا تھا، اس کی یہ واحد بہادری تھی۔

"پھر تو بہت بہادر ہیں آپ۔" اس کے مسکراتے ہونٹ و لہجہ، اس کا دل چاہا کہ اس کے گھنگھریالے بال نوچ ڈالے۔

"ہاں، ورنہ عموماً بچیاں ایسی چیزوں سے بہت ڈرتی ہیں۔" انکل نے ٹیبل پر پڑی کتابیں اٹھا کر اسے دیں، جو اس نے اپنے لیے نکالی تھیں۔

"عدی بھائی! آپ کے دوست آئے ہیں جی!" اسی وقت پھولن کا پوتا اسے بلانے آ گیا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔



دوپہر کا کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ انکل اور خالہ کہیں مدعو تھے وہ وہاں چلے گئے۔ سارہ اسے زبردستی باہر لے گئی' آئس کریم کھاتے، سڑکوں پر بے وجہ پھرتے انہیں بہت مزا آ رہا تھا۔ راستے میں بیدل کا فون آ گیا، اس سے بات کرتے وہ اداس ہونے لگی۔

"بیدل! تم آ کر مجھے لے جاؤ۔"

"کیوں؟ عدی نے کچھ کہا ہے؟" اس کے بے تکے سوال پر وہ تپ گی۔

"وہ بھلا کیا کہے گا بس مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔"

"ہائے...... اتنا غصہ، تمہیں بھی اب غصہ آنے لگا ہے اور رہو سارہ کی سنگت میں۔ بالکل اپنے جیسا بنا لے گی تمہیں۔" اس کے غصیلے لہجے کو بیدل نے محسوس تو کیا مگر ٹال گیا۔

"تو پھر مت مجھ سے پنگا لو، بیدل عقل سے پیدل۔ نواب شاہ آ کر ٹھیک کروں گی تمہیں تو۔" اسپیکر آن تھا سارہ نے اس کی کلاس لے ڈالی۔

"عبید بھی یہ ہی کہہ رہا تھا اس دن کہ آنے دو سارہ کو واپس، ٹھیک کروں گا اسے۔"

"کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟" اسے پتنگے لگ گئے یہ سن کر۔

"بھئی تم جو سارا سارا دن بازاروں کی سڑکیں ناپ رہی ہو تو اسے ساری رپورٹس مل رہی ہیں۔" بیدل نے ڈرایا، ایک لمحے تو ان دونوں کو یقین آ گیا مگر جلد ہی سارہ بے پروائی سے بولی۔

"ارے جاؤ، عبید کو سب معلوم ہے تم جھوٹ بول کر اپنے بے تحاشا گناہوں میں مزید اضافہ مت کرو۔" اس کے انداز پر بیلا مسکرانے لگی۔

سارہ بیدل کے ساتھ نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی، دونوں چلتے ہوئے گھر کی سڑک پر آ گئے۔ جب اس کی نظر سامنے عدی کے ساتھ کھڑی لڑکی پر پڑی تھی وہ جو کوئی بھی تھی اس کی پشت ان کی طرف تھی۔ اس کے بلونڈ اسٹیپ میں کٹے بال ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ماڈرن سے سوٹ میں وہ کسی بات پر دل کھول کر ہنس رہی تھی، بیلا کے ذہن میں پہلا خیال اس دن والی لڑکی کا آیا تھا۔

سارہ اب بھی نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی اس نے سامنے نہیں دیکھا تھا۔ عدی کے ساتھ کوئی لمبے بالوں والا لڑکا بھی تھا وہ لڑکی اب ان دونوں کو بائے کہہ کر گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ گیٹ کی طرف مڑتے عدی نے انہیں دیکھ لیا تھا، اسے رکتے دیکھ کر وہ لڑکا نجانے اس سے کیا پوچھنے لگا تھا۔ سارہ کی بولتی بھی انہیں دیکھ کر بند ہو گئی اور فون آف کر کے عدی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

بیلا کو یہاں کھڑا رہنا دوبھر لگ رہا تھا، لمبے بالوں والا وہ گورا سا لڑکا بڑی دلچسپی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے گیٹ کی جانب قدم بڑھا دیے مگر عین درمیان میں عدی کھڑا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" اس کے پُراشتیاق لہجے پر عدی پلٹا تھا۔

"میری کزنز۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"ہائے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بیلا کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، بیلا ہکا بکا رہ گئی۔

عدی نے اس کی پُرشوق نظریں اور بیلا کا ہونق چہرہ دیکھا تو نجانے کیوں تیز لہجے میں بول گیا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو، اندر جاؤ تم۔" اس کا

تحکمانہ و تیز لہجہ' دونوں ہی بھونچکا رہ گئیں کہ ایک دم اسے کیا ہوا تھا۔

"سنا نہیں، جاؤ۔" اس کے لہجے سے جھلکتا غصہ محسوس کر کے بیلا کو سخت بے عزتی کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی اور گیٹ کراس کرتے ہوئے اس کی کہنی بڑے زور سے عدی کے سینے سے ٹکرائی تھی۔ سارہ بھی کچھ حیرت و نا سمجھی سے انہیں دیکھتے اس کی پیچھے لپکی۔ اس ساری صورت حال کو حیرت سے دیکھتا فواد بولا۔

"کیا ہوا یار! آر یو اوکے؟" اپنی کیفیت تو خود اسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہوں تم، گھر جاؤ۔ میرا مزید پریکٹس کا موڈ نہیں ہے۔" روکھے و سرد لہجے میں کہہ کر وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گیا تھا۔ باہر فواد اس کے اس روڈ لہجے پر ہکا بکا کھڑا رہ گیا، اس کے اتنے غصے کی وجہ سمجھنے سے وہ بھی قاصر تھا۔



اگلے دن اس کا سامنا عدی سے سرسری سا ہوا تھا۔ وہ قصداً اس سے کترا رہی تھی۔ گھر کی یاد اور کل کا واقعہ دونوں کو بھلانے کے لیے وہ سارا دن خود کو مصروف رکھے رہی مگر اس کا دھیان بار بار بھٹک جاتا تھا۔ کھانے پر خالہ نے انہیں اپنی این جی او کی طرف سے ایک چیریٹی میوزیکل کنسرٹ کے بارے میں بتایا۔ سارہ تو ایکسائٹڈ ہو کر فٹ سے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے البتہ انکار کر دیا، اس کی طبیعت اور اداسی کو دیکھتے ہوئے سارہ نے تو بہت اصرار کیا مگر وہ سہولت سے ٹال گئی۔

سارہ خالہ کے ساتھ سرِشام ہی تیار ہو کر چلی گئی، انکل بزنس ڈنر پر انوائٹڈ تھے اور عدی بھی گھر پر نہ تھا۔ وہ اس خاموشی اور تنہائی کو انجوائے کرنے کے لیے چائے کا ایک فل سائز مگ بنا کر باہر لان میں نکل آئی، پھولن کوارٹر جا چکی تھی۔

وہ رات کی مخصوص مہک اور ہوا کی سرسراہٹوں کو محسوس کرتی اپنے پسندیدہ حصے میں جانے لگی تھی، جب وہاں سے آتی سسکیوں کی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے اوٹ میں ہو کر دیکھا، دو سائے سے اس کی طرف پشت کیے کھڑے تھے۔

"خدا کے لیے میرے ساتھ یہ ظلم مت کرو، خود کو اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے میں یہ حقیقت جان چکی ہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اور میں بھی تم سے دور جانے کی خواہش میں کرچی کرچی ہوا جا رہا ہوں۔ تم تو پھر بھی رو لیتی ہو، اپنے دل کا غبار آنسوؤں کے رستے نکال لیتی ہو مگر میں، ہونہہ...... ایک مرد، رونا جس کے لیے کمزوری اور مسکرانا مجبوری۔ تم بتاؤ سی...... میں کہاں جاؤں؟ کس کے کندھے پر سر رکھ کر روؤں؟ کسے اپنے درد کی شدت بتاؤں۔" کرب میں ڈوبی آواز عدی کی تھی، بیلا سدا کی نرم دل، اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگیں۔

"میں ہوں نا...... ان کمزور کاندھوں پر جب دنیا کی آزمائشوں کے اتنے بوجھ اٹھائے ہیں تو ان پر اگر تم سر رکھ کر اپنا بوجھ ہلکا کرو گے تو یہ میری محبت کی خوش نصیبی ہو گی۔" لڑکی نے عدی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ دونوں اب بیلا کو واضح نظر آ رہے تھے، پوسٹ لیمپ کی روشنی میں بیلا نے اس لڑکی کو پہچان لیا، اس کا اندازہ ٹھیک تھا یہ اسی دن والی لڑکی تھی۔

"تم صرف بوجھ اٹھانے کے لیے تو نہیں ہو، میری محبت میری متاع ہو۔" جذب سے کہتے ہوئے عدی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"کاش میں تمہاری ہمسفر بھی ہو سکتی۔" اداس لہجے میں کہتی وہ رو پڑی، عدی نے اس کے ہاتھ دبائے اور کچھ کہنے لگا ہی تھا اس کی نگاہ سامنے سائڈ پر کھڑی بیلا پر پڑی۔ بیلا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری تھی کہ بیلا بھی گڑبڑا گئی۔

"بیلا! خیریت......؟" لڑکی کے ہاتھ چھوڑ کر اس نے پوچھا تو لڑکی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی، اس کے چہرے پر بھی وہی تاثرات ابھر کر معدوم ہوئے تھے۔

''ہاں...... وہ بس......'' اس سے کوئی بات نہ بن سکی' ہاتھ میں پکڑا مگ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا۔

''تم رو رہی ہو؟'' آنسو سے تر چہرے پر نظر پڑی تو بیلا کو اپنی شدید بے وقوفی کا احساس ہوا۔ کم از کم آنسو تو صاف کر لیتی، وہ لڑکی بھی اب چل کر عدی کے برابر کھڑی بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ آج بھی اس کے بلونڈ اسٹیپ میں کٹے بال ہوا سے لہرا رہے تھے، چہرے پر کچھ دیر پہلے والی کیفیت کا شائبہ تک نہ تھا مگر بیلا نے زیادہ غور نہیں کیا تھا۔

''کیوں رو رہی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔'' چند قدم کا فصلہ لمبے لمبے ڈگ بھر کے وہ عبور کرتا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

''میں تو...... نہیں...... بس......'' اس سے کوئی بات نہ بن پائی تو چائے کا مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں مگ تھا وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا جو جلدی جلدی آنسو صاف کرتی چور سی ہو رہی تھی۔

نجانے یہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ میں چھپ چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ دل ہی دل میں کف افسوس ملتی وہ شرمندگی سے گڑی جا رہی تھی۔

''اچھا تو یہ بن بادل کی برسات ہے، ہے نا۔''

''ہاں۔'' بنا سمجھے اس نے اثبات میں گردن ہلا دی مگر اس لڑکی کے مسکراتے چہرے اور عدی کی مسکراتی آنکھیں دیکھ کر اسے اپنا مذاق بنائے جانے کا احساس ایک دم سے طیش دلا گیا۔

''دوسروں کا مذاق اڑانے سے بہتر ہے کہ اپنی زندگی کو مذاق بننے سے بچا لیں۔ اپنی الجھنوں کو سلجھائیں۔'' اس کے سخت الفاظ پر اس کے تاثرات ایک دم سے بدل گئے۔

''مثلاً کون سی الجھن؟'' بھنویں اچکاتے اس نے پوچھا۔ ایک لمحے کو اس کو بھی احساس ہوا کہ وہ سخت لہجے میں بول گئی تھی مگر اسے اپنی طرف منتظر دیکھ کر اس نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔

''اپنی محبت کو اپنانے کی ہمت کریں۔ بزدل بن کر رونا مرد کی شان کے خلاف ہے۔'' اس کے بیان پر تو وہ پہلے بھونچکارہ گئے۔

''کسی کو آس دے کر بیچ میں چھوڑ دینا مردانگی نہیں ہے۔''

ایک دوسرے کو دیکھتے سب سے پہلے عدی کے تاثرات میں تبدیلی آئی تھی۔

''میں نے کسی کو آس نہیں دی۔''

''تو پھر یہ کون ہیں؟''

طنزیہ انداز میں سامنے اشارہ کرتے اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی کہ دیکھو کیسے میں نے تمہاری چوری پکڑ لی۔ سامنے بیٹھی لڑکی کے چہرے پر حیرت کا شدید تاثر ابھرا تھا وہ ایک دم سے بولی تھی۔

''بات سنو!''

''عائلہ کوائٹ (خاموش رہو)۔ تو تم ہماری باتیں سن رہی تھیں۔'' عدی کو چند لمحے لگے تھے صورتحال سمجھنے میں اس کے پوچھنے پر وہ بڑی مطمئن کھڑی تھی، شرمندہ سی ہو گئی۔

''میں نے جان بوجھ کو ایسا نہیں کیا۔ میں تو چائے پینے آئی تھی۔''

وضاحت دیتا اس کا لہجہ کمزور تھا۔ وہ خود کی بھی اچھی طرح سے صفائی پیش نہیں کر سکتی تھی۔ عدی اب بڑے پُرسکون انداز میں چائے کے مگ سے گھونٹ بھر رہا تھا۔

''چلو مان لیا، تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر پھر بھی تمہیں کوئی حق نہیں مجھ پر طنز کرنے کی۔''

''میں طنز نہیں کر رہی تھی مگر بحیثیت ایک لڑکی میں دوسری لڑکی کا درد بہت اچھی طرح محسوس کر سکتی ہوں۔''

عائلہ جو خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر چپ کر گئی۔

''تو میرا درد کون محسوس کرے گا۔ میں کیا کروں؟'' اس کی لہجہ رقت آمیز ضرور تھا مگر چہرے

جھلکتی مسکراہٹ اس کے برعکس تھی۔ عائلہ جیسے سمجھ گئی تھی وہ اطمینان سے پول کے کنارے بیٹھ گئی۔ اور خاموشی سے ان کی گفتگو سننے لگی۔

''آپ مرد ہیں۔ اسٹینڈ لیں کسی کو اتنے سال اپنی آس میں بٹھا کر چھوڑ دینا ناانصافی ہے۔'' عدی کے ذہن میں اسپارک ہوا۔

ہوں تو محترمہ پہلے بھی ہماری باتیں سن چکی ہیں۔

''ہاں، یہی تو نہیں کر سکتا۔''

ٹھنڈی آہ بھرتے اس نے کن انکھیوں سے اس کے تاثرات دیکھے۔ بے وقوف۔ اسے ہنسی آ رہی تھی۔

''خالہ یا انکل راضی نہیں؟ یا ان کے والدین کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہے۔ اگر انکل یا خالہ کی طرف سے مسئلہ ہے تو آپ انہیں قائل کریں۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بہت سوفٹ ہیں وہ جان جائیں گے۔'' وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی یہ جانے بغیر کے سامنے موجود وہ دو لوگ کیا سوچ کر مسکرا رہے تھے۔

''اور اگر آپ انہیں قائل نہیں کر سکتے تو سارہ کو بولیں، وہ آپ کی مدد کرے گی۔ وہ بہت اچھا کنوینس کر لیتی ہے۔''

عام سے حلیے میں ملبوس یقین سے کہتی عدی کو اس لمحے بہت خاص لگی تھی۔

''مجھے پورا یقین ہے وہ آپ کی شادی ان سے کروانے پر مان جائیں گے۔''

ٹھنڈی چائے پیتے عدی کو ایک دم اچھو لگ گیا۔

''شادی؟''

''ہاں شادی...... کیا آپ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟'' بیلا کو عدی کی حیرت پر حیرت ہوئی۔ اس کی براؤن آنکھیں سوالیہ انداز میں اس پر ٹکی تھیں۔

''ضرور، یہ نیک کام اب آپ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔'' پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

''عدی......'' عائلہ کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ بیلا اندر جانے کو مڑ گئی تھی۔ عدی نے ٹھنڈی اور اس کی جھوٹی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اندر اتار لی۔ بیلا کے چلے جانے کے بعد عائلہ نے اٹھ کر عدی کو زوردار مکا مارا۔ ''یو لائر (جھوٹے)''

''شش......'' عدی نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کروایا تھا۔

☆☆☆

سارہ لوگوں کی واپسی تک وہ جاگ رہی تھی۔ سارہ نے پہلے تو اس کے جاگنے پر حیرت کا اظہار کیا پھر چینج کر کے اسے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کنسرٹ کے بارے میں بتانے بیٹھ گئی۔ بیلا یوں تو بظاہر سن رہی تھی مگر اس کا سارا دھیان تو کچھ دیر پہلے ہونے والے واقعے پر تھا وہ اسی کشش و پنج میں مبتلا تھی کہ سارہ کو بتائے یا نہ بتائے۔ سارہ تو واقعات سنانے کے بعد سو گئی جبکہ اسے کافی دیر بعد نیند آئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سارہ محترمہ نہیں تھی۔ سامنے ٹائم دیکھا تو ساڑھے دس بج رہے تھے وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اتنا لیٹ تو وہ کبھی بھی نہیں اٹھی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو پھولن اسے کچن میں ہی ملی۔

''سلام بی بی جی! بیگم صاحبہ سارہ بی بی کے ساتھ سامنے والے گھر گئی ہیں۔ آپ کے لیے ناشتا بنا دوں؟''

''بنا دیں۔'' وہ ڈائننگ کی چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا اس وقت اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔

''پھولن مجھے آملیٹ پراٹھا بنا دیں۔'' اتنے دنوں سے امی کے ہاتھ کا ناشتا یاد آ رہا تھا تو اس نے فرمائش کر دی۔ وہ سر اثبات میں ہلا کر ناشتا بنانے لگی۔

اس نے سستی سے سر میز پر رکھ دیا۔

''پھولن دیوی...... پھولن دیوی۔''

حسب عادات بلند آواز میں پکارتے اندر آنے والا عدی تھا۔ اس نے جھٹ سے سر میز پر سے اٹھایا اور اس جلدی میں میز کا کونا بھی گال پر لگ گیا۔ عدی یہ دیکھ کر زیر لب مسکرایا تھا۔ خفت سے بیلا نے اپنا گال رگڑ کر مزید لال کر دیا۔

''جی صاحب جی۔'' پھولن فوراً متوجہ ہوئی۔

''ایک کپ کافی بنا دو اسٹرانگ سی......'' اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ پھولن اثبات میں سر ہلا کر چولہے کی طرف مڑ گئی۔

''طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوئی تمہاری؟''

اس کے چوٹ لگے گال کو دیکھتے ہوئے وہ نجانے کیوں مسکرایا تھا۔ بیلا چڑ گئی۔

''مادام...... میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' اس کی خاموشی پر پھر پوچھا گیا۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سامنے رکھے اسٹینڈ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہوں میں۔''

''ہونا تو نہیں چاہیے۔''

زیر لب بڑبڑایا گیا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ مگر وہ لاپروائی سے سیٹی پر انگلش گانے کی دھن بجاتا رہا۔ بیلا بے دھیانی سے اسے دیکھنے لگی۔ ہر لحاظ سے مکمل شخص اپنی محبت کو حاصل کرنے میں بے بس تھا۔ بلیو ٹی شرٹ اور وائٹ ٹراؤزر میں ملبوس وہ بہت بے نیاز سا لگ رہا تھا۔ ٹراؤزر کے پائنچے حسب معمول فولڈ تھے۔ ہلکے براؤن گھنگریالے بال لاپروائی سے بکھرے ہوئے تھے، شرٹ سے جھانکتے مضبوط بازو اس بات کے غماز تھے کہ دنیا سے لڑنے کا حوصلہ تھا۔ لمبے مضبوط ہاتھ ہلکی ہلکی ٹیبل بجا رہے تھے۔ ہلکی پھلکی بڑھی شیو کے ساتھ وہ اس رف حلیے میں بھی بہت ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ ناشتا سامنے رکھے جانے پر وہ چونکی تھی۔ اس کا ناشتا اور عدی کی کافی پھولن میز پر رکھ کر واپس چولہے کی طرف چلی گئی۔

اس نے ہوش میں آتے ہوئے پراٹھے کی پلیٹ اپنی طرف کی اور پہلا نوالہ توڑا۔

''آہا، دیسی ناشتا۔'' عدی نے کہا بے تکلفی سے اس کا پراٹھا کھسکایا اور توڑ کر آملیٹ سے کھایا تھا۔ وہ بھونچکا نوالہ یوں ہی ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی۔

''مس اسٹیچو! تمہیں یقیناً برا لگا ہے مگر اتنی شاندار خوشبو تھی کہ میں رہ نہ سکا۔''

وہ بڑے مزے سے نوالے پر نوالہ کھا رہا تھا۔ کافی کی طرف اس نے دیکھا بھی نہیں۔

''تم بھی کھاؤ نا۔''

اس نے ایک نوالہ بنا کر اس کی جانب بڑھایا تو وہ جواب تک اسے گھورے جا رہی تھی بدک کر پیچھے ہٹی اور ناگواری سے اسے دیکھا۔

اس کے دبے دبے غصے کو اس نے محسوس تو کر لیا تھا مگر خاطر میں نہ لایا۔

''اتنے پیار سے تو کوئی زہر بھی دیتا تو میں کھا لیتا۔'' بدستور شرارت سے ہنستے ہوئے اس نے ایک دم سے اس کا نوالے والا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ کے قریب لایا اور وہ نوالہ کھا لیا۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر بے یقینی سے اٹھی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر اس نے لال بھبھوکا چہرے سے اسے دیکھا۔

''آپ......آپ نہایت ہی......''

کانپتی آواز میں اس سے بات ہی مکمل نہیں ہو رہی تھی۔ پھولن بے چاری بھی ہکا بکا سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ عدی نے لبوں پر آئی مسکراہٹ تو کمال خوبی سے چھپالی تھی مگر آنکھوں کی جگمگاہٹ کا کیا کرتا۔

بیلا کا دل چاہا کہ اس کی آنکھوں میں لال مرچیں ڈال دے۔ ٹھرکی فلرٹی...... بدتمیز......

''میں جانتا ہوں کہ میں میں کیا ہوں۔ تم کیوں خود کو تھکا رہی ہوں؟ ریلیکس! پھولن ایک گلاس ٹھنڈا پانی بیلا بی بی کو دینا شاید ان کی اٹکی ہوئی زبان اور سانسیں چل پڑیں۔'' یہ بات تو تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی وہ آنسوؤں بھری آنکھوں

ے ایک جھٹکے سے مڑی اور کچن سے نکل گئی۔

اب اطمینان سے اس کی چائے پی رہا تھا۔

''اٹھ گئے عدی؟'' خالہ اور سارہ بھی آگئیں۔

''گڈ مارننگ مام!'' انہیں دیکھ کر وہ مسکرایا سارہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''مارننگ؟ بیٹا نون چل رہا ہے۔'' وہ مسکرائیں پھر چونکیں۔

''تم اور پراٹھا آملیٹ......! تم تو کبھی آملیٹ نہیں کھاتے کہ تمہیں ہیک آتی ہے اور ساتھ میں پراٹھا۔''

''کبھی کبھی ٹیسٹ بدل لینا چاہیے مام! کیوں ڈیئر؟''

سارہ اس کے استفسار پر مسکرائی تھی۔

''بیلا اٹھ گئی پھولن!''

سارہ کے استفسار پر اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اس کے پاس جانے کو اٹھ کھڑی جبکہ خالہ کچھ حیرت اور محبت سے اپنے لاڈلے کو دیکھنے لگیں جو زیر لب مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

سارہ کے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے اپنے آنسوؤں کی وجہ نہ بتائی۔ سارہ کو حیرت بھی ہوئی اتنی گہری اور ضدی تو کبھی بھی نہیں تھی۔ دوپہر کو سارہ اسے کھانے کے بعد زبردستی خالہ کے کمرے میں لے گئی۔ عدی خالہ کی گود میں سر رکھے بڑے اطمینان ے لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر بیلا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

عدی اسے مکمل نظر انداز کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''اوکے مام! چلتا ہوں۔ فرینڈز انتظار کر رہے ہوں گے۔''

سارہ اسے بیڈ پر ساتھ بٹھاتے ہوئے عدی پر خفا ہونے لگی۔

''او...... ہم گپ شپ لگانے آئے ہیں اور تم چل پڑے۔'' بیلا کا دل چاہا کہ سارہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ اچھا تھا کہ وہ جا رہا تھا۔ خالہ بھی تائید کرنے لگیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے سارہ! تم نہ انہیں باہر کہیں لے کر گئے ہو۔ نہ کوئی ڈنر نہ کوئی لنچ۔ بے چاری سارا دن گھر پر رہتی ہیں۔'' خالہ کے شکوے پر وہ بے نیازی سے موبائل پر مصروف رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیلا جان بوجھ کر ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اس نے ایک نظر خالہ کو پھر سارہ کو دیکھا۔

''مصروف ہوں۔ ٹائم ملا تو لے چلوں گا۔'' وہ انہیں بائے کرتا بیلا پر ایک نظر غلط ڈال کر چلا گیا۔

''کہیں کا شہزادہ ہے نا مصروف ہوں اور یہ سارہ اسے کیا ہوا ہے جو اس کی کمپنی کے لیے مری جا رہی ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی تھی مگر خالہ کے کچھ پوچھنے پر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''آج شام کو تم بھی چل رہی ہو نا ہمارے ساتھ۔'' وہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ سارہ نے بتایا کہ شام کو خالہ کی این جی او نے ایک لائیو چیریٹی کنسرٹ منعقد کروایا تھا اس نے بھی جانے کی ہامی بھر لی۔ گھر بیٹھ کر فضول سوچوں سے تو بہتر تھا کہ وہ لائیو میوزک انجوائے کر لے۔

شام کو سارہ بڑے دل سے تیار ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر باہر گیرج میں ہی آگئی۔ فضا میں پھولوں کی خوشبو کو محسوس کرتی وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے جھومتے پیڑ و پودے اسے ایک انجانی دنیا میں لے گئے۔ آنکھیں بند کیے وہ اس محسور کن خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کر رہی تھی جب گاڑی کا شیشہ بجائے جانے پر بری طرح چونکی، عدی بڑے اطمینان سے گٹار کیس ایک بازو میں لٹکائے۔ گاڑی کی چابیاں لیے سامنے ہی کھڑا تھا۔ وہ یقیناً عدی کی گاڑی تھی وہ بڑی خاموشی سے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ گاڑی کا لاک کھولتے پوچھنے لگا۔

''ماما کے ساتھ جا رہی ہو؟'' اس کے استفسار پر وہ جواب دیے بغیر لان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہیلو مس اسٹیچو!'' اس نے چابی والا ہاتھ لہرایا وہ یلدم مڑی تھی. ارادہ اندر جانے کا تھا مگر اس کی

بات پر وہ ایک دم مڑی تھی۔ جو اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"لگتا ہے ناراض ہیں۔ چلو ناراض بھی اس سے ہوا جاتا ہے جو اپنا ہو۔ دل سے قریب ہو۔"

"غلط فہمی ہے آپ کی میں اور آپ سے ناراض؟" تڑخ کا جواب دینے پر بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

"اچھا تو اتنی دیر سے کیا جتایا جا رہا تھا۔" اس کی مسکراتی آنکھیں۔ اف اس کا دل چاہا کہ اس کے سنورے ہوئے براؤن بال نوچ ڈالے۔ اس نے جلتی نظروں سے دیکھا۔

"میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" جواب اس نے بڑے تحمل سے دیا تھا اور اندر جانے کو قدم بڑھائے تھے۔ وہ پیچھے سے پکارا۔

"تو بتا دیں۔ پھر کب حاضر ہوں آپ کی گفتگو سے فیض یاب ہونے۔"

اسے اس کا لہجہ اپنا مذاق اڑاتا لگ رہا تھا۔ وہ بے اختیار پلٹی تھی اور شعلہ بار لہجے میں بولی۔

"آپ جائیں جہاں جا رہے تھے کیوں اپنا وقت اور میرا موڈ برباد کر رہے ہیں۔ یہ کوشش وہاں کریں جہاں سے جواباً اچھے رسپانس کی امید ہو۔ مجھ پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔"

وہ زندگی میں بہت کم ہی غصہ ہوتی تھی۔ عموماً غصے کے بجائے اسے رونا آ جاتا تھا اور کسی سے روڈ لہجے میں بات تو اس نے شاید ہی کی ہو مگر صبح کے واقعے اور اب اپنا مذاق اڑائے جانے پر وہ شدید مشتعل ہو گئی تھی۔ اس کے اتنے سخت لہجے پر صرف ایک لمحے کو حیرت ابھری مگر پھر وہی ہونٹوں سے جھانکتی دبی دبی مسکراہٹ اسے مزید جلانے کا کام کر رہی تھی۔ اس کے غصے پر اس کا مسکرانا بیلا کو ایک دم رونا آنے لگا۔ اسی اثنا میں خالہ اور سارہ بھی باہر آ گئیں۔ عدی کو وہیں کھڑے دیکھ کر خالہ کو حیرت ہوئی۔

"تم گئے نہیں ابھی تک؟"

"جا ہی رہا تھا کہ بیلا نے آواز دے کر روک لیا۔" اس کے سفید جھوٹ پر بیلا کا مارے خفت و غصے سے برا حال ہو گیا۔

اس نے بے یقینی سے اپنی طرف دیکھتی سارہ کو دیکھا اور روہانسے لہجے میں بولی۔

"یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

سارہ جیسے ایک دم سمجھ کر مسکرائی تھی اور آگے بڑھ کر بیلا کا ہاتھ تھام کے دبایا۔ خالہ نے عدی کو نرمی سے ٹوکا۔

"بری بات عدی! مت تنگ کیا کرو اسے۔"

"میں کب تنگ کرتا ہوں انہیں، محترمہ تو جیسے خود سے تنگ لگ رہی ہیں آج کل۔" گاڑی کا لاک کھولتے اس نے بڑی لاپروائی سے کہا تھا۔

سارہ نے جو بیلا کی رونی صورت دیکھی تو عدی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی۔

خالہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں وہ دونوں بھی بیٹھ گئیں۔ عدی گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس نے ایکسلیٹر پر پاؤں رکھا پھر شیشہ نیچے کر کے ان دونوں کو وش کرتا گاڑی بڑھا لے گیا۔

وہاں جا کر بھی اسے مزا نہیں آ رہا تھا۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

خالہ کی وجہ سے انہیں وی آئی پی پروٹوکول ملا۔ فرنٹ کی سیٹوں پر وہ سارا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ خالہ بیک اسٹیج انتظامات دیکھ رہی تھیں۔ بہت سے لوگوں سے مل ملا کر اس کا ذہن ذرا سا بدلا یا پھر شاید وہ ماحول کا اثر تھا۔ اوپن لان میں کنسرٹ کے سارے انتظامات کیے گئے تھے۔

اترتی ہوئی دلکش شام، مدہم مدہم چلتی ہوا۔ لہراتے ہوئے پھول اور خوشبو بھری فضا میں وہ گارڈن انتہائی سرسبز و شاداب تھا۔ سارہ کی دلچسپ باتوں کے دوران وہ میوزک انجوائے کرتی رہی۔ کچھ سنگرز مشہور تھے مگر باقی بینڈز نئے تھے۔ جن کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ سارہ سیلفیاں لے لے کر واٹس ایپ کر کے عبید اور بیدل کو بھیج رہی تھی۔

"دیکھو بیدل نے شہلا اور اپنی تصویریں بھیجی ہیں۔" سارہ نے اسے سیل فون دیا وہ سیل فون ہاتھ میں لے کر تصویریں دیکھنے میں منہمک تھی جب سارہ نے اسے ٹہوکا دیا "سامنے دیکھو۔"

اس نے یوں ہی نظریں اٹھائی تھیں۔

"تالیوں کے شور میں اسٹیج پر آنے والا وہ عدی تھا گٹار گلے میں لٹکائے اپنی چمکتی آنکھوں سمیت وہ کسی ہیرو کی طرح لگ رہا تھا۔ سارہ بہت پرجوش سی تالیاں بجا رہی تھی۔ عدی نے مائیک اپنے آگے سیٹ کیا۔

چھوڑو بھی گلہ، ہوا جو ہوا
لہروں کی زباں کو ذرا سمجھو
سمجھو کیا کہتی ہے ہوا

اس کی آواز دل نشین تھی یہ وہ اچھی طرح جانتی مگر اس وقت جتنے جذب سے گا رہا تھا وہ اس سہانی شام کو مزید خوب صورت بنا رہا تھا۔

تم ناراض ہو، میرے کتنے پاس ہو
نازک نازک سی، پیاری پیاری سی
میرے جینے کی آس ہو
تم ناراض ہو

ڈھلتی شام کے پس منظر میں اس کا خوب صورت انداز اور خراماں چلتی ہوا میں جھومتا کراؤڈ یوں لگ رہا تھا کہ دن بھر کی کلفت پل بھر میں دور ہو گئی ہو۔

"عدی بہت بہترین سنگر ہے اور عنقریب اس کی سی ڈی البم بھی ریلیز ہونے والی ہے۔" تالیاں بجاتے ہوئے سارہ نے بیلا کی طرف جھک کر کہا۔

وہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔ دھیان سارا ادھر تھا۔

تم ناراض ہو......

وہ آنکھیں بند کیے گا رہا تھا۔ بیلا اسٹیج کی جلتی روشنیوں میں اس کا جگمگاتا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار وہ اپالو کا مجسمہ لگ رہا تھا۔ اس کے نیم گھنگریالے بال ہوا سے بکھر سے گئے تھے مضبوط مردانہ انگلیاں گٹار کو بجا رہی تھیں نیوی بلیو ٹی شرٹ میں ملبوس وہ جیسے سارے ماحول پر چھا سا گیا تھا۔ تالیوں کی شور اور ہوٹنگ کی آوازوں سے وہ ہوش میں آئی۔

عدی اپنے بینڈ سمیت ستائش وصول کر رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے بیٹھی بیلا پر پڑی نجانے کیوں بیلا کو لگا جیسے اس نے مسکراہٹ دبائی تھی پھر وہ چلا گیا۔ بیلا پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا جیسے۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔" اپنے یوں کھو جانے پر اسے لگا تھا جیسے عدی نے اس کی یہ چوری پکڑ لی تھی۔ وہ کوئی انوکھا دنیا کا پہلا خوب صورت مرد تو نہیں ہے۔ پھر جب مجھے پتا بھی ہے کہ وہ کس طرح میرا مذاق اڑائے گا اس حرکت پر۔ تف ہے تم پر بیلا۔"

باقی سارا وقت اس کا خود کو ملامت کرتے گزرا تھا۔ گھر واپسی پر سارہ نے اس کے جھنجلانے کی وجہ پوچھی تو اس نے عدی اور اس لڑکی کا سارا قصہ سنا دیا۔ سارہ کو تو یقین ہی نہیں آیا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ انکل، آنٹی کو تو تم جانتی ہو نا وہ کتنے لبرل اور براڈ مائنڈڈ ہیں۔ دوسرے وہ عدی سے انتہائی محبت کرتے ہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ عدی کی پسند یا بقول تمہارے محبت کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔ یقیناً بات کچھ اور ہے۔" بیلا اس کی بات پر سوچ میں پڑ گئی۔ پھر نفی میں سر ہلائے بولی۔

"مگر سارہ میں نے خود انہیں باتیں کرتے سنا ہے اور ایک نہیں دو مرتبہ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ رکاوٹ لڑکی کے پیرنٹس کی طرف سے ہو۔"

"ہوں ایسا ہو سکتا ہے"

اب سارہ نے بھی اتفاق کیا تھا۔

"چلو دیکھو۔ آگے کیا ہوتا ہے اب سوتے ہیں۔ بہت نیند آ رہی ہے۔" سارہ نے کروٹ بدل لی مگر بیلا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کی سوچیں اپنی شام والی کیفیت کی طرف چلی گئیں۔ مجھے اس وقت کیا ہو گیا تھا۔ وہ حیران بھی تھی اور شرمندہ بھی۔ ان ہی الجھی سوچوں میں وہ رات کے آخری پہر جا کے

سوئی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ عجیب سے احساس سے کھلی تھی کان میں شاید مکھی گھس گئی تھی۔ یہ پہلا خیال تھا جو ذہن میں آیا تھا وہ جھٹکے سے اٹھی اور کانوں میں جلدی جلدی انگلیاں گھمانے لگی۔ زور دار قہقہے اور کھلکھلاتی ہنسی پر اس نے فوراً دائیں طرف گردن گھمائی تھی۔ بیدل کے ہاتھ میں تنکا تھا اور یہ یقیناً اس کی شرارت تھی۔ اسے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ پر اس کے لیے ایک خوش گوار سرپرائز تھا۔ یوں لگا جیسے صدیوں بعد کسی اپنے کی صورت دیکھی ہو وہ ایک دم اٹھ کر اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

ارے ارے! یہ بن بادل کی برسات کیوں۔"

بیلا کے رونے پر دونوں ہی بوکھلا گئے۔

"بیلا!" بیدل نے اس کے گرد اپنے مضبوط بازو کا حلقہ کرلیا اور دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ سارہ بھی آگے بڑھی مگر بیدل نے اسے اشارے سے روک لیا۔

وہ بس روتی رہی جب خوب رو چکی تو آستین سے بہتی ناک صاف کرتے ہوئے شرمندہ سی ہوگئی۔

"پاگل کسی نے تمہیں یوں میرے گلے لگ کر روتے دیکھ لیا تو سخت قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو جائے گا۔ اب کسی کو کیا پتا میں تمہارا رضاعی بھائی ہوں۔"

بیدل نے ہوشیار کرنا چاہا وہ لاپروائی سے سر جھٹک کر رہ گئی پھر شاکی لہجے میں بولی۔

"آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔"

"لو...... تم نے کون سے میرے رستے میں پھول بچھانے تھے یا اکیس توپوں کی سلامی دینی تھی۔"

وہ ویسا ہی تھا۔ زندہ دل، شوخ وہ اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی اور دوپٹے سے منہ صاف کرنے لگی۔

"بہت اچھا۔ تم تو یوں روئی ہو جیسے تم پر یہاں میں نے ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں۔" سارہ لڑنے کو تیار ہوگئی۔

"تم تو میری سب سے اچھی دوست ہو پلیز ناراض مت ہونا۔"

اس نے محبت سے سارہ کا ہاتھ پکڑا تو وہ ہنس دی۔

"لیڈیز! جلدی سے تیار ہو جاؤ آج ما بدولت تم دونوں کو باہر لنچ کروائیں گے۔" بیدل نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اعلان کیا۔

"کیوں؟ تمہاری چھپکلی نے اس مہینے حقہ پانی نہیں لیا۔"

"نہیں...... وہ کہہ رہی تھی کہ ہتھنی سکڑ کر کہیں بندریا نہ بن گئی ہو اس لیے اس دفعہ اسے ٹھونسا دو۔"

اطمینان سے اس کا وار اسی پر لٹاتے وہ حفظ ماتقدم کے تحت دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بیلا نے اپنی ہنسی چھپائی۔ سارہ کو تپ چڑھ گئی۔

"بندریا تو وہ خود ہے اور تم بن مانس!"

"پہلے یہ فیصلہ کرلو کہ وہ چھپکلی ہے یا بندریا۔"

بیدل کو پرواہ ہی کہاں تھی۔ جواباً سارہ پھر کچھ کہتی اور بات بڑھتی بیلا نے شور مچا دیا۔

"بس کرو دونوں، جلدی کرو۔ مجھے بہت سخت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے سارہ کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ بیدل بھی باہر آنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ دونوں تیار ہونے چل دیں۔

پھر سارے رستے بیدل طرح طرح کے چٹکلے چھوڑتا رہا۔ کتنے دنوں بعد بیلا دل سے ہنسی تھی لنچ کے نام پر سارہ نے خوب بیدل کی جیب ہلکی کروائی تھی۔ دہی بھلے، برگر، گول گپے، قلفی، سوڈا کیا کچھ انہوں نے زبردستی کر کے کھایا تھا۔ بیدل واویلا مچاتا رہا۔ پھر مال میں پھرتے اور ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے عدی اور عائلہ مل گئے۔ عدی نے عائلہ کا تعارف کروایا۔

"ان سے ملو، یہ عائلہ ہیں میری دوست۔"

سارہ نے عائلہ سے خوش دلی سے ہاتھ ملایا تھا پھر ایک ٹہوکا کھوئی کھوئی سی بیلا کو مارا وہ بھی جیسے ہوش

ں آئی اور عائلہ سے ملنے لگی۔

عدی انہیں لنچ کی دعوت دے رہا تھا۔ بیدل نے معذرت کرلی کہ وہ لوگ لنچ کر چکے ہیں۔ "تو پھر آئسکریم تو ہو سکتی ہے نا" عدی بڑے موڈ میں تھا۔ بیلا نے دونوں کے کھلتے وشاداب چہرے کو غور سے دیکھا ایک دوسرے سنگت میں دونوں ہی بہت خوش اور پرسکون نظر آرہے تھے۔

"پرفیکٹ کپل" انہیں ساتھ دیکھ کر ذہن میں آنے والا پہلا لفظ یہ ہوتا تھا۔ اپنی محویت پر وہ خود کو سرزنش کرنے لگی۔ "مجھے کیا ہو جاتا ہے، تف ہے تم پر۔"

عدی کے اصرار پر انہیں ماننا پڑا۔ عائلہ، سارہ کے ساتھ بہت گھول مل کر باتیں کر رہی تھی۔ بیدل اور عدی، بیلا کے آگے چل رہے تھے وہ سست قدموں سے ان کے پیچھے آرہی تھی۔ نجانے انہیں ساتھ دیکھ کر اسے برا کیوں لگا۔

عدی نے صرف آئسکریم ہی نہیں اچھی خاصی ریفرشمنٹ منگوالی تھی۔ اس کو تو ذرا بھی بھوک نہیں تھی وہ بس آئسکریم کے کپ میں چمچہ ہلاتی رہی۔ وہ چاروں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس کی عادت کا پتا تھا سو کسی نے زیادہ دھیان نہ دیا۔ کافی دیر بعد بیدل نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کر کے گھر کی راہ لی تھی۔ جب وہ لوگ گھر پہنچے تو شام ڈھل رہی تھی۔ آج کافی دنوں بیلا پرسکون ہوئی تھی۔

☆☆☆

سارہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ عائلہ ہی عدی کی محبت ہے وہ دونوں جس انداز میں باتیں کر رہے تھے صاف لگ رہا تھا کہ ایسی کوئی بھی بات نہیں مگر بیلا کے پریقین انداز پر وہ چپ کر گئی۔ رات کھانے کی گنجائش نہیں تھی سو وہ لوگ بیدل کے ساتھ واک پر نکل گئیں۔ عبید سے باتیں کرتے سارہ کو چھیڑتے بیدل کی سنگت میں وہ جب گھر آئے تو عدی لان میں گٹار بجا رہا تھا۔ بیدل بھی وہیں چلا آیا۔

"کہاں تھے تم؟"

"بتایا تو تھا تمہیں کل لاہور جانا ہے بس اسی سلسلے میں کچھ کام نمٹانے تھے۔" بیلا کا ارادہ اندر جانے کا تھا مگر سارہ اس کا ہاتھ پکڑے اسے زبردستی ادھر ہی لے آئی۔

"بیٹھو نا۔ ذرا گپ شپ ہو جائے گی۔" وہ بادل ناخواستہ آ کے بیٹھ گئی۔ عدی نے ہلکے سے گٹار کے تاروں کو چھیڑا۔

"عدی تمہاری آواز بہت بہت خوب صورت ہے کنسرٹ میں تو لڑکیاں پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔"

سارہ کی تعریف پر وہ ہلکے سے مسکرایا۔ بیدل جو بڑے غور سے سارہ کی بات سن رہا تھا چونکا۔

"پھر ٹھیک کیسے ہوئیں؟"

اس کے تشویش بھرے انداز پر سارہ نے توجہ نہیں دی، جبکہ بیلا بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"سچ میں، وہ لڑکی بہت لکی ہوگی جو تمہاری بیوی بنے گی۔"

"اور عبید...... بے چارہ کتنا بدنصیب۔" بیدل باآواز بلند بڑبڑایا تھا۔ سارہ اب کے چپ نہ رہ سکی۔

"بیدل! خبردار جواب تم نے ایک لفظ بھی بولا ہو تو۔ میں لحاظ کے جا رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم حد ہی کردو۔"

عدی نے مسکراہٹ دبا کر بیدل کو دیکھا۔ پھر اسے شریر لہجے میں سرزنش کی۔

"ناٹ فیئر یار! تم کیوں میری پیاری کزن کو ڈی گریڈ کرتے ہو۔" بیدل نے فوراً سنجیدگی کا چولا پہن لیا۔

"مذاق کر رہا تھا میں یار! ورنہ میں تو اکثر سوچتا ہوں کہ عبید دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے جسے تم جیسی ہتھنی......" اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ "وہ میرا مطلب ہے لڑکی ملی ہے۔" تیر تو کمان سے نکل چکا تھا بیلا جانتی تھی کہ اب بڑا معرکہ ہوگا ہی۔

"بیدل عقل سے پیدل، بدنصیب تو ہے وہ شہلا زادی۔ جس کی قسمت تم جیسے نکمے انسان سے

پھوٹ رہی ہے جو ساری زندگی اس کا خون جلا جلا کر اس کی پاؤ بوٹی بھی ختم کردے گا اور آخر میں وہ دیوار پر بھی چپکی نظر نہیں آئے گی۔'' تیز تیز نان اسٹاپ بولتے سارہ کا سانس پھول گیا۔ بیلا نے سارہ کا ہاتھ پکڑا اور فہمائشی نظروں سے بیدل کو دیکھا جو اب بہت معصوم شکل بنائے بیٹھا تھا۔ عدی نے سیز فائر کروایا۔ اور سارہ کو ریلیکس کروانے لگا۔

بیدل کے سوری پر وہ مان گئی وہ ایسی ہی تھی۔

پھر بیدل نے فرمائش کی۔

''آخر ہمیں بھی پاگل ہونے کا موقع دو یار۔'' وہ سمجھ کے مسکرایا۔ پھر گٹار سیٹ کر کے خوب صورتی سے گانے لگا۔

ہاں ہنسی بن گئے
ہاں نمی بن گئے
تم میرے آسمان میری زمین بن گئے

ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے بیلا کو پھر اسی ٹرانس میں بھیج دیا تھا۔ اس نے ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹ کر چہرہ ٹکا لیا۔ عدی کی زور آور شخصیت اور آواز اس کے حواسوں پر سوار ہونے لگی۔ مگن سے انداز میں گاتے ہوئے عدی نے شاید اس کی محویت محسوس کرلی تھی۔

اس نے ایک نظر کھوئی کھوئی سی بیلا پر ڈالی پھر اس کی ہیزل آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی جاگی تو اس نے نظریں ہٹالیں۔

ہاں ہم بدلنے لگے، گرنے سنبھلنے لگے
جب سے ہے جانا تمہیں
تیری اور بڑھنے لگے
ہر خوشی، ہر جگہ، ہر کہیں بن گئے
مانگتے تھے دعا اور ہاں وہی بن گئے

اس کے نیم گھنگھریالے بال ہوا سے ہلکے ہلکے لہرا رہے تھے۔ حسب عادت کف الٹے ہوئے تھے۔ وائٹ شرٹ سے اس کے بازو جھانک رہے تھے۔ ہلکی سی بڑھی شیو میں وہ بہت خاص لگ رہا تھا۔

کب گانا ختم ہوا، اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ وہ ایک دم جیسے کسی ٹرانس سے جاگی تھی۔ حیرت و شرمندگی یہ پہلا احساس تھا جو اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ سارہ اور بیدل اس پر داد کے ڈونگرے برسا رہے تھے اور بیلا اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کہیں غائب ہوجائے۔ یہ اسے کیا ہو رہا تھا کہ وہ صرف ظاہر پر مرنے والوں میں سے تو نہ تھی، کل تک اس کو فلرٹ کہنے والی آج کیوں اس کی شان دار شخصیت کے اثر میں آنے لگی تھی۔ وہ سر جھکائے گھاس کے تنکے نوچتی گہری سوچ میں غرق تھی۔ عدی نے چند ایک بار اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا، پھر مسکراتی آنکھوں سے بیدل کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تم تو اتنا شان دار گاتے ہو، کہیں سے آفر نہیں ہوئی تمہیں؟'' عدی نے گٹار سائڈ پر رکھ کر اطمینان سے پاؤں پسارے۔

''آج کل ایک دو پروجیکٹس پر کام چل رہا ہے، ٹی وی کے لیے ہیں۔ پھر ایک میوزیکل چینل سے بھی بات ہورہی ہے۔ ویڈیو ریلیز کے بارے میں۔''

سارہ تو بہت پرجوش ہوگئی تھی یہ سن کر۔ بیلا نے سر اٹھا کر اس کے لاپروا سے چہرے کو دیکھا۔ جہاں بے نیازی تھی۔

''سولو یا بینڈ ہے؟''

''لیڈنگ سنگر تو میں ہوں، لیکن میرا پورا بینڈ ہے۔ آثم فواد، ہانی علا'' وہ کسی کا نام لیتے لیتے رک گیا، پھر بات پلٹ دی۔ ''نئے ممبرز بھی بہت انرجیٹک اور سپورٹنگ ہیں۔ ملک سے باہر ہم نے کئی جگہوں پر فارم کیا ہے۔ ہمارا اپنا ایک آفیشل پیج بھی ہے۔ سارہ کو پتا ہے۔'' آج وہ بہت تفصیل سے بتا رہا تھا۔

سارہ نے تصدیق کی۔ ''وہیں سے تو میری ساری دوستیں اس کی دیوانی ہوئی ہیں۔ اس کو ہینڈسم، چارمنگ کہہ کر بلاتی ہیں۔''

''تم تو رہنے ہی دو۔ جیسی تم، ویسی تمہاری دوستیں۔'' بیدل کے مکھی اڑانے والے انداز پر عدی ہنس پڑا، جب کہ سارہ چراغ پا ہوئی۔

''بیدل عقل سے پیدل! تمہارے گھٹیا اور بدتمیز دوستوں سے لاکھ درجے بہتر ہیں کم از کم ہر روز ...نہ اور کالج کے باہر بے عزت تو نہیں ہوتیں نا۔''

''وہ تو ان کا اسٹائل ہے۔'' ادھر پروا کسے تھی۔

''اسٹائل یا ڈھٹائی۔''

''تم ان کے بجائے عبید کی فکر کرو، پچھلے ہفتے وہ ویمن ڈگری کالج کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دھوپ میں پسینے میں نہاتا دیکھ کر بائک اس کے قریب روک دی۔ مجھے دیکھ کر تو اور ہی پسینے چھوٹنے لگے۔ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بدحواس ہو کر کہنے لگا کہ میں بھابھی کو لینے آیا ہوں۔ اس وقت تو میں جلدی میں تھا۔ بعد میں سوچا پوچھ ہی لیتا کہ کس کی بھابھی میری یا اس کی۔'' بیدل کے سنجیدہ انداز پر الٹا سارہ نے عبید کی وکالت کی، مگر اسے سختی سے اپنی بات پر جمے دیکھ کر وہ مشکوک ہوگئی۔ اسی وقت اندر جا کر عبید کو فون کرنے لگی، جب کہ باہر عدی اور بیدل اس کی پریشانی پر محظوظ ہو رہے تھے۔ بیلا نے افسوس سے دونوں کو دیکھا۔

''کتنی بری بات ہے بیدل! وہ اب عبید سے خواہ مخواہ لڑے گی۔'' اسے سارہ کی فکر تھی اور سارہ وہ تو واقعی اندر عبید سے فون پر لڑ رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن خالہ نے انہیں باہر لنچ کروایا اور ڈھیروں شاپنگ بھی ان کے نانا کرنے کے باوجود کروادی۔ وہاں سے واپسی پر بیدل ان کے سر ہوگیا کہ آرٹس کونسل میں ڈراما دیکھنے چلیں گے۔ سارہ تو فٹ سے راضی ہوگئی، مگر اس کی حیل و حجت وہ دونوں ناراض ہونے لگے تو اسے ماننے ہی بنی۔

ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر ان کی سیٹس ریزورڈ تھیں۔ اسے حیرت تو ہوئی، مگر چپ رہی۔ بیدل نے کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس لے لیے تھے۔ سارہ نے اسے بتایا کہ ایک سرپرائز اس کا منتظر ہے۔ وہ جانتی تھی کہ سارہ کو تجسس پھیلانے کی عادت ہے، سو وہ پرسکون بیٹھی اسٹیج پر سے پردہ اٹھنے کی منتظر تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ تو وہ پردہ تھا جو خود اس کی عقل و آنکھوں پر پڑا ہوا تھا۔ سارہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ایک سرپرائز واقعی ہی اس کا منتظر تھا۔ اسٹیج پر پرفارم کرتا عدی اور اس کے مقابل کردار نبھانے والی اس کی اپنی دانست میں اس کی ''محبت'' عائلہ، وہی ڈائیلاگز، جو اس نے خود ہی فرض کرلیے تھے کہ ان کے ہجر و محبت کا دکھ ہیں۔ بیدل بتا رہا تھا۔

''عدی بتا رہا تھا کہ کافی عرصے سے اس اسکرپٹ پر کام ہو رہا تھا۔ مقابلہ بہت سخت ہے اور انہیں ہر حال میں اسے جیتنا ہے۔''

اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

''اور یہ بے وقوف بیلا! ان کی پریکٹس کو ان کی محبت کا قصہ سمجھ بیٹھی تھی۔'' سارہ ہنستے ہوئے بیدل کو بتا رہی تھی۔

''یہ تو ہے ہی سادہ لوح۔'' بیدل کے لہجے میں نرمی تھی یا تمسخر۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ تو بس مجسمہ بنی یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''شکر ہے اس کے کہنے پر میں نے خالہ سے نہیں پوچھ لیا، ورنہ سوچو کتنی بے عزتی ہوتی۔ میں نے سمجھ داری سے پہلے عدی کو ٹٹولا۔ وہ خوب ہی دل کھول کر ہنسا کہ بھئی ساری باتیں اس بے وقوف نے خود ہی فرض کرلی ہیں، میں تو اب صرف انجوائے کر رہا ہوں۔ پھر اس نے مجھے بھی منع کردیا کہ بیلا کو حقیقت نہ بتاؤں، وہ خود ہی اس کا ڈراپ سین کردے گا۔'' سارہ نہ جانے اور بھی کیا کچھ سرگوشیوں میں بیدل کو بتا رہی تھی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے اپنے برابر بیٹھی اپنی بہن نما کزن کو دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کا چہرہ واضح نہیں نظر آ رہا تھا۔

''اچھا ہے جو یہ چہرہ اندھیرے میں ہی رہے۔'' خفت، دکھ، شرمندگی کیا کچھ نہیں تھا جو اس نے اس لمحے وہاں بیٹھے محسوس کیا۔ وہ ان لوگوں کے لیے محض ''انجوائے منٹ'' تھی۔ تفریح طبع کا ذریعہ۔ اس کی سادگی کو یہ لوگ اپنی تفریح کا ذریعہ بنا کر

مزے لے رہے تھے۔ عدی، عائلہ، سارہ اور نہ جانے ان کے کتنے دوستوں کو یہ بات ہنس ہنس کر بتائی گئی ہوگی۔ سب اسے اول درجے کی احمق سمجھ رہے ہوں گے۔ اس کا مذاق بنا رہے ہوں گے۔ اسے یوں لگا کہ یہ سارا ہال اس پر ہنس رہا ہو۔ اسٹیج پر پرفارم کرتے یہ بظاہر حسین چہرے اس کا تمسخر اڑا رہے ہوں۔ اس کا سر ایک دم سے دکھنے لگا تھا۔ یوں لگا جیسے ہال کی چھت اس پر آ گری ہو۔ سینے پر منوں ٹن بوجھ محسوس کرتے ہوئے اس نے بیدل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

''کیا ہوا بیلا؟'' اس کے ہاتھوں کی غیر معمولی ٹھنڈک نے بیدل کو چونکا دیا۔

''بیدل مجھے نکالو یہاں سے۔ مجھے گھر لے چلو۔'' اس کی تھرتھراتی آواز اور غیر معمولی ٹھنڈا پڑتا وجود بیدل کے ساتھ سارہ بھی پریشان ہوگئی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے بولا۔

''ریلیکس...... اٹھو۔'' بیدل نے ایک سے دوسری بات نہ کی اور اس لیے کھڑا ہوگیا۔ سارہ بھی ان کے پیچھے لپکی۔ واپسی کا سار راستہ وہ خاموش، خالی خالی نظروں سے آتے جاتے مناظروں کو دیکھتی رہی۔ بیدل نے ایک دو دفعہ اسے متوجہ کیا، مگر اس کی خاموشی دیکھ کر چپ ہوگیا اور سارہ...... وہ پشیمان ہوتی رہی۔ وہ سمجھ گئی کہ بیلا شدید ہرٹ ہوئی ہے۔ اس نے کئی بار کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے، مگر اس کا سرد رویہ دیکھ کر اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ گھر آ کر وہ سیدھا کمرے میں چلی گئی۔

''بیدل مجھے لگتا ہے یہ شدید ہرٹ ہوئی ہے۔ اس بات سے......'' سارہ کا شرمندہ اور فکر مند لہجہ بیدل گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

''ہوں' فی الوقت اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ کچھ مت کہو، نہ کوئی صفائی دو۔'' بیدل نے اسے سمجھایا تو وہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔

سارہ بہت خاموشی سے کمرے میں آئی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے اس نے ایک نظر گیلری میں کھڑی بیلا کو دیکھا۔ اس کا احساس ندامت بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ بیلا نے لائٹ نہیں جلائی تھی اور سارہ کے اندر ہمت نہ تھی۔ بیلا سامنے سڑک پار بنگلے کے لان میں جلتی فلڈ لائٹس کو دیکھ رہی تھی۔

''میں اتنا ہرٹ کیوں ہو رہی ہوں؟'' مجھے ان سب سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' اندر کی خاموشی ٹوٹی تو آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ''اگر وہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا تو اس میں میری ہی غلطی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ ان کی باتیں سن کر ان سے ہمدردی کرنے کی۔'' وہ خود سے الجھ رہی تھی۔

''اس نے خود سے تو دعوت نہیں دی تھی کہ...''

سرو قد درخت کی شاخوں سے چاندنی چھلک رہی تھی۔ مدھم چلتی ہوا جیسے اس پر ہنس رہی تھی۔ اسے کسی طرح چین نہیں آ رہا تھا۔ ''میں تو ہوں ہی بے وقوف۔'' سامنے سڑک پر ایک گاڑی تیزی سے ہارن بجاتے گزری تھی۔ بیلا نے دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے اور خود پر ہنسی۔ زخمی ہنسی۔

''مگر اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کم از کم میرے ساتھ۔'' وہ چونکی۔ ''میرے ساتھ۔'' اندر دل کے کونے میں راز بنا کر رکھی بات باہر آنے کو مچلنے لگی۔

''میں کوئی خاص تو نہیں ہوں۔'' ریلنگ پر جھکتے اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ ٹپ...... ایک آنسو نیچے گر کے غائب ہوگیا۔

''تم اس سے محبت کرنے لگی ہو بیلا بختیار۔'' راز طشت از بام ہوگیا۔ ٹپ ٹپ ٹپ آنسو تیزی سے گرنے لگے۔

''محبت...... نہیں اس جیسے شخص سے میں بھلا کیونکر محبت کرنے لگی، جو دوسروں کے احساسات سے کھیلتا ہو۔'' وہ مکر گئی۔

''تو پھر یہ آنسو...... یہ افسوس...... یہ صدمہ کیوں۔'' اندر جھگڑا ہونے لگا۔

''یہ تو اپنی بے عزتی کے احساس کے ہیں۔ وہ لڑکی اس کے دوست سب میرے پیچھے کتنا ہنسے ہوں گے۔ میں ان کی نظروں میں احمقوں کی ملکہ ہوں گی۔ اتنی بے توقیری۔ اتنی ذلت، مجھے تو یہ احساس مار رہا ہے۔'' وہ پرزور انداز میں تردید کرتی گئی۔

''اور یہ محبت بھی......'' اندر سے یہ آواز پھر اٹھی۔ اس دفعہ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ خود سے کیا لڑتی، جو دنیا سے لڑ سکتی نہ ہو۔ یہ ناممکن کیسے ممکن ہوا، کب ہوا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ ہاں محبت...... تب ہی تو دکھ بھی حد سے سوا ہو رہا تھا۔'' تھک کر اس نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ ''اور سارہ...... تم...... تم نے بھی مجھے حقیقت نہ بتائی۔ میرا مان توڑ دیا۔'' گلے بڑھنے لگے تھے۔

سارہ اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔ نیند تو اس سے بھی کوسوں دور تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر بیلا کو گلے لگا لے۔ اس سے معافی مانگ لے۔ مگر وہ صرف اسے دیکھ کر پشیمان ہوتی رہی۔ بیلا کئی گھنٹے خود سے لڑتی رہی۔ جنگ کرتی رہی۔ دور سے فجر کی اذان کی آواز آئی اور ساتھ میں عدی کی گاڑی کا ہارن بجا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے گاڑی کو دیکھا اور پھر اندر مڑ گئی۔

کمرے میں آ کر اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ رب کے آگے جھکنے سے اسے عجیب سا سکون ملا۔ نماز پڑھ کر اس نے پیکنگ شروع کر دی۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ اسے اب اس شخص کو کبھی نہیں دیکھنا تھا۔ محبت سے بڑھ کر اس کے لیے اپنی ذات کا غرور اہم تھا۔ اپنی عزت اہم تھی۔

بیدل کو نیند سے بے دار کر کے اس نے واپسی کا کہا، وہ بلا چوں چرا اٹھ کر تیار ہونے چل دیا۔ سارہ کی بھی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ اسے اس کا اس طرح سے جانا، اس کو یکسر نظر انداز کرنا غصہ دلا گیا۔

''تم آخر اس طرح کیوں کر رہی ہو بیلا؟ آخر ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے میں نے۔'' وہ خاموش ہی رہی۔

''بولو، ایسا کون سا جرم ہوگیا ہے مجھ سے۔ بس ایک غلط فہمی کو لے کر بے ضرر سا مذاق ہی تو کیا ہے نا عدی نے۔ مگر میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تم یوں بی ہیو کر رہی ہو۔ اگنور کر رہی ہو مجھے۔'' اس کی سوجی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ آخر میں التجا آمیز ہو کر، رندھ گیا۔

''بے ضرر مذاق۔ شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو، مجھ جیسی بے وقوف لڑکی جو تمہاری بیساکھیوں پر چلتی ہو اس کے جذبات، اس کی ذات تمہارے لیے مذاق ہی ہے۔'' اس کی چپ ٹوٹی تو اس کا لہجہ عجیب رنگ لیے ہوا تھا۔

''مگر اب نہیں۔ اب مجھے خود کو اور اپنی نظروں میں مت گراؤ۔ تم اگر نہیں جانا چاہ رہیں تو تمہیں کون مجبور کر رہا ہے، مگر میں اب اور نہیں رک سکتی۔'' اس کا سپاٹ لہجہ آخر میں فیصلہ کن ہوگیا۔

''جو دل کے زیادہ قریب ہوں، چوٹ بھی وہی شدید دیتے ہیں۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔'' وہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئی اور واش روم میں گھس گئی۔ خالہ کو بیدل نے ایمرجنسی کا بہانا بنا کر مطمئن کر دیا۔ ورنہ اس کی سوجی آنکھیں ان کو بہت کچھ پوچھنے پر اکسا رہی تھیں۔ عدی کے اٹھنے سے پہلے وہ لوگ نکل پڑے۔

نواب شاہ سے کراچی کا سفر جتنے خوش گوار موڈ میں کٹا تھا، واپسی کا اتنے ہی بوجھل دل سے۔ وہ بس اجنبیت سے بیٹھی رہی۔ ان کی واپسی گھر والوں کے لیے سرپرائز تھی۔ اماں، ابا سے مل کر نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے۔ اماں نے کئی دفعہ اس کے ستے چہرے کی وجہ پوچھی، مگر وہ طبیعت خرابی کا کہہ کر ٹال گئی۔ اسے کبھی خود کو چھپانا نہیں آیا اور اس کی یہ کمزوری اس کے لیے عذاب بنی تھی ہمیشہ ہی۔

زندگی جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ سارہ نے کئی دفعہ اپنی صفائی دینی چاہی، مگر وہ طرح دے گئی۔ وہ اب

کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس ڈیڑھ مہینے کو اپنی زندگی سے نکال پھینک دینا چاہتی تھی۔ وہاں سے وابستہ ہر یاد کو کھرچ دینا چاہتی تھی۔ مگر اس دل کا کیا کرتی۔ جو چوری چھپے اکثر اس کو یاد کر بیٹھتا تھا جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ایک چھوٹے سے شہر کی بے وقوف سی لڑکی اس سے محبت کر بیٹھی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ اب اسے ساری زندگی بھگتنا تھا۔

☆☆☆

گھر بھر میں شادی کا سماں شروع ہو چکا تھا۔ سارہ کی تاریخ تو پکی تھی۔ گھر میں ہی اس دن قرآن خوانی کروا کے باقاعدہ رسموں کا افتتاح کیا گیا۔ وہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، جب سارہ اس کے پاس آئی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تھی۔ سارہ نے سختی سے اس کا ہاتھ جکڑ لیا۔

''پلیز میری بات سن لو۔ یوں اجنبی نہ بنو۔'' وہ رو پڑی۔ بیلا نے اس کے بھل بھل آنسو دیکھے تو گہری سانس لے کے واپس بیٹھ گئی۔ اس کا کیا قصور تھا، غلطی تو اس کے اپنے دل کی تھی، اس نے جیسے لمحے بھر میں سوچ لیا۔

''یقین مانو میرا یا عدی کا مقصد تمہیں......''

''پلیز سارہ......!'' اس نے بظاہر نرمی سے ہاتھ چھڑایا، مگر اس کے لہجے کی سختی سارہ کو چپ کروا گئی۔ وہ اب یہ نام دوبارہ نہیں سننا چاہتی تھی۔

''اب پرانی کوئی بات مت کرنا۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔'' سارہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم مجھ سے ناراض ہو۔'' سارہ نے زور دے کر کہا۔

''پہلے تھی...... مگر اب نہیں۔ تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ بلکہ کسی کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ غلطی میری اپنی تھی۔'' اس کی آواز میں عجیب طرح کی اداسی اتر آئی، پھر اس نے سر جھٹک دیا۔

''اگر تم واقعی ناراض نہیں ہو تو پھر باہر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔ تایا ابو، تائی اماں سب ہی مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ تم دونوں میں کوئی ناراضی چل رہی ہے۔ جب سے دونوں کراچی سے آئی ہو، بات ہی نہیں کر رہیں۔ میں صفائیاں دیتے دیتے تھک گئی ہوں۔ پلیز...... تم آؤ باہر۔ اب تو یوں بھی میرے اس گھر میں چند دن ہی رہ گئے ہیں۔'' سارہ بظاہر بہت ہلکے پھلکے انداز میں بول رہی تھی، مگر اندر سے وہ اب بھی مطمئن نہ تھی۔ بیلا نے لمحہ بھر کر کچھ سوچا، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو......'' کئی دنوں کے بعد وہ بیلا کے ساتھ یوں لاؤنج میں آکر بیٹھی تھی۔ سب کزنز وہیں موجود تھے۔ بیدل نے تو خاصی خوشی سے ان دونوں کو اکٹھے دیکھا، پھر اپنے مخصوص انداز میں پھلجھڑیاں چھوڑ کر حاضرین محفل کو ہنساتا رہا۔ مگر بیلا بظاہر ان میں ہو کر بھی ان میں نہ تھی۔

☆☆☆

شادی کی رسومات، شروع ہونے والی تھیں، پورے گھر میں خوش گوار ہلچل سی تھی، بیدل اسے زبردستی ساتھ لے جا کر شاپنگ کروا لایا تھا۔ سارہ تو یوں بھی اب ''نظر بند'' ہو گئی تھی۔ گھر سے اس کا نکلنا مکمل بند ہو گیا تھا۔ بیدل اسے اور شہلا کو ساتھ لے کر گیا تھا۔ سارے راستے وہ بے چاری شہلا کو زچ کرتا رہا تھا۔ شہلا کی بے چارگی اور بیدل کے چٹکلے سن کر آج وہ کتنے دنوں کے بعد مسکرائی تھی، ورنہ مسکراہٹ تو جیسے اس سے روٹھ گئی تھی۔

گھر واپس آکر اس نے صرف چائے کا ایک کپ لیا۔ سارہ اس کی خریداری دیکھنے کے لیے آئی تو وہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ سارہ چند منٹ اس سے باتیں کرنے کے بعد چلی گئی۔ اس نے تکیے پر سر رکھ دیا۔ نیند جو کہ آمد ہی تھی، اب اس کا کوسوں دور نام و نشان تک نہ تھا۔

یہ کمرہ جو کہ وہ سارہ کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔ اب چند دنوں میں صرف اس کے وجود اور تنہائی سے آباد ہونے والا تھا۔ یہ خیال آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کو تکنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ کھڑکی تک آتی بوگن ویلیا کی بیل کو تکتے ایک دم اسے کراچی یاد آ گیا اور ساتھ میں وہ بھی۔

اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس وقت کے حالات پر اب وہ ذرا غور کرتی تو اسے عائلہ اور عدی کا رویہ نارمل لگ رہا تھا۔ اسے عائلہ کی آنکھوں کی وہ حیرت و استعجاب بھی اب یاد آ رہا تھا جب اس نے اسے عدی کی پرانی محبت سمجھا تھا۔

''کیا واقعی میں اتنی ہی احمق ہوں کہ سب کے لیے مجھے ''ڈھیل'' بنانا آسان ہے۔'' اس نے کچھ دل گرفتی سے سوچا۔

''اور عدی! آخر میں کیونکر اس سے محبت کر بیٹھی۔ اس کی بدتمیزیوں اور زچ کرنے کے باوجود۔ وہ کون سا لمحہ تھا جب یہ دل اس کا اسیر ہو چلا تھا اور محبت نے یہ خواری اور بے چارگی مقدر کر دی۔'' آنکھوں میں جمع ہوتے پانیوں کے باعث اسے باہر کا منظر دھندلا نظر آنے لگا۔ شام کی مخصوص گہما گہمی گھر میں شروع ہو چکی تھی۔ اسے باہر سے آتی آوازوں سے اندازہ ہو گیا۔

اس نے ہلکے سے پلٹ کر آنسوؤں کو صاف کرنا چاہا، جب کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ نظر اٹھا کر اس نے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا تو ساکت رہ گئی۔ یوں لگا جیسے آنکھوں کا دھوکا یا کوئی خواب ہو یا شاید اس کا پاگل پن۔ سامنے کھڑے وجود نے ایک چٹکی سی بجائی۔

''محترمہ ذہین صاحبہ! جاگ جائیں۔ یہ خواب نہیں، میں ہی ہوں عدی ہاشم۔'' وہی مخصوص آواز، وہی مسکراتا لہجہ۔ وہ جیسے ایک دم بے دار ہوئی۔ پہلے احساس تو شدید غصہ کا تھا جو ابھرا۔ اس نے سختی سے لب بھینچ کر آنکھوں کو رگڑا اور وہاں سے نکلنے لگی۔ مگر جتنی تیزی سے آگے بڑھی تھی اتنے ہی اطمینان سے اسے واپس کھینچ لیا گیا۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ اور آپ کو ہمت کیسے ہوئی میرا ہاتھ پکڑنے کی۔'' اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور غرائی۔ عدی نے کمال اطمینان سے اس کا ہاتھ چھوڑا، پھر اپنے مخصوص بے نیاز لہجے میں کہا۔

''ہمت کی تو مت ہی پوچھو تم اور محترمہ میں کوئی سارہ اور بیدل نہیں ہوں جو آپ کی خاموشی اور سرد مہری سے گھبرا کر راستہ بدل لوں۔ سو اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سنو اور اپنے خود ساختہ مفروضوں سے باہر آؤ۔'' بیلا کے اندر ایک شدید ذلت و بے بسی کا احساس اٹھا۔ یعنی کہ اب وہ میرے ہی گھر میں مجھ کو مجبور کرے گا کہ میں اس کے حکم پر چلوں، یہ خیال آتے ہی وہ چیخ پڑی۔

''آپ کو خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ ساری دُنیا آپ کے اشاروں پر چلے۔ آپ جو کہیں، وہ بجا لائے، آپ کا کہا سن لیں۔ عدی صاحب! وہ اور ہوتی ہوں گی جو آپ پر مرنے والیوں کی فہرست میں شامل ہو کر آپ کی ہر بات کو حکم درجہ دیتی ہوں، جائیں اور اپنی ان ہی تھرڈ کلاس فرینڈز پر یہ رعب جمائیں۔''

عدی نے اس کا غصے سے سرخ چہرہ اور آنسوؤں سے تر آنکھیں دیکھیں۔ اس نے اس لڑکی کو کبھی اتنی کھردری آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا اور نہ ہی بدتمیزی کرتے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت وہ جیسے اپنے اندر کی ساری تلخی، سارا غصہ نکال دینا چاہتی تھی۔ عدی نہ جانے کیوں مسکرایا اور اس کی یہ مسکراہٹ جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ بیلا نے بے بسی اور ذلت کی انتہا کو محسوس کرتے ہوئے ایک دم ہی بستر پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ سر جھکائے بے آواز رونے لگی۔ وہ کس پتھر سے محبت کر بیٹھی تھی۔ یہ احساس اسے مزید کچوکے لگانے لگا تھا۔ عدی نے سامنے پڑی چیئر کھینچی اور اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ کافی دیر یوں ہی خاموشی میں گزر گئی۔ بیلا نے دوپٹے سے آنکھوں کو خشک کیا، پھر ناک صاف کی۔ عدی پھر بھی خاموش ہی رہا۔

آخر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور کچھ کہنے

کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ چپ کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''اب بتاؤ، اتنا شدید اور بھرپور ری ایکشن کس لیے تھا۔'' اس کے سوال پر وہ نظریں چرانے لگی۔ دل کا یہ راز تو وہ خود سے بھی چھپاتی رہی تھی۔

''حالانکہ سب تمہارے جتنے عقل مند نہیں ہیں، مگر اب اتنے بھی اندھے نہیں کہ تمہارے ان آنسوؤں کے پیچھے چھپی اصل کہانی تک نہ پہنچ پائیں۔'' اس نے عدی کی بات پر اس کی طرف دیکھ کر کچھ سخت کہنا چاہا، مگر اس وقت اس کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اسے کچھ کہہ نہ پائی۔

''تم وہاں سے چلی آئیں۔ بغیر کچھ جانے، بغیر کچھ پوچھے۔ بے وقوف لڑکی! جب غصہ آئے تو نکال دینا چاہیے اور جب کوئی غلط فہمی ہو تو پوچھ لینا چاہیے۔ یوں بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگ جانا بغیر لڑے ہتھیار ڈال دینا، ویری بیڈ!'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ بیلا نے اب بھی نہ دیکھا۔

''لڑا وہاں جاتا ہے، جہاں اپنائیت کا کوئی رشتہ ہو۔ غیر سے کیا لڑنا، جو آپ کی عزت نفس کو کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا مگر الفاظ بہت سخت تھے۔ عدی کو تو یہ ہی لگا۔ وہ ایک دم ہی خاموش ہو کر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ بیلا اب بے چین ہونے لگی۔ اس کی سنجیدہ نظروں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے لگا جیسے اس نے شاید کچھ غلط کہہ دیا ہے۔

''حالانکہ میں نے تمہاری بے خبری کو انجوائے کیا تھا، مگر ایک بات اچھی طرح سن لو بیلا۔ عدی ہاشم اپنے رشتوں اور رویوں کو لے کر بہت پوزیسیو ہے۔ میں نے نوجوانی کا ایک عرصہ باہر گزارا ضرور ہے، مگر میرے اپنے کچھ اصول ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔'' طویل خاموشی کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ انتہائی سخت تھا۔

''خود سے منسلک رشتوں اور لوگوں کو کبھی گروپ ڈسکشن نہیں بنانا چاہیے وہ رشتہ جس روپ میں بھی ہو۔ دوستوں میں بیٹھ کر رشتوں کو دھوئیں کے مرغولوں میں اڑانا، یہ میرے جیسا بندہ نہیں کرتا اور تم سے تو میرا رشتہ ایسا تھا کہ میں کسی اور کے سامنے تمہاری ذات کو کیسے تفریح بنا لیتا۔'' وہ جو بظاہر بیگانگی سے اسے سن رہی تھی، ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بہت سنجیدگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا کہنا چاہتا تھا، اسے بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اس کے دل کا راز عیاں نہ ہو جائے۔ اسے دھڑکا لگ گیا۔

''عائلہ میری بچپن کی فرینڈ ہے، میں نے یہ بات اس سے بھی شیئر نہیں کی تھی، مگر تمہارے لیے میرے احساسات وہ خود ہی جان گئی تھی۔ سو اس کے پوچھنے پر میں نے اعتراف کرنے کے ساتھ اسے یہ بات بقیہ دوستوں کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔ تم میرے لیے ایک پاکیزہ رشتہ تھیں، نہ کہ محض انجوائے منٹ اور میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں اپنے رشتوں کے بارے میں بہت پوزیسو ہوں۔'' وہ ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جو بات وہ خود سے کہنے سے کتراتی تھی وہ کتنے آرام سے اس کا اعتراف کر رہا تھا۔

''سارہ سے ان دنوں میں مکمل رابطے میں تھا۔ تمہارے اتنے سخت اور شدید ردعمل نے تمہارا پول سارہ اور بیدل کے سامنے کھول دیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ بات صرف اتنی نہیں جتنی تم ظاہر کر رہی تھیں، بلکہ معاملہ تو اس محبت کا تھا جو یہ چوٹ سہہ نہیں پا رہی تھی۔'' وہ درست کہہ رہا تھا بیلا کو لگا جیسے وہ سرعام بے نقاب ہو گئی ہو۔ وہ اپنے دفاع میں کمزور لہجے میں بولی۔

''جی نہیں مجھے کوئی محبت نہیں۔'' اس کے خفت سے سرخ پڑتے چہرے کو جھک کر دیکھتے ہوئے عدی ہنس پڑا۔

''اچھا چلو مان لیا کہ تمہیں کوئی محبت وحبت نہیں حالانکہ یہ ماننے والی بات نہیں کہ مجھ جیسے

ہینڈسم اور ڈیشنگ بندے سے کوئی متاثر ہو کر محبت نہ کر بیٹھے، لیکن پھر تمہارا ایک دم سے واپس آ جانا، چپ چپ رہنا، پیار سے بات نہ کرنا، روتی صورت بنا کر رکھنا اور تو اور اس بات پر کڑھنا کہ میں نے اپنے دوستوں کے سامنے تمہیں کن کن القابات سے یاد کیا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ تو یہ سب کیا ہے محترمہ۔''

یہ ساری رپورٹس یقیناً سارہ نے ہی اسے دی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کہیں غائب ہو جائے۔ اس کی مسکراتی نظروں کا سامنا اس وقت اسے دنیا کا سب سے مشکل کام لگ رہا تھا۔ گلے جیسے دم توڑ گئے۔

''وہ تو میں...... بس...... یوں ہی......'' اس سے بات ہی نہ بن پائی۔

''جانتا ہوں محترمہ یوں ہی بس...... میں ہی سارے کام کر جاتی ہیں جیسے مجھ جیسے بندے کو اتنے دنوں سے ماما کی بہت ڈانٹ پڑوا رہی ہیں۔''

''میں نے کب......'' اس نے اس کی طرف دیکھ کر بولنا چاہا مگر اس کی چمکتی آنکھوں سے گھبرا کر چپ ہو گئی۔ دل پر رکھا بوجھ جیسے اتر سا گیا تھا۔ چند جملوں کی مسیحائی نے اس کے جلتے زخم ٹھنڈے کر دیے تھے۔

''ماما نے اتنے دنوں سے میرے کان کھا لیے تھے کہ تم نے ایسا کیا کیا ہے کہ بچی جاتے وقت بے حال سی تھی۔ آنٹی سویٹ انہیں یقین دلا دلا کر میں خود بے یقین سا ہو گیا تھا جیسے واقعی میں نے کوئی بڑا جرم کر دیا ہو۔ اب آنٹی ہیں میرے ساتھ۔ میں نے انہیں کہہ دیا ہے مجھے اس بے وقوف لڑکی کو اپنی شاگردی میں رکھنا ہے تاکہ مزید حماقتوں سے بچ سکے سو پکا بندوبست کریں۔''

وہ نا سمجھی سے اس کی بات سن رہی تھی مگر جب بات سمجھ میں آئی تو چہرے پر بے تحاشا سرخی چھانے لگی۔

''یاد رکھنا، عدی ہاشم اتنا کمزور اور سطحی نہیں کہ ایک لڑکی وہ بھی جو اس کی محبت ہو، اسے سرعام تفریح کا ذریعہ بنائے، میں مغرب میں رہا ضرور ہوں مگر اندر سے ٹیپیکل مشرقی مرد ہوں۔''

''اور اسی بات پر تالیاں۔''

سارہ اندر آتے ہوئے بولی۔ دونوں نے مڑ کر اسے دیکھا جو اتنے دنوں بعد فریش نظر آ رہی تھی۔

''محترم عدی ہاشم ٹیپیکل مشرقی مرد اس وقت آپ کو یاد فرمایا جا رہا ہے جو مشرقی تمام روایات کو بھلائے اپنی ہونے والی منگیتر سے گپیں لڑا رہا ہے۔ آئیے۔'' سارہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں طنز کیا عدی مسکراتے ہوئے اٹھا پھر اس کی طرف پلٹا اور جیسے وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

''باقاعدہ اجازت لے کر آیا ہوں سو یہ اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔'' اس کی نرم نگاہوں سے بیلا گھبرا رہی تھی۔

''چلیں پھر آپ کا ٹائم ختم'' سارہ نے اسے دھکیلا اور پھر بیلا کی طرف پلٹی۔

''بیلا تم بھی اب اپنی روتی صورت درست کر کے ڈرائنگ روم میں آ جاؤ، تائی اماں بلا رہی ہیں۔'' وہ ویسے ہی بے تکلفی سے بول رہی تھی یوں لگ رہا تھا کہ درمیان میں وہ وقت آیا ہی نہ ہو۔ بیلا نے مسکراتے ہوئے آسمان کو شکر گزاری سے دیکھا اور پھر جاتے ان دونفوس کو جو کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے عین اسی وقت عدی نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

اس کی جگمگاتی آنکھوں میں جھانکتے وہ بھی تیار ہوتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر کی اداسی جیسے پل بھر میں ختم ہو گئی تھی۔ محبت کرنے پر وہ بھی عدی سے کرنے پر اب اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا کہ وہ ایک خالص انسان تھا۔

☆☆

شمائلہ دلعباد

اے جذبۂ دل

بات کوئی نئی نہ تھی مگر اتنی پرانی بھی نہیں تھی کہ اسے سب بھول جاتا اسے اپنے سفر کی داستان کا حرف حرف، موڑ موڑ اور عارضی پڑاؤ سے لے کر مستقل ٹھکانے تک کا ہر ہر لمحہ من وعن یاد تھا۔ وہ بھول نہیں سکتا تھا وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ جب اس کے ہاتھوں میں اس کی اماں کی گھڑی ہوئی اینٹ بھٹے سے پک کر اس کے ہاتھ میں آئی تو خود بول پڑی مجھے تیری ماں نے بنایا ہے۔ سب حیران ہوئے تین سال کا بچہ بھٹے پر کام کرنے والے سیکڑوں لوگوں کی بنائی ہوئی اینٹوں کی الگ الگ شناخت کردیتا یہ چاچے فیقے نے بنائی۔ یہ ماسی تارا نے۔ وہ ماما گاموں نے، یہ ابا نے اور وہ اماں نے سب حیرت زدہ رہ جاتے ایک جیسے سانچے سے نکلی ہوئی اینٹیں اور اس پر پک جانے کے بعد بدلی ہوئی ہیئت بھی اسے مخمصے میں نہ ڈالتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مزدور خاندان کے علاوہ بھٹے کی انتظامیہ نے قبول کرلیا کہ جیرے کا لڑکا اینٹوں کی بڑی شناخت رکھتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں بھٹے کی چنائی کرنے والا وہ ''عباسی بھٹا'' کا سب سے کم عمر ''چناوا'' تھا۔ اینٹیں پتے کی نسبت چنائی کرنے والے کو اجرت زیادہ دی جاتی تھی سو اس اجرت کا فائدہ اٹھا کر گھر میں بکری کے علاوہ بھینس کا بھی آدھا سیر دودھ آنے لگا۔ اب سب اپنی اپنی پیالی میں چائے ڈال کر چائے پاپے کا ناشتا کرنے لگے۔

نوردین کو پکا یاد تو نہیں تھا پھر بھی اسے لگتا تھا یہی وقت تھا جب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھٹا مزدور نہیں بنے گا وہ راج گیر بنے گا زیادہ پیسے کمائے گا پھر سب ہر جمعرات کو بوٹیاں کھایا کریں گے۔ تب ذہن کی رسائی جہاں تک تھی اسی کے مطابق اس نے خود کو موڑ لیا محض دو سال بعد اینٹوں کی طرح دیواریں بھی اس سے باتیں کرنے لگیں۔

☆☆☆

وہ جون کی آگ اگلتی دوپہر تھی فضا میں بھٹے کی تپش نے دھوپ کے ساتھ مل کر جہنم کا سا سماں بنا رکھا تھا جنوبی پنجاب اور اس میں بھی ملتان گرمی کے حوالے سے خاصی بدنام شہرت رکھتا ہے۔ نواح میں موجود ''عباسی بھٹا'' پر ایک اور مظلوم غریبی کا اضافہ ہوا تھا۔ نئے خاندان نے جانے کتنے ہزار کے عوض خود کو مالکان کے پاس گروی رکھا تھا۔ خیر بات چل رہی تھی دوپہر کی تو دوپہر تک نئے آنے والوں کے لیے بنایا جانے والا کوٹھا (کمرہ) قریب الاختتام ہوچکا تھا۔ نوردین صبح، 'دوپہر' شام و رات اس کا معائنہ کرتا رہا تھا۔ سر پر ماں کے پھٹے ہوئے آنچل کو گیلا کر کے باندھے اپنی سیاہ رنگت پر سیاہ ہی بے پناہ چمکیلی آنکھوں سے وہ دیواروں کو تکتا ہوا مستری رب نواز سے مخاطب تھا۔

''چاچا کوٹھے کی کند (دیوار) ڈنگی ہے۔''

''چل اوجمہورے پھٹ ادھر سے...... کند ڈنگی کا لگتا نہ ہو تو...... منہ ویکھ تک صاف نہیں کرنی آتی چلا ہے مستری رب نواز کو بتانے کند ڈنگی ہے۔'' رب نواز نے منہ ٹیڑھا کر کے اس کی نقل اتار کر بھگا دیا۔ اور پھر دو بارشیں بھی برداشت نہ کرسکی اور دیوار پھٹ گئی۔ بنیادیں غلط باندھ دی جائیں تو دیواریں گر ہی جایا کرتی تھیں بارش کا بہانہ محض پردہ داری ہوتا ہے۔

''ابا مستریوں کے پاس زیادہ پیسے ہوتے ہیں؟'' وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا بھٹے کے تہہ خانے میں باپ بیٹا دھڑا دھڑ پکی اینٹوں کو چنتے جارہے تھے۔ آرڈر بہت بڑا تھا مالکان کے حکم پر کھیپ پر کھیپ ڈالی جارہی تھی۔ فضا میں کچرا، شاپر، ربڑ اور جانے کیا کیا الا بلا کا دھواں و باس پھیلی تھی۔

''جھلا نہ ہو تو مستری بھی ہماری طرح محنت کرتے ہیں تو ہی چار پیسے آتے ہیں۔'' ابا بری طرح کھانس رہا تھا۔

''نہیں ابا وہ محنت کر کے ہم سے زیادہ پیسے کماتے ہیں۔''

وہ انگلیوں پر حساب لگا رہا تھا کہ بھٹے کے آس پاس میلوں تک اسکول نہ تھا لیکن وہاں رہنے والے بچے اسی کی طرح انگلیوں پر کیلکولیٹر جیسا حساب کرلیا



کرتے تھے۔

''ہاں پتر یہ تو ہے پیسے بھی زیادہ اور ہماری طرح بیماری بھی مفت میں نہیں ملتی۔'' ربڑ اور شاپروں کی بو، دھواں اور کثافت ابے کو زیادہ ہی پریشان کرنے لگتی تھی۔

''ابا میں مستری بنوں گا۔'' اس نے اعلان کردیا۔

☆☆☆

نذیر احمد عرف جیرا کے پھیپھڑے ختم شد تھے وہ بونس جینے کی طرف کم ہی آتا نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ کثافتوں سے بچو، وہ بھلا کیسے بچتا اب تو اس کے چھ بچے بھی کثافتیں ہی کھا پی رہے تھے۔ جب سے لکڑی مہنگی ہوئی تھی بھٹا مالکان نے دیہاتوں سے کچرا سستا داموں خرید کر بھٹے میں ڈالنا شروع کردیا تھا۔ اس کچرے میں ٹائروں سے لے کر پلاسٹک تک موجود ہوتا تھا نتیجتاً بچے اور بوڑھوں کے ساتھ جوان جہان عورتیں اور مرد بھی متاثر ہو رہے تھے چوبیس گھنٹے اسی فضا میں رہنے کے بعد بھی اگر کوئی صحت مند مزدور تھا تو بلاشبہ خوش قسمت تھا۔ بلآخر ''عباسی بھٹا'' کی کوٹھڑی نمبر تین میں جیرے کی عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا مستری رب نواز نے مرتے ہوئے جیرے کی خواہش کا احترام کرتے نوردین کو اپنے ساتھ رکھنے کا وعدہ کرلیا۔ سب خوش ہوگئے کہ نورا اب مستری بنے گا اور شاید اسی خوشی میں ابا اسی شام مرگیا ہمیشہ کے لیے ہی مرگیا۔

نورا، مستری بننے کے خواب کی تکمیل کی طرف بڑھ کر پہلے اسٹیپ یعنی سیمنٹ بنانے کی طرف جانا ہی چاہتا تھا کہ بھٹا مالکان نے اسے بڑا بیٹا ہونے کے ناتے دفتر میں بلا کر بتادیا کہ جیرا اتنے پیسوں کا مقروض ہے اور ابھی تو اس کی آنے والی نسلوں کو بھی عباسی اینٹیں ہی بنانی ہیں۔ اینٹیں شور کرتی رہیں دیواریں اسے سرگوشیوں میں اپنے پاس بلاتی رہیں۔ وہ بھٹا پر کام کرنے والے گدھے کی طرح کان ہلاتا بھٹے کے اندر چنائی کرتا رہا۔ اسے لگتا زمانے بیتتے جارہے ہیں۔ دیواروں کی سرگوشیاں بلند آواز میں ڈھل کر اسے پاس نہ آنے کے طعنے دینے لگی ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ نوردین طعنوں سے غیرت کھا گیا جب خیر دین نے پہلے دن چنائی کی تو وہ ماں سمیت سب کو خیرو کے حوالے کرکے بہت سی امید دلا کر، جلد ہی پیسے بھیجنے اور ان کو پاس بلانے کے وعدے کرکے وہ فرار ہوگیا۔ نورا جمہورا بھٹے سے چپکے سے نکل گیا۔

نیو خان کوچ کے کنڈیکٹر سے دو، تین بار کان تڑوا کر بغیر کرایے کے اسے ملتان جانے کی اجازت مل گئی۔ کھڑے ہو کر شل ہوئی ٹانگوں نے فٹ پاتھ پر اسے اینٹوں پر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ اینٹیں جو اس کی پیدائشی سنگی تھیں۔ جو غم خوار تھیں۔ غم شناس تھیں۔

☆☆☆

چودہ سالہ نوردین سوکھا چمرخ، کالا کلوٹا اور بے کشش چہرہ رکھنے والا تو عمر بچہ اس بری طرح جسمانی استحصال کا شکار ہوا تھا کہ سدھ بدھ نہ رہی تھی اگر جو حسین ہوتا تو شاید مرہی جاتا۔ دوسری رات آنے سے پہلے پہلے اس نے لاری اڈا چھوڑ دیا۔ رکشے والے نے دس کا نوٹ پکڑ کر اسے میڈیکل اسٹور کے سامنے چھوڑا اور دھواں اڑاتا غائب ہوگیا۔

ڈبل روٹی چائے اور پیراسٹامول کھانے کے بعد وہ سفید داڑھی والے بزرگ کو اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

''برخوردار نوردین ابھی تو بہت چھوٹے ہو اس لیے ابھی مستری بننے کو چھوڑو اور ایسا کرو وہ سامنے والے ہوٹل کی صفائی ستھرائی کیا کرو کھانا بھی ملے گا، رہائش بھی اور تھوڑے بہت پیسے بھی دے دیا کرے گا۔ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''میں رات کو ادھر رک جایا کروں بابا جی......؟'' وہ کف سے ناک رگڑ رہا تھا گزری رات کی ڈراؤنی پرچھائیاں اسے فق کرگئیں۔

''فکر نہ کرو بیٹا! حاجی صاحب بڑے نیک آدمی ہیں ادھر کون سی جگہ ہے کہ وہاں آسانی سے لیٹ سکو گے۔ کھانے پینے کی مشکل نہ ہوگی، چلو میں لے کر چلتا ہوں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے ساتھ ہولیا تھا۔ ''حاجی صاحب اور میں نے اکٹھے حج کیا تھا۔ محلہ بھی ایک ہی ہے بلکہ سمجھو گھر بھی ایک ہی ہے تمہیں کوئی تنگی نہ ہوگی۔''

دیگچے، دیگچیاں دھوتے اس کے ہاتھ مٹی گارے کو ترستے رہے۔ لیکن وہ دھوتا رہا۔ پیسے بھیجتا رہا۔ اماں کے ساتھ بہن بھی آکر مل جاتی وہ سارا دن بہاؤالدین ذکریا کے مزار پر بیٹھ کر ان سے اینٹوں کی مٹی کی باتیں کرکے مستقبل کی سنہری تصویریں بنایا کرتا۔ اسے لگتا زندگی بس اسی ایک دن سانس لیتی ہے۔ گزرتا وقت اسے کوٹھا بنانا تو نہ سکھا سکا اسے کڑاہی بنانی سکھا گیا وہ سینئر ہوتا جارہا تھا اس لیے باورچی کا عہدہ بھی کبھی کبھی نبھانا پڑ جاتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے دو دکانوں کو ملا کر بنائے گئے ہوٹل کے عین سامنے بلڈنگ بننے لگی۔ وہ سارا سارا دن وہاں ہوتے کام کو تکتا رہتا۔ وہ کڑاہی بنانی تو کیا میز صاف کرنا بھی بھول گیا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بنیادیں دیکھنے جانے لگا دیواروں کی ساخت سے پیمائش تک، فرش سے لے کر چھتیں تک اس نے اپنی ''پوروں'' میں بسا ڈالیں۔

پھر اس نے ہوٹل کے مالک سے معذرت کرلی اور ٹھیکیدار کی منت کرلی ہزار با، منتوں اور دو چار جاننے والوں کی سفارش کے بعد اسے مزدور رکھ لیا گیا۔ مزدوروں کی بھی ٹولیاں تھیں جو بس اپنے بندوں کو ہی رکھا کرتی تھیں۔ وہ اب حیران نہیں ہوتا تھا اسے پتا تھا ہر جگہ خیانت ہے ہر جگہ کرپشن ہے۔

ہفتہ بھر میں ہی اسے مسالے (سیمنٹ، ریتی وغیرہ کا مرقع) کے اسرار ورموز سمجھ آگئے۔ اور پھر اگلے ہی ہفتے اسے سڑکیں، فلائی اوور اور پل ٹوٹنے کی وجوہات سمجھ آگئیں اوپری سطح سے لے کر آخری حصے تک رواروی سے بدیانتی میں ملوث تھے۔ حتیٰ کہ بل کلیئر نہ ہونے کا غصہ بھی انہی غریب مزدوروں پر نکالا جاتا۔ اجرت روک دی جاتی کام چلتے رہا کرتے۔ پیٹ بھی نہ بڑا پاپی ہے اور جب یہ پیٹ اپنا نہیں اپنی اولاد کا ہو تو پھر تو سمجھو خاص الخاص پاپی، مہا پاپی۔ چنانچہ وہ اپنے بچوں کے پیٹ کی خاطر چپ چاپ ہدایات پر عمل کیے جاتے رہتے۔ سیمنٹ ملاتے ملاتے وہ خود بھر بھری مٹی ہوجایا کرتے، ایسی بدقسمت مٹی جو فقط پیروں تلے ہی روندی جاتی۔

☆☆☆

تب میں بھی کیسا پاگل ہوا کرتا تھا لبوں کی تراش میں پھیکی افسردہ مسکراہٹ جھلکی، یوں لگا آنکھیں بھی چھلک جائیں گی پانچ ہزار سے زائد افراد پر مشتمل کمپنی ساری کی ساری موجود تھی۔ وی آئی پیز کے لیے ریڈ کارپٹ ڈال کر اسپیشل طرز کی کرسیاں تھیں باقی تقریب عربوں کے رواج کے مطابق کھلے میں ہی رکھی گئی تھی۔ ایک طرف تاحد نگاہ پھیلا نیلگوں سمندر تو دوسری طرف بنے لگژری ولاز جن میں عربوں کے طرز تعمیر کو قدیم مشرقی طرز تعمیر میں ضم کرکے عجب شاہانہ رنگ دے دیا گیا تھا درمیان میں ہلکی سنہری سمندری ریت پر نصب قدیم عرب کی مشعلیں جو چل بجلی سے رہی تھیں روپ آگ کا اختیار کیے بیٹھی تھیں۔ ایسی ہی ایک مشعل کے پاس وہ میرون مخملی کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ کاش میں نے یہ پروجیکٹ اتنا کھل کر ڈسکس نہ کیا ہوتا تو کاش میں کسی پاکستانی انجینئر سے ڈسکس کرلیتا تو آج کیا پتا صورت حال مختلف ہوتی۔ سامنے شیام لال گجراتی کو شستہ انگلش میں میزبانی کرتے دیکھ کر خیالات دماغ سے ٹرین کی طرح گزر رہے تھے۔

میں نے ایک لاکھ ماہانہ ٹھکرا کر غلطی تو نہیں کرڈالی۔ پاکستانی تو مجھے تین ہزار دینے کے روادار نہیں۔'' شام بھیگتی رہی وہ سوچتا رہا جھک کر مٹھی میں سنہری ریت بھر کر ہاتھ کھول لیا۔ ہتھیلی کی استطاعت جتنی ریت کی خوشبو اس کی ہتھیلی سے ناک تک کا سفر کرتی اندر اترتی رہی۔ بارودی پہرے ٹرین کی پٹری

کی طرز پر بنائی گئی پٹریوں پر اشیائے خوردونوش سے بھری ٹرالیاں با آسانی چلا چلا کر سب کو سرو کرتے رہے۔ اسی فیصد مشرقی (ستر فیصد انڈین اور دس فیصد پاکستانی) لیبر اپنے اپنے ملکوں میں کھانے پر بدتہذیبی سے ٹوٹنے پڑنے والی شہرت رکھنے والی عوام کے برعکس نہایت شرافت تہذیب سے ٹرالیاں پاس آنے پر شکم سیری کی اشیاء لیتی رہی۔ وہ ریت میں روشن ستارے تکتا رہا شیام الال نظامت کرتا رہا۔

☆☆☆

''تو ساری زندگی بھوکا مرے گا میری بات لکھ لے''۔ چاچا فیض بھرا بیٹھا تھا۔

''چاچا مجھ سے دونمبری نہیں ہوتی کوئی انی وی (انیس بیس) کی گل ہوتو پھر بھی وہ تو ساری کی ساری دونمبری ہے۔''

دیکھ نورے میں تجھے آخری بار سمجھا رہا ہوں اس طرح کم نہیں سیکھے جاتے اور نہ وڈا امیر آدمی بنا جاتا۔ ٹک کر کسی کے ساتھ لگا رہے گا تو چار لوگوں سے واقفیت ہوگی تو نے تو پانچ سالوں میں دس ٹھیکیدار بدل لیے۔ اب تو سب تیری کرتوت سے واقف ہوگئے ہیں۔ کوئی نہیں رکھے گا تجھے۔ ایسا کر اپنی چیزیں خرید لے اور اپنا کام شروع کردے۔''

''ہاہا۔'' اس نے چھت پھاڑ قہقہہ لگایا ''سترہ سو روپیہ جیب میں ہے تو راج گیری کا سامان خریدنے کی بات کررہا ہے۔''

''ایسا کرتے ہیں......'' چاچا فیض نے اتنا ہی کہا تھا نورا بول پڑا۔

''چاچا مجھے معافی مانگنے اور ترلے کرنے کا نہ کہہ دینا۔''

''آہو پتا ہے مجھے اب تیرے گھر والوں کو روز تازی روٹی پانی ملنے لگا ہے تو نہ بھی پیسے بھیجے گا تو ان کا گزارہ ہورہا ہے اس لیے، تو ترلہ نہیں کرے گا۔

میرے بہنوئی کا بھائی مسقط سے آیا ہے پیسے لے کر اس نے اپنے مکان بنانے ہیں، اگر تو کہے تو تجھے ٹھیکیدار اور کاریگر بنا کر کام پکڑ لیتا ہوں۔ دو ہفتوں بعد ہی نوردین ملتان کے نواحی دیہات میں فیض کی ہیلپری سنگ اس کے رشتے دار کے گھر کی بنیادیں رکھ رہا تھا۔ وہ مکان بناتا گیا مٹی واینٹوں کی خوشبوؤں میں بھرتا گیا اپنے کام سے وہ کہیں بھی کسی طور پر پہلی دفعہ کام کرنے والا ظاہر نہ ہوا۔ صابر اس کی مہارت پر عش عش کر اٹھا'' وہ خود مسقط میں کنسٹرکشن کمپنی کا کارکن تھا۔ وہ تعمیر کے سارے رموز و اوقاف سے اچھی طرح واقف تھا اسے یہ جوان بہت آگے جاتا نظر آیا۔

''نوردین تم مسقط کیوں نہیں چلے جاتے؟ ادھر پاکستان میں اتنا ساری زندگی نہ کما سکوگے جتنا ادھر سالوں میں کما لوگے۔''

صابر نہایت خوش اور پرجوش تھا نورے نے اس کے مکانوں کے مختص بجٹ میں سے سوا لاکھ کی بچت کروائی تھی اور مکان کی مضبوطی دیکھنے والی آنکھ با آسانی محسوس کررہی تھی۔ چنانچہ اس نے نورے کو عمان کے ویزے کی آفر کردی۔ آدھے ادھورے پیسے لے کر اور باقی عمان پہنچ کے کما کردینے کے وعدے پر صابر نے اسے ویزا مہیا کردیا۔

☆☆☆

مسقط الگ ہی دنیا تھی وہ میدانی علاقے کا باسی جبکہ یہاں ریتیلی سمندری ہوائیں نمی سی بھری بوجھل، بارگراں اپنوں کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔

پاکستان اور یہاں کے کام میں زمین آسمان کا فرق تھا وہ بھلے مزدور تھا لیکن وہ فطری معمار تھا محض چھ ماہ میں وہ سب سمجھ گیا تھا۔ صابر عمان آکر بہت بے صبرا نکلا، پائی پائی وصولنے کے لیے وہ رات سے دن نکلنے کا انتظار بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ پیسے وصولنے کے بعد اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں رہائش اور کام ڈھونڈنے کی الگ داستان امیر حمزہ بنی۔

وہ چار سال زندگی کے سب سے بڑے معلم تھے یا اسے ہی لگا کرتے تھے۔ زندگی نے اس سے سادگی چھین کر بڑا سمجھ دار نفع نقصان پرکھنے والا بنا دیا

تھا۔ (اپنی دانست میں) فرفر انگریزی بولتے انجینئرز بنا مطلب کے تو پاس کھڑے بھی نہ ہونے دیتے تو اس کے مشورے اور سوچیں سننا تو بڑی دور کی بات وہ فورمین سے کہتا۔

اس شاپ کو ایسے کرلیں تو ایسا ہوگا اس بلڈنگ میں ایسے کریں تو کام بھی جلدی ختم ہوگا، بجٹ بھی تھوڑا اور مضبوطی بھی زیادہ ہوگی۔ فورمین اسے جھڑک کر بلاکس اور مٹی کے مکسچر کی طرف متوجہ کردیتا۔

''جا کم کر اپنا، آیا بڑا آرکیٹیکچر۔ ڈرائنگ کی اے، بی، سی کا پتا نہیں کوئی الٹی رکھ دے تو پہچان نہ سکو چلے آتے ہو مشورہ دینے۔''

وہ پھر بھی عجیب سرپھرا، اپنی منزل سے ایک انچ بھی قریب نہ ہوکر اپنے بلڈر بننے کے خواب سے ایک سینٹی میٹر بھی پیچھے نہ ہٹا۔ اس کے سامنے گڑھے کھودے جاتے رہے، بنیادیں رکھی جاتی رہیں۔ ہیکل بنتے رہے مکمل ہوکر عمارتیں ہینڈ اوور کی جاتی رہیں۔ وہ ڈانگری (کمپنی کی وردی) میں ملبوث تھا اسی میں رہا۔

☆☆☆

نورا بلاکس کا بنڈل بنا رہا تھا کرین نے اٹھا کر بنڈل کو اوپر پہنچانا تھا۔ انجینئرز کا گروپ اس کے بائیں طرف کھڑا بلڈنگ کے بارے میں باتیں کررہا تھا۔ اس کے کان لامحالہ کھڑے ہوگئے وہ وہ فیثا غورث سے لے کر پائی تک والے فارمولے لگارہے تھے گریویٹی لا سے لے کر کمپاس تک، بلڈنگ لوڈ سے میٹریل تک فارمولوں میں ڈسکس کررہے تھے نورے نے زندگی میں اسکول کا منہ دیکھا تھا فارمولے کہاں سے جانتا یہ تو فقط دیواریں اس سے باتیں کرتی تھیں در بولتے تھے جو اس کا نام اپنے اوپر لکھوانا چاہتے تھے۔ بالآخر اس نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔

کانپتے ہاتھوں سے اس شفری شیخ کا نمبر ملایا بیل جاتی رہی تیسری گھنٹی پر اسے ہیلو سنائی دی۔

''شیخ میں تیری دس منزلہ بلڈنگ کو آٹھ منزلے کے بجٹ میں تعمیر کرواسکتا ہوں۔ میٹریل سے لے کر مضبوطی تک مثالی ہوگی''۔ چڑھے ہوئے تنفس کے ساتھ اٹکتی ہوئی عربی میں وہ گھٹی گھٹی آواز سے بولتا وہ رہائشی کمرے سے کچھ اور دور ہوا۔

اگلی شام وہ اور شفری شیخ ساحلی پٹی پر بنے کافی ہاؤس کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ آتی جاتی لہروں کی روانی نے نوردین کے دماغ پر بڑا مثبت اثر ڈالا تھا وہ اس موقع پر سے فائدہ اٹھانے کے لیے سر توڑ کوشش کرنے لگا۔ شیخ حمودین نفیس الشفری کا یوں ایک مزدور سے ملنا بہت بڑا واقعہ تھا نورے کو لگا قسمت ساتھ دے رہی ہے۔ مہندس (انجینئر) کی ڈگری ہے تمہارے پاس......؟

''نہیں......نورا تھوڑا سا گھبرا گیا۔

''ڈپلومہ......؟''

''نہیں......'' نورا مایوس ہوگیا۔

نہ مہندس ہو نہ ڈپلومہ ہے نہ تجربہ پھر بھی دس منزلہ عمارت کی لاگت کم کرنے کی بات کرتے ہو۔''

نورے کو سمجھ نہ میں نہیں آیا کہ کیا بولے۔ شیخ اٹھ کر کھڑا نورا بھی کھڑا ہوگیا شیخ نے اپنے بے داغ داشے میں سے ایک کارڈ برآمد کیا کھڑے کھڑے عربی کے دو لفظ لکھے اور کارڈ نورے کے ہاتھ میں دیا۔

''ابھی کے ابھی کمپنی میں چلے جاؤ، باقی باتیں کل وہاں انجینئرز کے گروہ کے سامنے ہوں گی۔''

یہ پہلا موقع تھا جب وہ بھی اپنا سب سے اچھا لباس پہنے انجینئرز کی کے میز پر ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شفری شیخ کی زیرنگرانی ہونے والی اس تین گھنٹے کی میٹنگ میں جہاں انجینئرز نے اس کی کچھ باتیں قابل عمل قرار دیں وہیں اسے بے تحاشا علم ملا۔ پھر پروجیکٹ مکمل ہونے تک اس کا ذہنی معیار پہلے سے دوگنا ہوچکا تھا، اسے تعلیم اور ڈگری کی اہمیت اب پتا چلی تھی۔ تعلیم کی اہمیت کا شعور تو پہلے بھی تھا مگر اب والا احساس سے جدا تھا۔

راجیش مہتا بھارتی تھا اس نے شفری کمپنی چھوڑ کر شیام لال ایل ایل سی جوائن کی تو اس نے فلپائنی انجینئر لی پانگ کے ساتھ نوردین فورمین کو بھی

شیام لال میں بلا لیا۔ کمپنی کے سرکردہ لوگوں میں نور دین کی واہ واہ مثالی تھی وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

رہائش وکھانا کمپنی کا اور لحہ لحہ سپنے سے قریب ہوتا ہوا نور دین۔ اسے لگا زندگی نے اب کے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا ہے۔

ان کے کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان دو چارپائیوں کے اوپر مزید ایک ایک چارپائی بنی تھی۔ یعنی دو منزلہ آہنی بیڈ تھے۔ نور دین پاکستانی، عبدالقیوم بنگلہ دیشی مسلم، جبکہ وجے بھارتی ہندو تھا۔

نیچے والے بیڈ پر نور دین سوتا اس کے اوپر قیوم جبکہ وجے نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا میرے بیڈ کے اوپر کوئی نہ سوئے گا۔ وقت گزرتا رہا کمرے میں صبح شام وجے کی گھنٹیوں بھری پوجا پاٹ ہوتی رہی سامنے والی دیوار دیوی دیوتاؤں سے بھری تھی بھری رہی۔ وہ دونوں وجے کے آرام میں کبھی مخل نہ ہوئے اور وجے نے بھی ان کے جذبات کا احساس نہ کیا بات بڑھتی گئی ۔نور دین اور قیوم نے موقف اختیار کیا کہ جیسے ہم اپنی عبادت، عبادت گاہ میں کر کے آتے تم بھی اپنی عبادت کے لیے مخصوص کمرے میں جایا کرو۔ کمرے کو رہائش گاہ رہنے دو۔ بات بڑھتی گئی۔ نور دین کوئی عام مزدور تو تھا نہیں اس لیے اسے بڑی محبت سے دفتر سے متصل کمرے سے اٹھا کر کوئی چھ قطاریں پیچھے والے مسلمان مزدوروں کے کمرے میں شفٹ کر دیا۔ اس نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ چلو جان چھوٹی۔

☆☆☆

سمندر کے اندر کوئی دو سو میٹر تک جا کر والاز تعمیر کرنے والا آئیڈیا شیام لال ایل ایل سی کو اس نے دیا تھا۔ اس خاکے میں اس نے ایسی رنگ آمیزی کی کہ شیام لال بھی جھوم اٹھا یہ کھربوں کا پروجیکٹ تھا جس میں عربوں کمائے جانے تھے۔ انتظامیہ شوری میں یہ فیصلہ بھی کر ڈالا کہ غیر عرب بھی ان ولاز کو کوئی سال کے لیے خرید سکتے ہیں۔

نور دین نے اس پروجیکٹ میں جان مار ڈالی وہ سارا سارا دن کھڑا رہتا، راتوں کی نیندیں اس نے برباد کر ڈالیں۔ اپنا آرام تج ڈالا فقط اس تمنا میں کہ اس کا نام بھی لیا جائے گا اسٹیج پر ایک دفعہ نام کا مطلب تھا کامیابی باندی بن کر پیروں میں لوٹنے لگتی۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کے لیے اور دکانوں کے لیے کام ملنے لگتا۔ لیکن اسے استعمال کیا گیا ٹشو پیپر کی طرح۔ اسے نکالا گیا تھا دودھ سے مکھی کی طرح ایک دفعہ لی پانگ نے کہا تھا۔ ''یہ ہندو اپنے علاوہ بس دوسرے ہندو کا بھلا سوچ سکتے ہیں۔'' وہ ہنس دیا تھا۔

''مجھے ستر ہزار ماہانہ دے رہا ہے' میں شیام لال۔ وی آئی پی، رہائش اور کھانے سمیت، بونس علیحدہ جب گھر جاتا ہوں گھر والوں کے لیے تحائف الگ سے جبکہ پاکستانی مجھے جھڑکیوں کے ساتھ تیس ہزار ایسے دیتا تھا جیسے احسان کر رہا ہوں، یہ پاکستانی بھی کم نہیں ہیں یہ تو اپنا بھی فائدہ بڑا سوچ کر کرتے ہیں ہندو تو چلو اپنے بعد دوسرے کا سوچتا ہے۔''

''تم بڑے معصوم ہو نور دین'' لی پانگ نے پھر سے کہا۔

''ہاں جی، میں ناک میں لقمہ ڈال لیتا ہوں۔ آج کل معصوم کوئی نہیں ہے لی پانگ!''

''اچھا پھر تم غلط فہمی کا شکار ہو۔''

''غلط فہمی کی بات نہیں لی! بس یہ لوگ ٹیلنٹ کی قدر کرتے ہیں۔ زبان بڑی میٹھی ہے۔ بات بات پر سیخ پا نہیں ہوتے تحمل ہیں ان میں۔ سب سے بڑھ کر ایمان داری ہے ان میں۔ پاکستانی پر کوئی عربی بھروسا کرنے پر تیار نہیں جبکہ ان کو ہر دوسرا پروجیکٹ مل جاتا۔''

''خوشامد اور میٹھی زبان کی وجہ سے ملتا ہے تمہاری بھی تو اتنی خوشامد کرتے ہیں۔'' لی جل کر بولا تھا۔

''اوہو! تو جیلس ہو رہے ہو۔'' وہ چھت پھاڑ کر ہنستا تھا۔

آج اسٹیج پر ہونے والی کارروائی نے اسے بتایا تھا لی کتنا سچا تھا اور وہ خود کتنا بے وقوف۔ اب وہ پیچھے پلٹ کر دیکھ رہا تھا کیسے کیسے میٹھی زبان اور خوشامد کی وجہ سے اس سے کام لیا گیا تھا کہاں کہاں زیادتی کی گئی۔ یہاں تک کہ کمرے سے بھی

اکثریت والے اصول کو نظر انداز کر کے قیوم اور اسے نکالا گیا تھا وہ پھر بھی نہ سمجھا، ویٹر کی آواز نے اسے متوجہ کیا تو اس نے ریت گرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

اسٹیج پر شیام لال جی بدستور اپنے انجینئرز گروپ اور کمپنی کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔

''فیرون جس طرح سے کامیاب ہوا میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں میرے انجینئرز، میری کمپنی جان لڑا دے گی فیرٹو کو اس سے زیادہ کامیاب اور خوب صورت بنانے کے لیے میرے پاس قابل لوگوں کی کمی نہیں، فیرون ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

فیرون کی تکمیل کی تقریب اور فیرٹو کی افتتاحی تقریب اکٹھی تھی اس میں رنگ بھرنے، کویت کی سرکردہ ہستی کو اسٹیج پر بلایا جانے لگا اس کے دیکھتے دیکھتے برطانوی، قطری، عمانی، اور بھارتی نمائندوں کو بلا لیا گیا سب اپنے ملکوں کی نمائندگی کر رہے تھے اپنی اپنی ثقافت وتہذیب کے مطابق۔

''میں بھی کتنا پاگل تھا سوچا کرتا تھا پاکستان نہ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔ دنیا کے نقشے میں ایک ملک کا اضافہ بلا ضرورت ہی کیا۔

میں آج شرمندہ ہوں اے ارض پاک تم سے اے میرے قربانیاں دے کر پاکستان میں داخل ہونے والے بزرگوں تم سے، ہم تو ایک تیسرے ملک کے ایک کمرے میں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو ایک ملک میں کیسے رہ لیتے۔'' شرمندگی اور رنجیدگی کا آنسو دل کی سرزمیں پر گرا تو جیسے روم روم دعا بن گیا۔ اس سے دو قطار آگے پڑے اسپیکر میں سے برطانوی لب ولہجے میں اس کا نام پکارا گیا اس نے حیرت سے سامنے دیکھا لی ہاتھ ہلا کر اسے اسٹیج پر بلا رہا تھا۔

☆☆☆

قومی لباس اور پشاوری چپل میں جب وہ ان سوٹڈ بوٹڈ لوگوں کے پاس پہنچا تو سب سے الگ تھا سب سے منفرد، چھوٹا سا سبز ہلالی پرچم اس کی جیب پر لگا اسے فخر سے مسکراتا محسوس ہوا۔

آج صبح پاکستانی اسکول میں تئیس مارچ کی کوئی تقریب تھی شاید وہ اسکول کے سامنے والی عمارت کے سائے میں کھڑا تھا جب دو بچے آپس میں لڑتے اس عمارت میں داخل ہونے لگے تھے۔

اس نے چھوٹے کو پکڑ لیا۔

''بھائی سے سوری کہو۔''

''میں نہیں بولوں گا سوری!'' وہ بسور رہا تھا۔

''پھر میں یہ جھنڈا نہیں دوں گا'' اس نے چھوٹا سا پرچم اس کے کوٹ سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

دفعتاً بچے کے باپ کی گاڑی آ رکی وہ لپک کر ''پاپا پاپا'' کرتا باپ کی ٹانگوں سے چمٹا اندر چلا گیا تو اس نے اسٹیکر اپنی جیب پر لگا لیا تھا۔

لی نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر مائیک ہاتھ میں دے دیا۔

وہ بولتا گیا لی پانگ انگلش میں ترجمہ کرتا گیا اس نے اتنی لمبی اردو تو نہ بولی جتنا لمبا لی انگلش ترجمہ کر رہا تھا۔

دفعتاً نشیلی سنہری ریت تالیوں سے گونج اٹھی، سمندر کی لہروں نے ریت سنگ مل کر ساز کا کوئی نیا آہنگ چھیڑا، برقی مشعلیں جھلملا اٹھیں تو سارا منظر جھلملا گیا۔ سب سے پہلے قطری نمائندے نے اسے اپنے ملک آنے اور اعزازی انجینئرنگ کی ڈگری لینے کی دعوت دی۔ سب سے پہلے اسے لی پانگ نے اپنے ساتھ بھینچا پھر یکدم چھوڑ دیا۔ وہ اس کا مترجم بنا تھا بذات خود...... اب کوئی اور پھر کوئی اور اسے یکے بعد دیگرے مختلف نمائندے اپنے اپنے ملک آنے کی دعوت دیتے گئے تالیوں کی گونج تھی کہ مدھم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ اس کا دل نم آنکھوں کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ ریز ہوا جا رہا تھا۔ صد شکر کہ ''میں نے ایک لاکھ ٹھکرا دیا۔ میرے رب جیسا کارساز کوئی نہیں''

''ہجوم کے اردگرد ہجوم کے پار دور نزدیک اس کا خواب تعبیر بن کر مشعلوں میں روشن ہوا جا رہا تھا۔

''خواب ہوں گے تو تعبیر کی جدوجہد ہوگی۔''

وہ سوچتا رہا۔ تالیاں گونجتی رہیں، سمندر شور کرتا رہا۔

☆☆

ناولٹ

تنزیلہ ریاض

غم ہے یا خوشی ہے تو



''ارے پھر آگئے آپ میرا قصہ سننے۔ میرے بیٹے اور بہو کی کہانی میں کتنی دلچسپی ہے آپ کو۔ دوسروں کی سن گن لینے والی عادتیں کب ختم ہوں گی آپ لوگوں میں۔ چلیں اب آگئے ہیں تو، آجائیں بیٹھیں۔ آپ کو بتاتا ہوں کہ پھر کیا ہوا۔

ہم کچھ روز قیام کے بعد ساہیوال سے تو آگئے تھے لیکن ہر شخص اپنے دل میں ایک نیا عزم لے کر بیٹھ گیا تھا۔ میری اہلیہ اپنی جانب سے رشتہ طے کر چکی تھیں اور چپ چپیتے (خاموشی سے) اگلے مرحلوں کی منصوبہ بندی کرنے لگی تھیں۔ ہمشیرہ صاحبہ نے خاموشی کا چولہ پہن لیا تھا کیونکہ ان کی سہیلی نے ان کو ایسا کرنے کو بولا تھا یعنی بات تو وہیں تھیں جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ بزرگ الگ سمت میں چل رہے تھے جب کہ دونوں بچے بالکل ہی الگ سمت میں۔ یہ دو دریاؤں کے کنارے تھے اور میری اہلیہ اور ہمشیرہ انہیں ریل کی پٹریاں سمجھے بیٹھی تھیں جو مختلف سمت میں چلتے رہنے کے بعد بالآخر کسی مقام پر ایک ہو جاتی ہیں حالانکہ اس کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ میں اس مسئلے کا ایک اور ہی حل نکال آیا تھا لیکن وہ میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔ ابھی آپ وہاں سے ہی قصے سمجھنے کی کوشش کریں جہاں سے ہم ساہیوال سے واپس آئے تھے

آجائیں...... آپ کو آگے کی کہانی بتاتا ہوں۔

☆☆☆

''کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہی ہیں؟ کچھ چپ چپ سی ہیں آپ۔'' ماسٹر جی نے مہناز بیگم سے پوچھا تھا۔ انہوں نے کچن کے شیلف سے سر اٹھا کے ان کی جانب دیکھا پھر بولیں۔

''آج عطیہ کو فون کیا تھا۔ بہت بجھی ہوئی سی تھی حالانکہ اب تو میں تسلی بھی دے آئی ہوں پھر بھی ٹھیک سے بات بھی نہیں کی۔ ایک منٹ بعد ہی فون بند کر دیا۔ کہہ رہی تھی کہ مصروف ہوں، بہت عجیب لگا مجھے۔'' انہوں نے کیبنٹ سے جار باہر نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہو تو ہوں گی نا مصروف۔ آپ بدگمان کیوں ہوتی ہیں۔ آپ اپنی خاموشی کو میری بہن کے سر نا منڈھیں بلکہ اصل وجہ بتائیں کیوں چپ ہیں۔ کیا پڑوسن پھر وہ سوٹ بارہ سو کا لے آئی ہیں جو آپ دو ہفتے پہلے تین ہزار کا لائی تھیں۔''

ماسٹر جی نے اہلیہ کو خاموش دیکھتے ہوئے چڑانے کے لیے کہا تھا۔ وہ ناشتا کر چکے تھے لیکن ابھی بھی گھر ہی میں تھے۔ آج طبیعت کچھ سست تھی اس لیے ذرا تاخیر سے جانا چاہ رہے تھے۔ مہناز بیگم نے نفی میں سر ہلایا پھر ہاتھ میں پکڑے نمک کے جار کو صافی سے رگڑتے ہوئے بولیں۔

''میں چپ ہوں، نا ہی پڑوسن نے کوئی ایسا دل جلانے والا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔'' وہ لوگ ساہیوال سے گزشتہ روز واپس آئے تھے تب ذرا رات ہو گئی تھی اس لیے مہناز بیگم نے گھر کی صفائی ستھرائی کی مہم شروع نہیں کی تھی لیکن آج وہ آرام سے بیٹھنے والی نہیں تھیں۔ ماسٹر جی جانتے تھے کہ کچن سے لے کر باتھ روم تک، دیواروں سے لے کر ان پر آویزاں آرائشی چیزوں تک اب ہر چیز کی دھلائی کا وقت ہو چلا تھا۔ ان کے خاندان کی عورتوں کو صفائی ستھرائی کا خبط تھا اور اس معاملے میں وہ سب ہی کافی وہمی تھیں۔

''اس کی وجہ کیا ہے۔ آپ سمجھ دار ہو گئی ہیں یا پڑوسن کو مرشد مان لیا ہے؟'' ماسٹر جی کو انہیں چڑانے میں مزا آتا تھا۔

''پڑوسن کو مرشد مانتی ہے میری جوتی۔ میں تو خود کئی ایک کی مرشد ہوں۔ آپ کے منہ سے ایسی بات اچھی نہیں لگتی ماسٹر جی! میرے مریدوں کی فہرست میں سب سے اوپر تو آپ کا نام ہی لکھا ہے۔'' وہ اب صاف کی گئی بوتلوں کو ترتیب سے

کیبنٹ میں رکھنے لگی تھیں۔ ماسٹر جی کے چہرے پر ان کا جواب سن کر لطیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ مجھے مرید کہہ کر کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہیں بی بی! آپ تو مجھے مجنوں بھی کہہ سکتی ہیں۔ آپ کو تو مرشد ہی نہیں، محبوب بھی مانتا ہے یہ ماسٹر!'' انہوں نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے اتنا ہی کہا تھا کہ مہناز ان کی جانب مڑیں اور تنبیہہ کرنے والے انداز میں بولیں۔

''آپ کا بیٹا خیر سے گھر میں ہی ہے۔'' ماسٹر جی نے مصنوعی حیرت چہرے پر پھیلائی اور بولے۔

''میں نے کوئی غیر اخلاقی بات تو نہیں کر دی ہے بی بی! میں تو اپنی اہلیہ سے ہی چہلیں شہلیں کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' مہناز بیگم نے شیلف رگڑنے شروع کر دیے تھے۔ ان کی بات سُن کر بولیں۔

''ان چہلوں شہلوں میں یہ یاد رہے کہ آپ ایک عدد جوان بیٹے کے باپ ہیں۔ کوئی لحاظ ہوتا ہے، کوئی مروت ہوتی ہے۔'' مہناز بیگم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ چمکنے لگی تھی جبکہ ماسٹر جی نے گہری سانس بھری۔

''لحاظ اور مروت تو اپنے بیٹے کو سکھائیں۔ وہ ہی کچھ زیادہ بے لگام ہو رہا ہے۔ اسے سکھائیں، سلیقہ قرینہ مرد کو بھی آنا چاہیے۔ اسے بتائیں بی بی کہ گھر کی خواتین کو کیسے ٹریٹ کرتے ہیں، میں تو اس کے لیے پریشان بیٹھا ہوں۔''

''ارے میں کیوں سکھاؤں۔ آپ ہی سکھائیں نا۔ دنیا آپ کو ماسٹر جی کہتی ہے، یہ تو آپ کا ڈیپارٹمنٹ ہے ماسٹر جی۔'' وہ ہنس رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے سر جھٹکا۔

''آپ کو تو جیسے پتا نہیں کہ میرا ڈیپارٹمنٹ کیا ہے بی بی! تین دہائیاں تو گزار دی ہیں آپ نے میرے ساتھ بلکہ اس سے بھی تھوڑا زیادہ وقت۔ شادی کے ستائیس سال میں مزید وہ تین سال بھی جمع کر لیں جن میں آپ مجھے آتے جاتے دیکھا کرتی تھیں اور آہیں بھر بھر کر اللہ سے مجھے مانگا کرتی تھیں تو پورے تیس بتیس سال بن جاتے ہیں۔''

''ماسٹر جی آپ اتنا وقت ان بے سرو پا باتوں میں ضائع کرتے ہیں نا۔ اتنا اپنے بیٹے کو سمجھانے میں کرتے تو بہتوں کا بھلا ہو جاتا۔'' مہناز نے کہا تھا

''معاف کیجیے گا بی بی! لیکن بھلا اور بھلائی تو مجھے دور دور تک نظر نہیں آ رہے، مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ یہ جو فیصلہ آپ دو سہیلیاں کر بیٹھی ہیں۔ اس کے نتائج نہایت خطرناک نکلنے والے ہیں۔'' ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر دوبارہ اب ہی بات ہو رہی تھی۔ مہناز بیگم کا یہ پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ صافی کو ہاتھ میں ہی لیے ان کے پاس آ بیٹھیں اور دھیمی سی آواز میں بولیں۔

''بدفال کیوں نکالتے ہیں ماسٹر جی! آپ دیکھیے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ نے غور نہیں کیا التمش سونیا سے کافی امپریس لگتا ہے۔ اچھا کیا جو آپ نے ساہیوال کا چکر لگوا دیا ہمیں۔ آپ کی تدبیر کامیاب رہی۔ ستر فیصد معاملہ تو سلجھ گیا ہے باقی کا تیس فیصد بھی کر لیں گے آپ۔ میں جانتی ہوں، آپ کو پتا ہے التمش پوچھ رہا تھا مجھ سے وہاں بھی کہ یہ سب جو پھپھو نے دیواروں پر سجا رکھا ہے۔ یہ سب واقعی سونیا نے بنایا ہے۔ تعریف کر رہا تھا۔ پہلے کبھی اس نے ایسے تعریف نہیں کی۔ میں بہت پُر امید ہوں ماسٹر جی آپ سنبھالیں گے اسے، میں جانتی ہوں۔'' وہ بہت مطمئن تھیں۔ ماسٹر جی کے چہرے کے تاثرات طنزیہ سے ہو گئے۔

''آپ کو تو کچھ نہیں سمجھا نہیں پایا میں۔ آپ کے بیٹے کو کیا سمجھاؤں گا۔'' مہناز بیگم دوبارہ اٹھ کر شیلف کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

''مایوسی گناہ ہے ماسٹر جی! آپ کو اپنی صلاحیتوں پر بھروسا ہو یا نہیں لیکن مجھے بے حد ہے۔ آپ سب کچھ سلجھا سکتے ہیں، صرف آپ!'' وہ با آواز بلند بولی تھیں۔

''اوئے بیڑا اتر جائے ایسے بھروسے کا۔ ماسٹر وچارا مشکل میں پڑ گیا ہے، بھلا بتاؤ جب بیوی ایسے مان سمان سے کوئی کام کہتی ہے تو کس کافر سے انکار کیا جاتا ہے اور وہ بھی من چاہی بیوی، جس سے عشق کا دعوا ہو مرد کو حق ہا۔ یہ عشق بھی زرا سیاپا ہے، کمبخت لنگڑے کو بھی بھنگڑے پر لگا دیتا ہے۔ اونہہ!'' وہ بڑبڑا رہے تھے۔

☆☆☆

''مجھے مِس کیا تھا؟'' زرمین نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ التمش نے نظر بھر کر اسے دیکھا پھر منہ بنا کر اور ناک چڑھا کر بولا۔

''جی نہیں۔ میں ساہیوال پھپھو کے گھر گیا تھا عالمِ بالا نہیں۔ سنا ہے بُرا وقت تو وہیں یاد آتا ہے۔''

''بُرا وقت ہو گی وہ تمہاری پھپھو کی بیٹی۔ میں تو نہیں ہوں۔'' زرمین نے بُرا منائے بغیر کہا تھا۔ التمش نے جواباً کچھ نہیں کہا بلکہ اس کے ہاتھ میں پکڑے چپس کے پیکٹ سے چپس لے کر کھانے لگا تھا۔

''تم کب ملو گے میرے پیرنٹس سے، یہ بتاؤ مجھے۔'' زرمین نے چپس کا ٹکڑا دانتوں سے کترتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور پھر اپنا مطالبہ دہرایا تھا۔

''ابھی، اسی وقت۔ آؤ...... کلاس بعد میں لیں گے۔ پہلے تمہارے پیرنٹس سے مل آتے ہیں۔ یہ مرحلہ تو سَر ہو۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا چپس کا نصف ٹکڑا بھی منہ میں ڈالا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

زرمین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''سچ کہہ رہے ہو یا پھپھو کے گھر سے نسوار کھا کر آ گئے ہو۔'' وہ حیران ہوئی تھی۔ چہرے پر بے یقینی تھی۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں بھائی! اتنی شکی کیوں ہو تم۔ التمش کہتے ہیں مجھے۔ جھوٹ نہیں بولتا میں۔ اسی لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارے پیرنٹس نے پوچھا کہ برخوردار کرتے کیا ہو تو صاف بتا دوں گا کہ ابھی تو بس گوگل سے اسائمنٹس کاپی پیسٹ کرتا ہوں۔ اسٹیپ چیٹ پر پھپھو کی بیٹی کے پنڈ کی تصویریں لگاتے ہوئے اس کی چغلیاں کرتا ہوں یا پھر فیس بک پر گھٹیا شعر اپلوڈ کر کر کے آپ کی بیٹی سے فیلنگ لوڈ کرتا ہوں۔'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ زرمین کے چہرے پر ہنسی پھیل گئی۔

''بکومت۔ ایسے تو وہ کبھی تمہارا پروپوزل قبول نہیں کریں بلکہ مجھے بھی جائداد سے عاق کر دیں گے۔'' وہ ہنستے ہوئے اسے چڑا رہی تھی۔ التمش دوبارہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''صحیح ہے پھر ہم مل جل کر کوئی گولا گنڈا کی ریڑھی لگا لیں گے اور سکون سے زندگی بسر کریں گے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔ زرمین پھر بھی ہنستی رہی۔

''ویسے التمش تمہارا مجھے پتا نہیں لیکن میں تو تمہارے ساتھ گولا گنڈا، گول گپے اور چنا چاٹ کی ریڑھی لگانے کو بھی تیار ہوں۔ مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ چہرے پر عجیب سا استحکام اور استحقاق تھا۔ التمش چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔

''التمش کہتے ہیں مجھے۔ اب تم مجھ سے ایسے کام کرواؤ گی۔ اچھا لگوں گا اتنا ہینڈسم ہو کر گولا گنڈا بیچتا ہوا۔'' زرمین نے ناک چڑھائی۔

''یہی تو پرابلم ہے۔ تم مجھے ہر حال میں اچھے لگتے ہو۔ اتنے اچھے کہ تم جیسا دوسرا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ اتنا نخرا ہوتا تھا میرا۔ کالج اسکول میں، فیملی میں۔ آج تک کسی کو اس قابل نہیں سمجھا میں نے کہ اسے یہ جملہ بول سکوں لیکن تمہیں کہہ رہی ہوں التمش! پلیز کچھ کرو۔ تم نہیں ملے تو مر جائی گی زرمین! دیکھ لو

کیا نوبت آگئی ہے۔ اسے کہتے ہیں نصیب کے ہاتھوں شکست۔'' وہ سنجیدہ بھی تھی اور مسلسل اسے چڑا بھی رہی تھی۔

''شکست نہیں، اسے کہتے ہیں جیک پاٹ۔ میں تمہارا لکی اسٹروک ہوں بھائی، جو تم سے جانے انجانے لگ گیا ہے ورنہ ہمیں تو پھپھو کی بیٹی بھی وظیفوں میں مانگتی پھرتی ہے۔'' وہ مصنوعی انداز میں ناک چڑھا کر بولا تھا۔

''کتنے مغرور ہو نا تم......'' زرمین نے چپس کے پیکٹ سے مزید چپس لیتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے بھئی سجتا ہے مجھ پر۔'' وہ سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔

''اچھا تو پھر جب اتنا کچھ سجتا ہے تو کیوں نہیں مل لیتے میرے پیرنٹس سے۔ ڈرتے کیوں ہو۔ ایک ملاقات تو کرلو پلیز، کچھ تو سلسلہ آگے بڑھے۔ ان کو بھی تسلی ہو اور مجھے بھی ورنہ ابھی تو ایسا لگتا ہے جیسے میں تو صرف فٹ بال لے کر بھاگ رہی ہوں مگر آخر میں گول پھپھو کی بیٹی کر جائے گی۔''

''کیا یار! ہر دو دن بعد ایک ہی بات دہرانے لگتی ہو تم۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ پھپھو کی بیٹی کا دل اتنا توڑ آیا ہوں میں کہ اب وہ میرا نام بھی سننا گوارا نہیں کرے گی۔ خود ہی انکار کر دے گی۔ تم فکر مت کرو۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ زرمین کو اس ٹاپک میں پہلے والے ٹاپک سے بھی زیادہ دلچسپی تھی

''اچھا...... کیسے۔ کیا صاف انکار کر دیا اسے۔ آئی ہیٹ یو بول دیا نا۔ ویری گڈ۔'' وہ خوش ہوئی تھی۔ التمش نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''کچھ بھی بولا ہو۔ ڈیٹس نن آف یور بزنس۔ بس تم فائنلز پر دھیان دو تا کہ میں بھی اپنے اماں باوا کے سامنے فخریہ انداز میں کہہ سکوں کہ یہ ہے زرمین شہریار! نام تو سنا ہوگا۔'' وہ سنجیدہ سے انداز میں بولا تھا۔

''فائنلز تو ہو ہی جائیں گے لیکن پلیز تم ایک بار میرے پیرنٹس سے مل لو۔ بالخصوص میری ماما سے...... وہ بہت خوش ہوں گی تم سے مل کر۔ انہیں بتا تو رکھا ہے میں نے لیکن یو نو۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے انہیں اس بات کا بھی پتا ہے کہ تمہارے پیرنٹس خاندان میں ہی تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں تم سنجیدہ نہیں ہو میرے معاملے میں۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں تم ایک بار مل لو ان سے۔ وہ ایک بار تمہیں دیکھ لیں گی تو پھر باقی کے مرحلے آسان ہو جائیں گے۔'' وہ اسے آمادہ کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ التمش چند لمحے کچھ نہیں بولا پھر اس نے ہونٹ بھینچے تھے۔

''اور اگر ایسا نا ہوا؟......تو......؟ پھر......؟'' وہ ایک ہی جملوں کو تین حصوں میں بانٹ کر بولا تھا۔ زرمین نے اس کا چہرہ دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ التمش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''کچھ نہیں زرمین! بس اتنا یاد رکھو کہ التمش پھپھو کی بیٹی کا مر کر بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہارا تھا اور تمہارا ہی رہے گا لیکن پھر بھی اگر تمہیں تسلی نہیں ہو رہی تو چلو مل لیتے ہیں تمہاری ممی سے۔ بتاؤ کب ملنا ہے؟'' وہ رضامند ہو گیا تھا۔ زرمین بے تحاشا خوش ہو گئی تھی۔

''میں ان سے پوچھ کر بتاؤں گی تمہیں؟'' وہ پرجوش ہو رہی تھی۔ چہرے پر اتنی خوشی اور اطمینان تھا کہ التمش اس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ وہ اسی بات پر خوش ہو گئی تھی کہ وہ اس کے والدین سے ملنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

''کیا واقعی؟'' عطیہ بیگم نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''پہلے نہیں بتایا تم نے۔'' وہ مزید کہہ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اشتیاق اور حیرانی ایک ساتھ چمکنے لگی تھی۔ سونیا نے لیپ ٹاپ کی اسکرین

سے نظریں ہٹا کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ جانے کس سے بات کر رہی تھیں۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے دریافت کیا تھا لیکن ان کی توجہ سونیا کی جانب نا تھی۔

''لیکن پھر بھی...... میرا مطلب ہے......'' وہ کچھ تذبذب میں گھری محسوس ہونے لگی تھیں۔

''ارے نہیں بھئی۔ خوشی تو ہوئی ہے۔ خوشی کی بات ہے ماشاء اللہ...... اللہ کریم مبارک وقت لائے۔'' انہوں نے کہا تو سونیا کے کان مزید کھڑے ہو گئے۔ اس کی نگاہیں امی کے چہرے پر ہی تھیں جہاں سوچ اور کشمکش کے رنگ ایک ساتھ نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس کا دل سگنلز دینے لگا تھا کہ یقیناً کچھ ایسا ہے جو اچھا تو ہے مگر نہیں ہے۔ اس کا دل چاہا ایک لمحے کے لیے وہاں سے اٹھ جائے اور اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ جائے کم از کم امی کی نگاہوں سے تو دور رہے گی لیکن پھر بھی وہ بیٹھی رہی۔ امی ویسے بھی اپنے بھائی اور بھاوج کی واپسی کے بعد سے بہت چپ چپ رہنے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یا تو کشتی پار لگ گئی ہے یا بالکل ڈوب گئی ہے۔ دونوں صورتوں میں مشکل یہ تھی کہ امی کی خاموشی اسے خلجان میں مبتلا کرنے لگتی تھی۔ گھر میں تین ہی تو افراد تھے اور ان میں بھی بات کرنے والی دو خواتین...... التمش کے رویے نے اس کا دل ہی نہیں جلایا تھا، اس کے سامنے سوچ کے کئی نئے در وا کر دیے تھے۔ اب وہ ایک الگ سمت میں سوچ رہی تھی لیکن امی کیا سوچ رہی تھیں اس کی اسے خبر نہیں ہو پا رہی تھی کیونکہ انہوں نے نے تو خاموشی کا روزہ ہی رکھ لیا تھا۔ وہ خود بھی ایک مشکل دور سے گزر رہی تھی۔ التمش نے اسے اس کی کم مائیگی کا جو احساس دلایا تھا وہ اس کے دل میں گڑ کر رہ گیا تھا لیکن وہ بہت پریکٹیکل سوچ والی لڑکی تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اسے کبھی کسی مسئلے کا حل نہیں لگا تھا۔ وہ جانتی تھی اسے مسئلے کا حل تو نکالنا تھا لیکن چپ رہ کر نہیں جب کہ امی جانے کیوں چپ ہو گئی تھیں اور سناٹے اسے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن وہ امی کے پسندیدہ موضوع سے بھی خار کھاتی تھی سو ان کی خاموشی کو وقتی طور پر برداشت کر رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے اگلوانے کی کوشش بھی کی لیکن زیادہ کامیابی نا ملی تھی۔ امی نے فون بند کیا تو نا چاہتے ہوئے بھی وہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''اچھی خبر ہے؟'' انہوں نے اس کے چہرے کی جانب بس ایک ہی نظر ڈال کر کہا تھا۔

''اللہ خیر...... یقیناً کسی کی بیٹی کی شادی کی خبر آگئی ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔

''تمہاری منجھلی آپی کے یہاں کرم ہونے والا ہے اللہ کا۔'' وہ عام سے انداز میں بتا رہی تھیں۔ سونیا نے خوش ہوتے ہوئے بھی ان کے انداز کو محسوس کیا۔ وہ منجھلی بیٹی کی اولاد کے لیے کتنی دعائیں تو کرتی رہتی تھیں۔ امی کو تو خوش ہی ہونا چاہیے تھا لیکن وہ تو سپاٹ چہرہ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''آپ خوش نہیں ہوئیں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''خوش تو ہوں لیکن......'' انہوں ایک ساعت کے لیے سوچا پھر بولیں۔ ''میرا اور تمہارے ابو کا ویزا اپلائی کر دیا ہے۔ کہتی ہے اس صورت حال میں ویزا نکل آئے گا جلدی۔'' انہوں نے سادہ سے انداز میں کہا۔ یہ ان سب کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ منجھلی آپی نے ایک سال پہلے بھی ویزا اپلائی کر رکھا تھا لیکن مسترد ہو گیا تھا لیکن اب حاملہ ہونے کی صورت میں پالیسی ایسی تھی کہ ویزا آسانی سے مل سکتا تھا اور یہ بات انہوں نے پہلے سے بتا رکھی تھی کہ اللہ جب بھی انہیں خوشی کی خبر دکھائے گا وہ امی ابو کو بلوائیں گی۔

''اچھی بات ہے نا۔ آپ کینیڈا گھوم سکتی ہیں۔ لوگ تو کینیڈا جانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ آپ کو

بیٹھے بٹھائے موقع مل رہا ہے۔" اسے ان کا موڈ اچھا کرنے کے لیے کہا تھا۔

"اور اپنا سوچا ہے؟ تمہیں کس کے حوالے کر جاؤں گی؟" انہوں نے بے زاری بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سونیا کو جھٹکا سا لگا۔

"کسی کے حوالے کیوں کریں گی۔ میں کوئی گھر میں کھڑی سائیکل یا پانی والی موٹر نہیں ہوں کہ کوئی اور آکر ذمہ داری سنبھالے گا۔ میں اپنے گھر میں ہی رہوں گی۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ اس ضمن میں اس نے نہیں سوچا تھا کہ اس کا بھی کوئی مسئلہ ہوسکتا ہے۔

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ اکیلی لڑکی کو اکیلے گھر میں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ اتنا شوق بھی نہیں ہے مجھے اب دوسرے ملک دیکھنے کا۔" انہوں نے چڑ کر کہا تھا۔

"اکیلی لڑکی کے لیے اس کا گھر ہی بہتر ہوسکتا ہے یا پھر اکیلی لڑکی کو بھرے ہوئے قبرستان میں چھوڑ آئیں۔" اس نے چڑ کر کہا پھر چونکہ جانتی تھیں کہ اس کی بات ان کو ناراض کرسکتی ہیں اس لیے فوراً بولی۔

"امی آپ عجیب سی باتیں کیوں کرنے لگتی ہیں۔ یہ بات تو دو سالوں سے ہم سب سن رہے ہیں کہ آپی نے آپ کو کینیڈا بلوانا ہے۔ آپ تیار بھی تھیں، دو سال سے تو کبھی انکار نہیں کیا آپ نے۔ میرا مسئلہ تو تب بھی موجود تھا نا۔ میں اپنے ہی گھر میں رہوں گی۔" وہ بھی ان ہی کی طرح بے زار ہوئی تھی۔ سارا زور لفظ "مسئلہ" پر تھا۔ امی نے اس کی جانب دیکھا پھر نظریں چرا لیں۔

"تب ایک امید بندھی تھی، نظر آرہا تھا کہ سامنے ہی رشتہ موجود ہے۔ آج یا کل ہو ہی جائے گا لیکن اب......" وہ کچھ کہتے کہتے چپ سی ہوگئیں۔ سونیا نے ان کے الفاظ پر غور کیا۔ ایسے ناامیدی سے تو کبھی انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

"یعنی اب امید ختم ہوگئی ہے کیا؟" اس کا لہجہ پرجوش سا تھا۔

"اللہ نہ کرے...... کیوں میرا دل جلا رہی ہو۔" وہ بہت ہی دکھی ہوئی تھیں۔

"آپ کی امید ختم ہوگئی۔ مطلب...... اچھی خبر ہے۔ چلیں اچھا ہے یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے۔ کم سے کم بھتیجے سے ملنے کا یہ فائدہ تو ہوا آپ کو۔ اب سمجھ میں آیا بادشاہوں والا نام رکھ لینے سے کوئی بادشاہ نہیں ہوجایا کرتا۔" وہ خوش ہوئی تھی۔

"تمہیں تو بس اللہ موقع دے التمش کی برائی کا۔" وہ چڑ کر بولی تھیں۔ سونیا ان کا انداز دیکھ کر چپ سی ہوگئی۔

"تمہارے ابو سے مشورہ کرتی ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔ بہتر ہے انکار کردیتے ہیں۔" وہ سوچ رہی تھیں اور بول بھی رہی تھیں۔

"ارے انکار کیوں کرتی ہیں۔ آپی کا دل کیوں دکھانا چاہتی ہیں۔ کیا سوچیں گی وہ، اتنے عرصے بعد اگر کوئی اچھی خبر ملی ہے تو خوش تو ہو لینے دیں۔ میں تو سوچ رہی تھی رس گلے والا زردہ بنا کر بانٹتی ہوں سارے محلے میں۔ آپ نے تو مجھے بھی پریشان کردیا۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"تمہیں زردے بریانی سے ہٹ کر کوئی بات آتی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں جانے کیا کیا کر رہی ہیں اور تم بس زردے دم دیتی رہو۔" وہ ناراض ہو رہی تھیں۔ سونیا نے زچ ہو کر ان کے پاس سے اٹھ جانے کو ترجیح دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ماموں ممانی باتوں باتوں میں باور کروا گئے ہیں کہ یہ رشتہ نہیں ہوسکتا اس لیے امی اتنی بے زار ہو رہی ہیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔

☆☆☆

"آگئے آپ ساہیوال سے؟ ملاقات ہوگئی اپنے رشتہ داروں سے۔" وہ ہمیشہ کی طرح اسٹول پر ٹانگیں ٹکائے کرسی پر بیٹھے جب میڈم تہمینہ کی کھنکناتی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ انہوں نے میٹھی سی

مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ان کی جانب دیکھا پھر فٹافٹ ٹانگیں اسٹول سے اتار کر تمیز سے بیٹھ گئے۔

"ہاں جی! دو دن ہو چلے اب تو، ہمشیرہ رہتی ہیں نا وہاں۔ ان ہی سے ملاقات کی غرض سے گئے تھے۔ سہ روزہ قیام تھا بس۔" انہوں نے جواب دیا تھا اور ساتھ ہی انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی تھی۔

"آئے ہائے ماسٹر جی! آپ سادہ سادہ آسان آسان الفاظ کیوں نہیں استعمال کرتے۔ ہمشیرہ، ملاقات کی غرض...... سہ روزہ قیام...... آپ یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ اپنی بہن سے ملنے گئے تھے تین دن کے لیے۔" وہ چڑ کر بولی تھیں اور ساتھ ہی اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تھی۔

"عادت سی پڑ چکی ہے اب تو شستہ زبان استعمال کرنے کی لیکن اگر آپ کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے تو۔ میرا مطلب اگر آپ کو اچھا نہیں لگتا تو آئندہ احتیاط کروں گا۔" وہ وضاحت دینے لگے تھے۔ یہ رعایت بھی بس میڈم تہمینہ کو ہی حاصل تھی کہ ان کی بات کا برا کم ہی مناتے تھے ماسٹر جی۔

"آپ تو مجھے اچھے ہی لگتے ہیں۔ برا لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ماسٹر جی! لیکن یہ آپ کے شاگرد زہر لگتے ہیں مجھے۔ بڑے ہی ڈھیلے ہوگئے ہیں ماسٹر جی! نکمے، منحوس مارے کام کم اور مخول زیادہ کرنے لگے ہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ان کے شاگردوں کو ٹوک رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے ان کی بات سن کر دل ہی دل میں رب نواز کو کوسا تھا۔ کتنا سمجھا کر گئے تھے اس کو۔

"میڈم جی! آج کل کے جوان بچے ہیں، یہ ہیں جمع ایک اکیسویں صدی ہے۔ کہتے ہیں قیامت اسی صدی میں آنے کا ذکر کیا کرتے تھے بزرگ۔ لحاظ مروت تو خونی رشتوں میں ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ تو پھر میرے شاگرد ہیں، اچھے لڑکے ہیں میڈم جی! بس ذرا لاپروا ہیں لیکن بخدا ہنرمند اور قابل ہیں۔ ذرا زبان کے کڑوے ہیں ورنہ دل سے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ آپ کی اسائنمنٹس پر کتنی محنت کرتے ہیں۔" ماسٹر جی نے وضاحت کی تھی۔

اوہ رہن دیو ماسٹر جی! میری اسائنمنٹس کا تو حشر کردیتے ہیں۔ سب الٹ پلٹ کر کے متھے مار دیتے ہیں میرے۔ پانی کہوں تو آگ بناتے ہیں اور آسمان کہوں تو زمین تیار کردیتے ہیں وہ بھی بنجر زمین۔ قسمے میں بڑی مایوس ہوگئی ہوں ان سے۔" وہ ناراضی کا اظہار کر رہی تھیں۔

"اوہ میڈم جی! اتنا ناراض کیوں ہو رہی ہیں، بچے ہی تو ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے آج کل کے بچے تو سنتے نہیں کسی کی۔ ہمارے اپنے بچے بھی تو ایسے ہی ہیں لاپروا اور منہ پھٹ۔" وہ شرمندگی سے کہہ رہے تھے۔

"خواہ مخواہ ایسے ہی ہیں ہمارے بچے، ٹانگیں نا توڑ دیں ہم اپنے بچوں کی جو ایسی بدتمیزیاں کریں تو۔ یہ تو غریب غرباء کی اولادیں اکٹھی کی ہوئی ہیں آپ نے۔ ذات کے کمی کمین، ان کو کہاں عزت کرنی آتی ہے کسی کی۔ ہم ذات کے پنجابی ہیں ماسٹر جی! خاندانی پنجابی، یہ دو نمبر توبی (دھوبی) اور کمہار نہیں ہم۔ وہاں امرتسر میں کروڑوں کا کاروبار چھوڑ کر ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔ یہ کوٹ لکھپت تک پھیلی زمینیں ملی تھیں یہاں۔ ہمارے بزرگ اتنے وضع دار تھے کہ سونے کے گلاسوں میں پانی پیا کرتے تھے۔ دس دس نوکر تو میرے دادا کا حقہ پکڑ کر پیچھے پیچھے آتے تھے۔ اِدھر کراچی میں بھی کسی سے ماڑے (کمزور) نہیں ہیں ہم۔ سیٹھ حشمت کے خاندان کا نام سن کر تو بڑے بڑے لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہ آپ کے منحوس شاگرد کیا چیز ہیں۔ میں آپ کے لڑکوں کو صرف آپ کی وجہ سے رعایت دیتی ہوں

ورنہ تو ان جیسوں کو منہ نا لگاؤں کبھی۔ آپ کا لحاظ مار دیتا ہے مجھے۔ بڑا پرانا ساتھ ہے آپ کا ہمارا۔ آپ کی وجہ سے اس چوکھٹ سے بندھی ہوں ورنہ مڑ کر نا دیکھوں۔'' وہ کافی بھپری ہوئی تھیں۔ ماسٹر جی کو بہت برا لگا۔ اپنی جانب سے تو وہ رب نواز کو نصیحت کر کے ہی گئے تھے لیکن انہوں نے پھر میڈم کو ناراض کر دیا تھا۔

''بڑی مہربانی آپ کی میڈم لیکن......'' انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میڈم تہمینہ نے ان کی بات کاٹ دی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں ماسٹر جی! سچ کہہ رہی ہوں آپ کو۔ قسمے آپ ہی کی وجہ سے مجبور ہوں۔ آپ دیکھ لینا کل کلاں کو آپ نا رہے تو تالا لگ جائے گا اس جگہ کو۔'' انہوں نے بے دھڑک کہہ ڈالا تھا۔

''استغفراللہ۔'' ماسٹر جی نے دہل کر کہا تھا پھر ان کی جانب دیکھ کر تحمل سے بولے۔

''آپ کیوں ناراض ہیں اتنا، مجھے بتائیں کس نے آپ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ میں آپ کے سامنے سرزنش کرتا ہوں اسے۔'' وہ پوچھ رہے تھے۔

''آپ نے پھر گوٹے کناری والی اردو بولنی شروع کر دی۔ سرزنش...... شان میں گستاخی......'' میڈم تہمینہ نے منہ بگاڑ کر ان کے جملے کو دہرایا پھر ناک چڑھا کر مزید بولیں۔

''اب پتا نہیں آپ کو یہ شان میں گستاخی لگے گی یا جان ریمبو میں لیکن آپ کے یہ مرجانے کمبخت مارے شاگرد مجھے دیکھتے ہی کہتے ہیں فٹ بال کو جس طرف سے مرضی من لو (ماپ لو) ایک ہی جیسا سائز آتا ہے۔'' وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔ ماسٹر جی چپ کے چپ رہ گئے۔ اس قسم کی شکایتیں انہیں پہلے کبھی سننے کو نہیں ملی تھیں۔ انہیں بے حد برا لگا۔

''میں بات کروں گا ان سب سے۔ ان سب کے کان کھینچوں گا۔ آپ فکر نا کریں۔'' انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اپنایا تھا۔

''اوہ جی فکر کس بات کی، میرے کون سا مامے کے پتر ہیں یہ۔ کہہ تو رہی ہوں کہ آپ کا لحاظ ہے ورنہ ان جیسوں کو تو میں منہ نا لگاؤں۔'' میڈم تہمینہ ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں بولی تھیں۔

''اچھا چھوڑیں ان سب کو۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا خدمت کروں آپ کی۔ ٹھنڈی پیپسی منگواؤں۔ پسند ہے نا آپ کو......!'' ماسٹر جی کو ان کی دلجوئی بڑی عزیز تھی۔

''منگوالیں پیپسی...... لیکن وہ شیشے کی پرانی زمانے والی بوتل نا منگوانا۔ وہ کوئی نہیں پیتا اب، میرے لیے تو ایک کین منگوادیں۔ میڈم تہمینہ کا بھی ایک اسٹینڈرڈ ہے۔ یہ کمہاروں والی کالی پیلی شیشے کی بوتلیں جچتی نہیں میرے ہاتھ میں۔''

وہ ناک چڑھا کر بولی تھیں۔ ماسٹر جی نے سر ہلاتے ہوئے رب نواز کو آواز دی تھی۔

''اس حرام خور کو کیوں بلا رہے ہیں۔ اس کی تو شکل دیکھنے کو دل نہیں کرتا میرا۔'' میڈم تہمینہ کچھ زیادہ ہی مغرور ہوئی جا رہی تھیں۔

اس اثناء میں رب نواز وہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی سخت سے تھے۔

''میڈم کو سلام نہیں کیا تم نے۔'' ماسٹر جی نے گھرکنے والے انداز میں کہا تھا۔

''سلام!'' رب نواز نے ان کے چہرے کی جانب دیکھے بناء سلام کیا تھا۔

''اونہہ، دفع...... کوئی ضرورت نہیں مجھے سلامتی کی دعائیں دینے کی۔'' وہ ناک چڑھا کر بولیں۔ ماسٹر جی کو ان دونوں کے انداز اچھے نا لگے۔ یہ معاملہ کچھ گمبھیر ہوا جا رہا تھا۔ انہوں نے رب نواز کو کولڈ ڈرنک لینے بھیج دیا تھا لیکن دل ہی دل میں تہیہ کیا تھا کہ وہ اب اس معاملے کو سلجھا کر دم لیں گے۔

☆☆☆

''امی حضور...... کیا کر رہی ہیں آپ۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ میں کتنا مس کر رہا ہوں آپ کو؟ اور آپ ہیں کہ میری طرف دیکھتیں بھی نہیں۔'' التمش نے بہت لاڈ سے انہیں پکارا تھا۔ انہوں نے اخبار جہاں سے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر ناک چڑھا کر بولیں۔

''کام کی بات کرو، کیا کام ہے۔ میں اب عُمر کے اس حصے میں نہیں ہوں کہ مکھن لگانے سے بہلائی جاسکوں۔'' انہوں نے اسی انداز میں کہا تھا۔ سارا دھیان تین عورتیں تین کہانیوں والے صفحے کی جانب مبذول تھا۔ التمش نے چڑ کر انہیں دیکھا۔

''آپ تو کبھی بھی عمر کے اس حصے میں نہیں تھیں جب بھی پیار سے بات کرو آپ کو مکھن کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ خدا جانے وہ کون سی کرموں والی اولادیں ہوتی ہیں جن کے ماں باپ ان سے پیار سے بات کرتے ہیں۔ آپ تو ہمیشہ ہی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔'' اس نے مصنوعی ناراضی سے کہا تھا۔ مہناز بیگم نے جذباتی بلیک میلنگ کا ذرا بھی خیال نا کیا تھا۔ ان کی تو ساری دلچسپی اس مظلوم عورت میں تھی جس کی کہانی وہ اخبار جہاں میں پڑھ رہی تھیں۔

''دوڑ سکتی ہوں بھلا اس عمر میں؟ خواہ مخواہ کے بلبلے نا بناؤ، اصل بات بتاؤ۔'' انہوں نے اس کی جانب دیکھے بناء کہا تھا۔

''توبہ ہے امی! کس قدر مغرور ہیں آپ اور کس وجہ سے مغرور ہیں یہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اللہ جانے ذرا سی حسین ہوتیں تو کیا کرتیں ابھی تو بس کرم ہی ہے اللہ کا۔'' وہ ابھی انہیں چڑا ہی رہا تھا۔ مہناز بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی جسے انہوں نے میگزین کی آڑ میں چھپایا تھا۔

''یہ جو بتیس الفاظ کا ڈائیلاگ بولا ہے تم نے۔ یہ بھی مجھ پر اثر نہیں کرنے والا۔ مجھے بس وہ کام بتاؤ جس نے سرِ شام تمہیں میرے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا ہے ورنہ تمہیں تو اپنے موبائل سے فُرصت ہی نہیں ملتی۔'' چہرے کے بالکل سامنے اخبار پھیلاتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ التمش نے اخبار کے عقب سے بھی ان کے اس شکوے کو محسوس کیا۔

''میرے موبائل سے تو آپ خواہ مخواہ خار کھاتی رہتی ہیں۔ کچھ نہیں ہے اس میں۔ بس جاب تلاش کرتا رہتا ہوں اس پر، سی وی بھیجتا ہوں، درخواستیں بھجواتا ہوں۔ آپ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہیں۔'' اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ مہناز بیگم نے فوراً اخبار چہرے سے ہٹایا تھا۔

''تم نوکری تلاش کر رہے ہو؟'' انہوں نے سوال کیا تھا۔ التمش نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

''یہ بیٹھے بٹھائے نوکری کا خیال کیسے آگیا؟'' انہیں اچھا تو بہت لگا لیکن پھر بھی ذرا چہرہ اور لہجہ کرخت کر کے پوچھا تھا۔ التمش نے بغور انہیں دیکھا پھر ناک چڑھا کر بولا۔

''کتنا شرمندہ کیا ہے آپ سب لوگوں نے مل کر مجھے پھپھو کے گھر۔ سب ایک ہی سوال کیے جا رہے تھے کہ کوئی نوکری بھی کرتے ہو یا نہیں۔ تو بس میں نے سوچا کہ بہتر ہے جاب کر لوں ویسے بھی فائنلز تو سمجھو سر پر ہیں۔ پھر انٹرن شپ ایک طرح سے نوکری ہی ہے۔'' مہناز بیگم نے میگزین کو تہ لگایا اور پھر پوری دل جمعی سے بیٹے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ انہیں جانے کیوں ایسا لگا کہ التمش نے سونیا کی وجہ سے جلد از جلد نوکری کا فیصلہ کیا ہے۔

''یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے سن کر، اللہ تمہیں ضرور کامیابی دے گا۔'' وہ دعا دے رہی تھیں۔

''وہ تو ضرور دے گا اللہ لیکن آپ بھی کچھ دیں گی یا نہیں۔ پیسے چاہئیں مجھے تھوڑے سے۔'' اس نے وہ مقصد اُگل دیا تھا جس نے اسے ان کے پاس

اس وقت بیٹھنے پر مجبور کیا تھا۔

''ارے......وہ پانچ ہزار کہاں گئے جو کل دیے تھے۔'' مہناز بیگم نے سوال کیا تھا۔

''کل نہیں......ایک ہفتہ پہلے یعنی سات دن اور آپ کو پتا بھی ہے پانچ ہزار کی قدر کیا ہے۔ کچھ نہیں آتا اب پانچ ہزار کا، ایک وقت ہینڈ آؤٹس لو تو فوٹو اسٹیٹ والا دو ہزار لے لیتا ہے اور آپ سوال جواب کیے بناء اگر چند ہزار روپے دے بھی دیں گی تو کون سا آپ کے خزانے میں کمی آجائے گی اور پھر کل کلاں کو جب میری جاب ہوجائے گی تو سب کچھ آپ کی ہتھیلی پر رکھا کروں گا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا تھا۔

''ارے کہیں رکھ ہی نا دو تم میری ہتھیلی پر۔ یہ بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں؟'' انہوں نے اپنی جانب سے بحث ختم کی تھی۔

''بیس ہزار۔'' التمش نے کہا تھا۔ مہناز بیگم کا منہ کھل سا گیا۔

''بیس ہزار......؟ اتنے سارے پیسوں کا کیا کروگے؟'' وہ حیران ہوئی تھیں۔ ماسٹر جی اسے بیس ہزار پاکٹ منی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان سے پیسے لیتا رہتا تھا لیکن بات دو ہزار پانچ ہزار سے آگے کبھی نا گئی تھی۔

''یا اللہ! ساری اولادوں کو ماں باپ کے ظلم سے بچا، آمین۔ امی بیس ہزار اتنی بڑی رقم نہیں ہے جتنا بڑا سوالیہ نشان بنا لیا ہے آپ نے چہرے پر۔'' اسے بحث سے الجھن ہونے لگی تھی۔

''لیکن کروگے کیا ان پیسوں کا اور وہ تمہاری پاکٹ منی ختم ہوگئی کیا؟'' وہ سوال جواب کیے بغیر بیٹے کو پہلے بھی روپے دینے کی عادی نہیں تھیں اور اب تو اس کا مطالبہ بھی کچھ بڑا تھا۔

''جو پاکٹ منی وہ مجھے دیتے ہیں نا ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلتی، تب ہی تو آپ سے مانگتا پھرتا ہوں۔ بتا تو رہا ہوں کہ جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔ جاب ہنٹنگ کو آسان سمجھتی ہیں آپ۔ اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، ایک دوست کے بھائی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں سیلز منیجر ہیں، اس کو ڈنر دینا ہے کسی اچھی جگہ۔ تعلقات بہت کام آتے ہیں ایسے معاملات میں، اس لیے مانگ رہا ہوں آپ سے روپے۔'' اس نے جیسے سب اُگل ڈالا تھا۔ مہناز بیگم نے ایک لمحے کے لیے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''اچھا، دے دیتی ہوں لیکن ابھی بارہ پندرہ ہی ہوں گے میرے پاس۔ شام کو ماسٹر جی سے لے کر دوں گی باقی کے پانچ۔'' انہوں نے ہامی بھری تھی۔ التمش نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے لیکن یاد سے دے دیں۔ یہ بہت ہی ضروری معاملہ ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ مہناز بیگم نے مزید کچھ کہے بغیر دوبارہ سے میگزین اٹھا کر چہرے کے سامنے کرلیا تھا۔

''اتنی جلدی ہے تو جا کر ماسٹر جی سے لے آؤ۔'' پھر انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ التمش نے ناک پھلا کر انہیں دیکھا۔

''ماسٹر جی سے ہی منگوانے تھے تو اتنی انکوائری کرنے کیا ضرورت تھی۔'' اس کا مزاج پھر بگڑ گیا تھا۔ مہناز بیگم بناء کوئی اہمیت دیے میگزین میں مگن رہی تھیں۔

☆☆☆

''میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے دوبارہ شکایت نا ملے۔ تاکید بھی کی تھی لیکن مجال ہے تم سب پر کوئی اثر ہوتا ہو۔'' ماسٹر جی سخت ناراض تھے اور اس بات کا احساس ان کے شاگردوں کو بخوبی تھا۔ وہ سب کے سب آنکھیں نیچی کیے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ سب کا سرغنہ بنا رب نواز کچھ کہنے کو منہ کھولتا تھا لیکن پھر ان کے تاثرات دیکھ کر چپ رہ جاتا تھا۔

''میں نے آج تک کبھی کسی بہن بیٹی سے ایسی

بات نہیں سُنی۔ کبھی کسی نے ایسے منہ بھر کر مجھے نہیں کہا کہ آپ کے شاگرد تمہاری عزت نہیں کرتے۔ ایک خاتون کے منہ سے یہ بات سننا کیسا لگتا ہے، تم لوگوں کو احساس بھی ہے اس بات کا۔'' وہ بہت ناراض تھے۔

''اس کام میں ایک عزت ہی تو کمائی ہے اب تک۔ بتیس سال ہوگئے ہیں اس جگہ بیٹھے، مجال ہے کبھی کسی کا ایسا طعنہ سنا ہو۔ لوگ آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں مجھ پر، تم سب لوگوں کو پہلے سے بتایا تھا کہ بہن بیٹیاں آتی ہیں یہاں۔ اگر تو عزت کرسکو عورت کی تو یہاں جگہ ہے ورنہ دروازہ پیچھے کی طرف ہے، پہلے سے سمجھایا تھا تم لوگوں کو، لوگ اپنے گھروں کی عزت کو آنکھیں بند کر کے ماسٹر جی کی چوکھٹ پر بھیج دیتے ہیں' کیوں؟ کیونکہ ان کو پتا ہے کہ ماسٹر جی کے یہاں ان کی تکریم ہوگی ورنہ جگہ جگہ ہمارے جیسے بیٹھے رُلتے ہیں، کم بختو! بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' وہ ایک ایک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات کررہے تھے۔

''ماسٹر جی! ہم نے کچھ نہیں کیا۔'' رب نواز نے منمنانا چاہا لیکن ماسٹر جی نے اسے گھرک دیا۔

''خبردار جو آواز نکالی منہ سے، سب سے زیادہ تو تجھ پر بھروسا کر کے خوار ہوا میں۔ تاکید کی تھی تجھے کہ لاما (شکایت) نا آئے کوئی میڈم کا۔ کیا کیا باتیں سنا کر گئی ہیں مجھے وہ۔ او بے ہدایتو بے شرمو! تم لوگ آوازیں کستے ہو بہن بیٹیوں پر۔ الٹے سیدھے لفظ بولتے ہو ان کو، اتنی ہتک آج سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی مجھے، آج ہوئی۔ وہ بھی تم لوگوں کی وجہ سے۔''

''آپ بات تو سُن لیں ماسٹر جی ایک بار، بخدا ہمارا قصور نہیں ہے۔ میڈم تہمینہ ایویں جذباتی ہوجاتی ہیں۔''

''اوئے، چُپ کر تُو......خواتین جذباتی ہی ہوتی ہیں اگر میڈم بھی ہوگئیں تو کیا ہوا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم لوگ مسخریوں پر اتر آؤ، اپنا آپ بھول جاؤ۔''

''ستیاناس......میں نے کہا تھا کہ ماسٹر جی نہیں سنیں گے ہماری...... ہماری وضاحت میڈم کے الزام کے سامنے بے کار ثابت ہوگی۔'' صابر نے بڑبڑا کر کہا تھا۔

''حبیب بنا سپتی...... کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے۔'' شکیل جو عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا نے بھی بڑبڑا کر کہا تھا۔ ماسٹر جی نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی اس کے کندھے پر زور سے ماری۔

''کمبخت! کیا بڑبڑا رہا ہے۔ با آواز بلند کہو جو کہنا ہے۔'' وہ غرائے تھے۔ شکیل نے فوراً چہرے پر بے چارگی طاری کی۔

''میں ان سب سے کہہ رہا تھا کہ معافی مانگ لیتے ہیں اسی میں بھلائی ہے، معاف کردیں ماسٹر جی!'' اس نے بات بنائی تھی۔

''کوئی معافی نہیں ملے گی، تم سب لوگوں کی وجہ سے بہت دل دکھا ہے میرا۔ تم لوگوں نے دو کوڑی کی کردی ہے میری عزت۔'' وہ بے زار ہوکر بولے تھے۔

''ماسٹر جی آپ بات تو سنیں، ہم نے میڈم سے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ ہم بس انہیں سمجھا رہے تھے کہ......'' ماسٹر جی نے اس کی بات کاٹی۔

''اوہ چپ کرجا، خبردار جو ایک لفظ بھی نکلا تیرے منہ سے۔ اتنی اوقات ہوگئی ہے تیری کہ تو میڈم کو سمجھا سکے۔ میں تین دن شہر سے باہر کیا گیا، پیچھے اتنا بڑا انقلاب آگیا۔ میرے کھوتے کسی کو سمجھانے کے قابل ہوگئے، ماشاء اللہ۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولے تھے۔ سارے لڑکے منہ لٹکائے کھڑے تھے لیکن سب کے چہرے پر ماسٹر جی کو بتانے کے لیے کوئی نا کوئی دلیل ضرور تھی جسے ماسٹر جی سننا نہیں چاہ رہے تھے۔ اسی اثناء میں التمش نے قدم اندر رکھے تھے ان سب کو ایک ساتھ اس طرح قطار میں سر جھکائے کھڑا دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں

رب نواز سے سوال کیا تھا۔ وہ چپ ہی رہا لیکن چہرے پر جو بے زاری پھیلی تھی وہ ماسٹر جی کو نظر آ گئی۔ انہوں نے چھڑی اٹھا کر ہلکے سے انداز میں اس کے کندھے پر ماری۔

”منہ دیکھو کیسے بنا رکھا ہے، جیسے کوئی غلطی نا کی ہو، نا ہنجار، کمبخت، نکما۔“ وہ سخت خفا تھے۔ التمش کو ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سے اندازہ ہو گیا کہ آج اس کی دال نہیں گلنے والی۔

”کیا ہو گیا، کیوں ڈانٹ رہے ہیں آپ انہیں۔“ اس نے پوچھا ان سے تھا لیکن دیکھ وہ ان ہی سب کی طرف رہا تھا۔

”ماسٹر جی ناراض ہیں التمش بھائی! میڈم تہمینہ نے بہت شکایتیں لگائی ہیں ہماری، وہ بھی جھوٹی۔“ شکیل نے فوراً عابیان کیا تھا۔

”اوئے تو پھر بولا اور جھوٹی کس کو کہا، میڈم کو۔ میڈم کو جھوٹی بولتا ہے۔“ انہوں نے چھڑی اس کو پھر دے ماری تھی۔

”کتنی بار کہا ہے کہ کسی کے لیے ایسا لفظ استعمال نہیں کرنا، کسی کو کچھ نہیں کہنا، عزت کرنی ہے سب کی..... سب کی..... آئی سمجھ۔“ وہ پھر غرائے تھے۔

”اچھا چلیں جانے دیں، معاف کر دیں سب کو۔ اچھے لڑکے ہیں یہ، غلطی ہو گئی دوبارہ نہیں کریں گے۔“ اس کو نہیں پتا تھا کہ مسئلہ کیا ہے لیکن وہ خود عجلت میں تھا اس لیے ماسٹر جی کو کہا تھا۔ ماسٹر جی نے ایک بار پھر ان سب کو گھور کر دیکھا۔

”چلو جاؤ شاباش، کام کرو سب۔“ التمش نے ان سب کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ سب تو منتظر تھے کہ کوئی انہیں آزادی کا پروانہ دے۔

”التمش بھائی زندہ باد، التمش بھائی زندہ باد۔“ وہ سب مزاحیہ انداز میں پریڈ کرتے باہر نکل گئے۔ رب نواز نے التمش کو اشارہ کیا تھا کہ میری بات سن کر جانا۔ التمش نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے مثبت جواب دیا تھا۔

”یہ جلیبی لایا تھا آپ کے لیے۔ امی نے کچھ روپے منگوائے تھے۔“ اس نے پہلے جلیبی کی تمہید باندھی تھی بعد میں اپنی عرض پیش کی تھی آنے سے پہلے رب نواز کو فون کرنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ اسے ماسٹر جی کی خفگی کی خبر پہلے سے ہو گئی تھی اسی لیے ان کی پسندیدہ چیز لے آیا تھا۔ ماسٹر جی جلیبی کا ذکر سنتے ہی خوش ہو گئے۔ التمش پہلے بھی کسی مخصوص ہوٹل سے ان کے لیے شوگر فری جلیبی لایا کرتا تھا جو انہیں کافی پسند تھی۔

”رب نواز سے لے لو روپے۔ کتنے چاہئیں۔“ انہوں نے جلیبی والا پیکٹ پکڑ لیا تھا

”امی نے فون نہیں کیا آپ کو؟“ اس نے پوچھا تھا۔ ماسٹر جی جلیبی کھانے میں مگن ہو گئے تھے۔

”دس لے رہا ہوں۔“ اس نے کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھا تھا۔ انہوں نے جلیبی کا مزا لیتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔

”تھینک یو ماسٹر جی۔“ وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ کیسا ہے؟“ انہوں نے نے ایک سنہرا سا کپڑا اس کے سامنے پھیلایا تھا۔ باریک سی نیٹ پر تارے ہی تارے ٹکے تھے۔ اس نے ایک نظر دیکھا پھر دوبارہ سے لیپ ٹاپ دیکھنے لگی۔

”اچھا یہ پسند نہیں آیا، تو یہ دیکھ لو۔“ انہوں نے سبز اور ہلکے نیلے سے رنگ کا ایک اور نفیس سا کپڑا اس کے سامنے پھیلایا تھا۔

”یہ پنڈی سے میری کزن لے کر آئی تھیں۔ انہوں نے تو نہیں بتایا لیکن ہاتھ لگانے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ بہت مہنگا ہے، چھو کر تو دیکھو۔ کیسا ملائم ہے، رنگ بھی کتنا پیارا ہے۔ وہ تو تمہاری منجھلی آپی کے لیے لائی تھیں اس کی شادی پر لیکن میں نے تب سے ہی سنبھال کر رکھ لیا تھا کہ اپنی محراب کو دوں

گی اس کی شادی پر۔“ انہوں نے لفظ ”شادی“ پر زور دیتے ہوئے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔ یہ والا نیٹ کا کپڑا انہوں نے کب سے سنبھال کر رکھا تھا ایک دو بار سونیا نے مانگا بھی تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

”اس کے ساتھ پٹیالہ شلوار یا غرارہ بنوالینا، آج کل بڑا فیشن ہے نا۔“ وہ بے حد مگن ہو کر بول رہی تھیں۔ سونیا نے موبائل سے نظر ہٹا کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ کتنی مطمئن لگتی تھیں اس کے دل میں جیسے موہوم سی بقیہ امید بھی دم توڑ گئی تھی کہ شاید بھتیجے کے رویے نے اس کی امی کو کچھ باور کروایا ہو لیکن ان کا اشتیاق اور اطمینان دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ پر امید ہو گئی ہیں۔ وہ چند لمحے بس ایسے ہی ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ دل جیسے بالکل کرچی کرچی ہو گیا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ سر ہلا دیا تھا۔ انہوں نے اس کی جانب دیکھا پھر بولیں۔

”شفق کی شادی کے لیے کہہ رہی ہوں، اگلے مہینے کی تاریخ طے ہوئی ہے۔“ انہوں نے اس کی ایک کزن کا نام لیا تھا اور گویا وضاحت کر دی تھی۔ سونیا نے ان کی بات کو بغور سنا پھر جیسے اسے تسلی ہوئی تھی کہ وہ اسے کسی اور کی شادی کے لیے کپڑے بنوانے کو کہہ رہی ہیں تو اس کی دلچسپی موضوع میں بڑھ گئی تھی۔

”یہ اچھا لگ رہا ہے، اس کا غرارہ بنالیتی ہوں۔ ساتھ نیلے گہرے رنگ کی نیٹ کی قمیص اچھی لگے گی نیٹ ہی کا دوپٹا لے لیں گے۔ میں نے انٹرنیٹ پر دیکھا تھا، بہت اچھے بنے بنائے نیٹ کے ایمبرائڈڈ دوپٹے مل رہے ہیں آن لائن۔ ہاتھ کی کڑھائی والے ہیں، ٹھہریں دکھاتی ہوں آپ کو۔“ وہ ان کی جانب دیکھے بناء کہہ رہی تھی پھر ساتھ ہی گود میں پڑا موبائل اٹھا لیا۔ اب کی بار عطیہ بیگم نے بغور اسے دیکھا۔ اتنی دلچسپی پہلے تو کبھی اس نے ایسے ملبوسات میں نہیں لی تھی اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ محتاط سی ہوئیں جبکہ وہ اپنے موبائل پر ہاتھ مارنے میں مگن تھی۔ چند ایک ساعتوں بعد ہی اس نے انہیں کچھ تصاویر دکھائی تھیں۔

”یہ دیکھیں، اچھے لگے تھے مجھے۔ بہت سارے رنگ ہیں اور قیمت بھی بڑی مناسب سی بارہ، بارہ سو روپے میں اور ڈیلیوری بھی فری۔ آپ کہیں تو آرڈر پلیس کروں؟“ وہ بے حد انہماک سے انہیں دکھا رہی تھی۔

”دکھاؤ، ذرا بڑا کرو اسے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑا تھا۔ دل میں ابھی بھی مخمصے کا شکار تھیں کہ وہ مذاق یا طنز نا کر رہی ہو جبکہ وہ تو انہیں ایک کے بعد ایک تصاویر دکھانے میں مگن تھی۔ عطیہ بیگم نے تذبذب کے عالم میں تصاویر دیکھنی شروع کر تو دی تھیں لیکن پھر اس کا انہماک اور دلچسپی محسوس کر کے انہوں نے چند ایک چیزیں پسند کر لی تھیں۔ سونیا نے بھی فرماں بردار بیٹیوں کی طرح اسی وقت آرڈر دینا شروع کر دیا تھا۔

”ایک ہفتے کے اندر مل جائے گی ڈیلیوری۔ بہاولپور سے بنواتے ہیں یہ لوگ، دیکھنے میں تو زبردست لگ رہے ہیں۔ اب ایک ہفتے بعد ملیں گے تو پتا چلے گا کہ واقعی اچھے ہیں یا فوٹو شاپ کا کرشمہ ہے۔“ اس کا انداز ایسا تھا کہ عطیہ بیگم کو بہت اچھا لگا۔ ان کے دل کو بڑا سکون ملا تھا۔ اب یہی مناسب موقع تھا کہ وہ اپنی بات کر لیتیں۔

”میں نے تمہارے ابو سے بات کی ہے، بتایا ان کو میزاب کا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ ایک بار پھر ویزا اپلائی کر رہی ہے لیکن وہ بھی تمہاری وجہ سے پریشان ہیں کہ ایک بچی کی خاطر جا رہے ہیں تو دوسری بچی کا کیا کریں۔“ یہ تمہید تھی۔ سونیا الرٹ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم میری بات کو تحمل سے سننا، سنے بناء ہی چلانا مت شروع کر دینا۔ عادت کے مطابق، ہم۔ز

یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تین مہینے کے لیے چلے جاتے ہیں اور رہی تمہاری بات تو تم اتنا عرصہ اپنے ماموں کے یہاں کراچی میں رہ لو۔ صرف تین مہینے کی بات ہے میں جانتی ہوں تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگ رہی ہوگی لیکن بعض اوقات بیٹیوں کو بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ماں باپ کے ساتھ تعاون کرنا ہی پڑتا ہے، تم سمجھ رہی ہونا۔'' انہوں نے کہا تھا سونیا نے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ کتنے آرام سے یہ بات کہہ گئی تھیں انہیں احساس تو تھا کہ اسے یہ بات یا پیشکش بالکل بھی پسند نہیں آئے گی۔ وہ کبھی کسی بات پر ان سے بحث نہیں کرتی تھی۔ ایک ''التمش'' کا ہی موضوع تھا جو ان کے درمیان باعثِ تنازعہ تھا لیکن وہ اس بات کو اہمیت ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی طرح ان کا چہرہ دیکھتی رہی کہ وہ نظریں چُرانے پر مجبور ہوگئی تھیں۔

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے کہا تھا اور پھر دوبارہ سے لیپ ٹاپ کی جانب مگن ہوگئی جیسے یہ کوئی بہت عام سی بات ہو۔ عطیہ بیگم نے اس کی فرماں برداری کو بہت دل سے محسوس کیا تھا۔

''تم نہیں جانا چاہتی تو بتادو، اب ایک بیٹی کو خوش کرنے کے لیے دوسری کو تو ناراض نہیں کرسکتی میں۔ اللہ مالک ہے اس بیٹی کا بھی، آخر پہلا بچہ بھی تو اکیلے ہی پیدا کرلیا تھا اس نے۔'' وہ کہہ گئی تھیں۔ ان کا مقصد سونیا کو جذباتی طور پر بلیک میل کرنا نہیں تھا

''نہیں، رہ لوں گی چار، چھ مہینے۔ اتنا عرصہ تو رہ ہی سکتی ہوں ویسے بھی میں ڈیزائننگ وغیرہ کے کورس کرنا چاہ رہی تھی۔ باقاعدہ ڈریس ڈیزائننگ سیکھ لیتی ہوں وہاں کراچی میں تو اچھے مواقع مل جائیں گے۔ آپ فکر نا کریں چلی جاؤں گی۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا تھا۔ عطیہ بیگم کا دل پھر بھی بے چین ہی رہا تھا۔ یہ بے چینی انہیں اب مسلسل ستانے لگی تھی۔

☆☆☆

''تم دس منٹ لیٹ ہو لیکن تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ دس منٹ کی تاخیر اگنور کی جاسکتی ہے۔'' التمش نے زرمین کو بہت دھیان سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے اس کے پسندیدہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ سفید سی شرٹ پر سیاہ نیٹ کا ڈیزائن بنا تھا۔ کندھوں تک آتے سلکی بال آگے پیچھے اس طرح سے سجا رکھے تھے کے چہرے پر ان کا سایہ پڑتا تھا۔ میک اپ پر آج ضرورت سے زیادہ محنت کی گئی تھی۔ زرمین کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی اور پھر پھیل سی گئی۔ گال پر ڈمپل ایک دم نمایاں ہونے لگا تھا۔ آج اس کی برتھ ڈے تھی اور التمش نے پہلی بار اسے اس طرح ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے نسبتاً ایک غیر معروف لیکن تیزی سے مقبول ہوتا ہوا ریسٹورنٹ منتخب کیا تھا۔ سرمئی سیاہ سوٹ میں وہ خود کسی فلمی ہیرو کی طرح تیار ہوکر آیا تھا۔ اس کے وجود سے بہترین پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی۔ اس نے زرمین کو ٹیوب روز کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بھی پیش کیا تھا۔ ان کے درمیان ابھی تک ایسی رومانٹک باتیں ظہور پذیر ہوئی ہی نہیں تھیں۔ ان دونوں کو ہی ہر چیز نئی اور اچھوتی لگ رہی تھی۔ زرمین خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہی تھی۔

''اچھی لگ رہی ہوں؟'' زرمین پوچھ رہی تھی۔ التمش بہت ہی کم اس کی تعریف کرتا تھا اور جب کرتا تھا تب بھی مذاق میں ہی کرتا تھا لیکن آج ناصرف اس نے تعریف کرڈالی تھی بلکہ وہ جس انداز میں اسے نظر بھر بھر کر دیکھ رہا تھا۔ زرمین خوش ہوئی چلی جارہی تھی۔

''بے حد۔'' وہ آج کافی فراخ دل ہورہا تھا۔ زرمین پھر مسکرائی تھی۔ التمش نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر آتے بال اس کے کان کے پیچھے اڑس دیے تھے۔

''دل چاہ رہا ہے اپنا آپ تم پر وار کر کہیں دور پھینک دوں۔'' اس نے سرگوشی کی تھی۔ زرمین نے

ادھر اُدھر دیکھا۔ التمش کا انہماک اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''تم مجھے کنفیوز کررہے ہو۔'' وہ مزید مسکرائی تھی۔

''کنفیوز ہوکر تم اور زیادہ خوب صورت لگنے لگی ہو۔'' وہ مسکراتا بھی تھا تو اسے آنکھوں میں بھر کر۔ زرمین کو اپنا چہرہ اس کی آنکھوں میں محسوس ہونے لگا تھا۔ اب کی بار اس سے کچھ نہیں بولا گیا۔ وہ بس مسکراتی رہی تھی۔

''آج تو دل چاہ رہا ہے خالہ کے دیور کو گلے لگا کر شکریہ بول کر آؤں۔ کیسا اچھا آدمی تھا۔ اتنی جلدی سرنڈر کردیا اس نے...... ورنہ میرا تو زندگی بھر کا نقصان ہوجاتا۔۔۔'' وہ اعتراف کررہا تھا۔

''تمہاری پھپھو کی بیٹی نے تو ابھی تک سرنڈر نہیں کیا نا...... ورنہ میں بھی یہی بات اتنے سکون......'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ التمش نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چُپ کروادیا۔

''شش...... آج بس ہم دونوں کی بات ہوگی۔ کسی دوسرے کو یاد نہیں کریں گے ہم۔'' التمش نے اتنا کہا پھر میز پر کہنی ٹکا کر اس پر اپنی ٹھوڑی اٹکا کر مزید اطمینان سے اسے تکنے لگا تھا۔

''زرمین! تمہیں احساس بھی ہے کہ اتنا خوب صورت لگنا اِل لیگل بھی ہوسکتا ہے۔'' وہ مسلسل اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جبکہ زرمین واقعی کنفیوز سی ہوئی جارہی تھی مگر دل ہی دل میں اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

''آئی لو یو زرمین! آئی ریئلی ڈو۔ تمہارے بناء تو زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں رہا میرے لیے اب......''

اس نے ٹیبل پر دھرے زرمین کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنی انگلی رکھ کر اس کے لمس کو محسوس کیا تھا۔ زرمین اب چپ چاپ بس اس کے الفاظ میں پنہپی اس کی محبت کی شِدت کو محسوس کررہی تھی۔ التمش نے کوٹ کی جیب سے مخملیں ڈبیا نکالی تھی۔ زرمین اس ڈبیا کو دیکھ کر ہی جیسے چونک سی گئی تھی۔ وہ اس سب کی توقع نہیں کررہی تھی۔ اس کے لیے تو یہ ایک برتھ ڈے ڈنر تھا لیکن یہ تو ایک باقاعدہ پرپوزل کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی اور طمانیت ایک ساتھ چھلکنے لگی تھی۔ التمش نے ڈبیا کو کھولا اور اس کے سامنے کردیا۔ نفیس سی پلاٹینم کی انگوٹھی زرمین کے سامنے تھی۔

''مجھ سے شادی کروگی زرمین؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ زرمین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ہنسی میں بدلنے لگی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ! التمش تمہیں احساس بھی ہے کہ کسی کو اتنی خوشی دینا بھی اِل لیگل ہوسکتا ہے۔ یہ بھی کرائم ہے۔ میں خوشی سے مر بھی سکتی ہوں۔'' وہ جوش میں آکر جو سوچ رہی تھی وہی بولتی جارہی تھی۔

''بولو نا زرمین! شادی کروگی مجھ سے!'' وہ اپنی بات پر بضد تھا۔ زرمین بے تحاشا ہنسی پھر اس نے زور زور سے سر ہلایا۔

''یس...... یس...... یس......'' اس کی خوشی اس کے ہر عضو سے چھلک رہی تھی۔ التمش نے ڈبیا سے انگوٹھی نکال کر دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی انگلی میں پہنادی تھی۔

''آج سے التمش تمہارا ہوا زرمین! صرف تمہارا۔ اب مت پالنا کوئی خدشہ۔ مت سوچنا کوئی الٹی سیدھی بات۔'' وہ اتنے مستحکم لہجے میں بولا تھا کہ زرمین اسے یک ٹک دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے ہی نہیں پورے وجود سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوشی کے باعث نم ہونے لگی تھیں۔

''اچھا چلو اب مجھے گھورنا بند کرو اور مجھے ذرا تسلی سے اللہ کا شکر ادا کرلینے دو۔ کیسی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے ہمیشہ ہی بہترین سے نوازا ہے اور اسی لیے تو پبلک جلتی ہے مجھ سے۔ بتاؤ ایک طرف پھپھو

کی بیٹی کوستی رہتی ہے اور دوسری طرف کسی کی خالہ کے دیور نے بھی بددعاؤں میں رکھ لیا ہوگا ہمیں، خیر ہمیں کوئی ڈر نہیں۔ ہمیں تو ''تم'' مل گئی ہو۔ اب سب کچھ سہہ لیں گے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھر مسکرایا تھا۔ زرمین تو بس اپنے ہاتھ کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ ہاتھ کس قدر قیمتی ہوگیا تھا اس کے لیے۔ ایک ننھی سی انگوٹھی انگلی میں کیا آ سجی تھی، لگتا تھا کائنات ہاتھ میں سما گئی ہے۔

☆☆☆

''عطیہ اور بھائی جان کینیڈا جا رہے ہیں'' انہوں نے جیسے ماسٹر جی کے سامنے کوئی راز اُگلا تھا۔ چہرے پر عجیب سی شرارتی مسکراہٹ تھی، ماسٹر جی سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ نیند ہلکی ہلکی کروٹیں لیتی ان کی آنکھوں میں آسمائی تھی۔ بیگم کی بات سن کر وہ کچھ حیران ہوئے اور آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگے۔

''میزاب بلوانا چاہ رہی تھی کب سے لیکن کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ سونیا کی پریشانی تھی نا لیکن اب چونکہ سب مسائل حل ہوگئے ہیں نا۔ اس لیے ان لوگوں نے سوچا ہے کہ کینیڈا ہی گھوم آئیں۔ میزاب کے یہاں اچھی خبر متوقع ہے تو عطیہ اس کی مدد اور تیمار داری کے لیے وہاں رُکیں گی تین مہینے یا چھ مہینے۔'' مہناز بیگم بھی بستر پر ہی آ بیٹھی تھیں۔

''بچی کا کیا کریں گی، یہ مسئلہ تو ابھی تک جوں کا توں ہے۔'' ماسٹر جی نے بات برائے بات پوچھ لیا تھا۔ مہناز بیگم شرارتی سے انداز میں مسکرائیں۔

''بچی اب ان کی نہیں رہی، اب وہ ہماری امانت ہے۔ ہم سنبھالیں گے۔'' ماسٹر جی نے کروٹ ان کی جانب بدلی۔

''اپنے ہونہار سپوت سے بھی پوچھ لیجیے گا یہ بات ایک بار۔'' ماسٹر جی نے خوابیدہ آنکھوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے طنز کیا تھا۔

''یہ پوچھ پڑتال آپ کا کام ہے ماسٹر جی! جوان اولاد سے میں تو نہیں کروں گی نا یہ بات۔ میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ سونیا کو کس کمرے میں ٹھہرانا ہے۔ پانچ چھ مہینے رہے گی یہاں، ایک الگ کمرہ ہونا چاہیے اس کے لیے۔'' وہ اپنی دھن میں بول رہی تھیں۔

''آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ وہ اتنا عرصہ ہمارے ساتھ رہے گی؟ ماسٹر جی کے چہرے پر حیرانی اور تجسس ایک ساتھ آیا تھا۔

''بالکل ہمارے ساتھ ہی رہے گی، کیوں، آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟'' وہ ان سے پوچھ رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے لیٹے لیٹے سر جھٹکا۔

''میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے آپ کی نظر میں۔ آپ خود بھی جانتی ہیں ایک میان میں دو تلواریں سجائی تو نہیں جاسکتیں۔ ہاں پھنسائی ضرور جا سکتی ہیں، آپ یہ ہی کر رہی ہیں۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سمائیں گی بی بی!'' وہ اب غنودگی مزید شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

''انسان جب کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے نا ماسٹر جی تو میان میں تلواریں تو کیا چھریاں کانٹے چمچے سب سمائے جاسکتے ہیں۔ بس ہمت درکار ہوتی ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمت کی کمی نہیں ہے مجھ میں اور میں تو تہیہ کرچکی ہوں کہ مجھے سونیا کو اس گھر میں لانا ہی ہے۔ تب ہی تو یہ سب کرتی پھر رہی ہوں۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی ہیں۔ ماسٹر جی نے جماہی لی

''یہی تو سوال ہے کہ آپ کرتی کیا پھر رہی ہیں۔ میں تو سب کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں بی بی!'' ماسٹر جی اپنی اہلیہ کے سامنے کبھی بھی اپنی فہم و فراست کا اعتراف نہیں کرتے تھے۔ انہیں خود کو ناسمجھ ظاہر کرنے میں لطف آتا تھا۔

''یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے ماسٹر جی! آپ کا کیا خیال ہے یہ سب بیٹھے بٹھائے ہوگیا ہے۔ اچانک میزاب اپنے امی ابا کو اپنے پاس بلوا رہی ہے۔ سونیا اپنا گھر چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ رہی ہے۔ عطیہ اتنی دور جا رہی ہیں۔'' وہ ان سے پوچھ رہی تھیں۔ ماسٹر جی کی آنکھیں اب بالکل بند ہونے لگی تھیں۔

''میں نے پلاننگ کی ہے ساری، پہلے میزاب کو کال کی، اس کو اعتماد میں لیا۔ اس کو بولا کہ اپنے والدین کو بلوائے پھر عطیہ کو سمجھایا ہے کہ وہ جا کر رہیں کچھ دن بیٹی کے پاس۔ اس دوران سونیا یہاں رہ لے گی۔ اِن دونوں کو ساتھ رہنے کا موقع ملے گا تو ہی احساس ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ ویسے بھی التمش کی سوچ بہت مثبت ہوتی جا رہی ہے۔ نوکری تلاش کر رہا ہے آج کل۔ ابھی ایک بار ساہیوال کا چکر لگا کر آیا ہے اور جاب تلاش کرنی شروع کردی ہے۔ چھ مہینے کہیں مل بیٹھنے کا موقع مل گیا تو آپ دیکھیے گا کاروبار اور گھر بار کی باتیں کرنے لگے گا۔ میں اور عطیہ تو بہت پُرامید ہیں ماسٹر جی۔''

''کیا عطیہ جانتی ہے کہ التمش اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہے اور اس کی دلچسپی کہیں اور ہے؟'' ماسٹر جی نے پوچھا تھا۔ مہناز نے گھور کر انہیں دیکھا۔

''آئے ہائے، ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ رائی کا پہاڑ ایسے بنایا جاتا ہے۔ مجھے آج سمجھ میں آیا، کہیں نہیں ہے اس کی دلچسپی، بس وہ لاپرواسا ہے اور ابھی کھلنڈرے پن سے نہیں نکلا۔ اسے کیا پتا اس کے لیے کون مناسب ہے اور کون نہیں۔ اس عمر میں لڑکے ایسی غیر سنجیدہ باتیں کر جایا کرتے ہیں اور بعد میں بھول بھال جاتے ہیں۔ آپ اس کی طرف دھیان مت دیں اور مہربانی کر کے آپ بھی عطیہ کو مت بتا دیجیے گا۔ اسے پتا چل گیا تو وہ بھلا کریں گی سونیا کا رشتہ ہماری طرف۔ اسے تو میں یہی کہہ کر آئی ہوں کہ ابھی کھاتا کماتا کچھ نہیں ہے میرا بیٹا تو میں چپ ہوں ورنہ تو بچی کو شگون کی انگوٹھی پہنا کر ہی آتی۔'' مہناز بیگم نے کہا تھا۔

''آپ یہ ٹھیک نہیں کر رہیں، اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔'' ماسٹر جی نے ٹوکنا ضروری سمجھا تھا۔

''اوہو...... یہ ہی مناسب ترین حل تھا اس مسئلے کا۔ آپ اس طرح کہہ کہہ کر براہِ مہربانی کوئی بدشگونی مت پھیلائیں اور میرا ساتھ دیں۔'' ان کا لہجہ مستحکم تھا۔ ماسٹر جی بالکل نیند کے زیرِ اثر آچکے تھے۔ انہوں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

''یہ...... یہ چھلّے جیسی انگوٹھی، وہ بھی سونے کی نہیں لگ رہی۔ اس کو گارنٹی مان لوں میں؟'' ممی نے زرمین کی انگلی میں پڑی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا تھا۔ اسے بہت برا لگا۔

''ممی! وہ ابھی پڑھ رہا ہے۔ جاب نہیں کرتا جاب کرنے لگے گا تو اس سے زیادہ اچھی لے آئے گا۔ آپ ایسا کیوں سمجھتی ہیں کہ میں نے کوئی غلط انتخاب کیا ہوگا۔ بہت اچھا ہے التمش!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔ ان کے چہرے پر ناگواری سی پھیل گئی۔

''اب جب تمہیں پسند ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں لیکن......'' وہ چپ ہوئی پھر بولیں۔

''میری دعا ہے کہ تمہیں پچھتانا نا پڑے، روبینہ کے دیور میں ہزار ہا خوبیاں تھیں مگر تم نے اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ارے ایسی کئی انگوٹھیاں وار کر تم پر سے پھینک دیتا لیکن تمہیں تو یہ مشکل سے نام والا لڑکا پسند آ گیا ہے۔'' ان کے لہجہ میں ناگواری تھی۔

''ایسے تو مت کہیں، آپ ملیں گی اس سے تو آپ کو احساس ہوگا کہ میں نے کتنا اچھا فیصلہ کیا ہے۔'' وہ مسرور سے لہجے میں بولی تھی۔ کئی دن ہوگئے تھے اس کی برتھ ڈے کو لیکن وہ انگوٹھی اب بھی اس کی انگلی میں موجود تھی۔ اس کا دل ہی نہیں کرتا تھا کہ اسے انگلی سے اتار کر رکھے۔

"ملوں گی کب، یہ بھی بتادو۔ کب سے تو یہی کہہ رہی ہو کہ ملواؤں گی۔ یہ مبارک موقع آیا تو ہے نہیں اب تک۔" وہ کافی ناراض ہورہی تھیں

"ممی! آپ اس طرح اوور ری ایکٹ کیوں کرنے لگتی ہیں۔ آپ آج کہیں تو آج ہی ملوادیتی ہوں۔ آپ اور ڈیڈی ایک ساتھ گھر میں موجود ہوں تو میں اس کو انوائٹ کروں نا۔ وہ اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔ اس کو ذرا اچھے طریقے سے ہی انوائٹ کرنا پڑے گا نا۔ کچھ اچھا سا ماحول بنانا پڑے گا اس کے شایانِ شان۔" وہ پرجوش سی ہوئی تھی۔ اس کی ممی نے ناک چڑھائی۔

"اس نے تمہیں جو شایانِ شان انگوٹھی دے دی ہے نا۔ بس اتنی ہی اچھی توقع مجھ سے کرلو۔ بلوالو کسی دن گھر اسے، میں بھی بریانی اور رائتہ میز پر رکھ کر اپنا فرض پورا کرلوں گی۔" وہ سخت ناراض نظر آتی تھیں۔

"ممی پلیز! ایسی باتیں مت کریں۔ آپ مجھے ہرٹ کررہی ہیں۔" وہ بے چارگی سے بولی تھی۔

"اوئے تو میں ہرٹ نہیں ہوئی۔ بتاؤ جب یہ چھلکے جیسی انگوٹھی کسی کو دکھا کر کہو گی نا کہ میرے ہونے والے منگیتر نے دی ہے تو سب سے پہلے تمہاری سہیلیاں مذاق اڑائیں گی اور خبردار روبینہ کے سامنے نا کرنا یہ والا ہاتھ۔ ہنسے گی ہم پر کہ اس کا اتنا اچھا دیور چھوڑ کر یہ کنگلا پسند کیا ہے اور اپنی تائی کو بھی نا بتانا۔ اس کے داماد نے پہلی بار ہی کرولا گفٹ کی تھی اپنی ہونے والی بیوی کو۔" زرمین نے ماں کی بات کاٹ دی۔

"کنگلا نہیں ہے، اچھی خاصی کھاتی پیتی فیملی کا لڑکا ہے اور دوسرا بھوکا نہیں مارے گا مجھے۔ آپ یہ بتائیں کل بلوالوں اسے ڈنر پر؟" وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔

"نا، رہنے دو۔ آج کل تمہارے چھوٹے چاچو آئے ہوئے ہیں آسٹریلیا سے۔ روز ہی چکر لگ رہا ہے ان کا۔ ان کو ذرا واپس چلے جانے دو میں نہیں چاہتی کہ میں اس لڑکے سے ملنے سے پہلے اس کا سامنا کسی رشتہ دار سے کرواؤں۔ آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے ایویں تو کسی کو بھی رشتہ نہیں دے دوں گی اپنی چہیتی بیٹی کا۔ پہلے کی بات اور تھی تم نے اتنے جھوٹے قصے سنا رکھے تھے کہ لڑکا ہیرا ہے ہیرا...... ایسا ہی ہیرا ہوتا تو یہ چھلکے جیسی انگوٹھی دیتا؟ بھلا دل ٹوٹ گیا میڈم تہمینہ کا زرمین۔ بالکل دل ٹوٹ گیا، کیا کہیں گے لوگ۔ کس کو داماد بنالیا میڈم تہمینہ نے۔ میں تو کہتی ہوں زرمین ابھی بھی وقت ہے ابھی سوچ لے۔ روبینہ کا دیور پاکستان میں ہی ہے ابھی۔" وہ تاسف بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ زرمین نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ بس اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود انگوٹھی کو تکنے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ اتنے آرام سے مان گئی ہے۔ اس نے تو چوں چراں بھی نہیں کی۔ میں نے کہا اور اس نے فوراً مان لیا۔" عطیہ فون پر انہیں بتا رہی تھیں۔ مہناز کو بہت خوشی ہوئی سن کر۔

"دراصل دونوں بچے بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن ہم بڑوں کے سامنے اداکاری کرتے رہتے ہیں۔" مہناز نے انہیں تسلی دی تھی۔ عطیہ بیگم جواباً کچھ نہیں بولیں۔ مہناز نے ان کی خاموشی میں چھپے اضطراب کو بالکل بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"میں کمرہ صاف کررہی تھی سونیا کے لیے۔ التمش کو اوپر کے پورشن میں شفٹ کررہی ہوں۔ سونیا کو التمش کا کمرہ دے دوں گی ویسے تو نیچے دو اور کمرے بھی ہیں لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ التمش اوپر رہ لے۔" وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ التمش کے کپڑے اس کی الماری سے نکالتی جارہی تھیں۔

"سونیا اوپر بھی رہ لیتی، اتنا شاہانہ پروٹوکول دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے اب میری بیٹی کو۔ خواہ مخواہ التمش کو تکلیف دی تم نے۔ وہ ناراض ہوا ہوگا کمرہ تبدیل

کرنے پر۔" عطیہ سادہ سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"ارے نہیں بھئی، ناراض کیوں ہوگا۔ اتنا بھی لاڈلا نہیں بنا کر رکھا ہوا میں نے اسے کہ اپنی ایک بات نا منوا سکوں۔ تم التمش کی فکر چھوڑو اور اپنے جانے کی تیاری کرو۔ کپڑے وغیرہ بنوالو۔ سنا ہے کینیڈا میں خوب سردی پڑتی ہے۔ تم بھی گوریوں کی طرح پینٹیں شرٹیں پہن کر پھرنا۔" وہ ہنستے ہوئے انہیں چڑا رہی تھیں۔ عطیہ کی بھی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"ارے نہیں بھئی۔ ہم تو پرانے زمانے کے لوگ ہیں، ہم سے نہیں پہنے جاتے یہ مغربی لباس۔ میزاب بتارہی تھی کہ شلواروں قمیصوں میں بھی بہت نظر آتی ہیں بالخصوص انڈین پنجابی عورتیں تو پہنتی ہی شلوار قمیص ہیں۔" عطیہ کو جیسے اس بات کی بہت ہی تسلی تھی سو اطمینان سے سہیلی کو بتارہی تھیں۔

"یہ بھی اچھا ہے مگر موٹے کپڑے خوب سارے لے جانا اور ہاں اپنے وٹامنز بھی پورے کرلو۔ یہ نا ہو کہ وہاں جا کر گھٹنے ٹخنے درد کرتے رہیں۔ میں نے مارننگ شو میں سنا تھا کہ وہاں جانے والوں کو یہ مسئلہ بہت تنگ کرتا ہے۔" مہناز بیگم نے مشورہ دیا تھا۔ التمش کی الماری کا ایک کیبنٹ فارغ کرلیا تھا انہوں نے اب دوسرے کی باری آچکی تھی۔ اسی دوران التمش نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔

"یہ کیا کررہی ہیں آپ، میرا سارا سامان کیوں نکال دیا ہے۔" وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ مہناز نے فون پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"بتائیں تو سہی کہ ایسا کیوں کررہی ہیں؟" وہ چپ نہیں ہوا تھا۔ مہناز نے بعجلت فون بند کیا اور پھر اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"تم آہستہ آواز میں بات نہیں کرسکتے۔ کیا سوچیں گی تمہاری پھپھو۔" انہیں برا لگا تھا۔

"پھپھو کا میرے کمرے سے کیا تعلق ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہاں کیوں جنگ وجدل مچادی ہے آپ نے؟" وہ چڑ کر بولا تھا اور ساتھ ہی بستر پر پڑے کپڑوں کے ڈھیر پر دراز ہوگیا تھا۔

"تمہارا سامان اوپر کے کمرے میں شفٹ کررہی ہوں۔ یہ جو سیڑھیوں کے بالکل پاس ہے، اس میں۔" انہوں نے سارا وجود الماری میں گھساتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"لیکن کیوں اور مجھ سے پوچھے بناء ایسا کیوں کررہی ہیں آپ؟" وہ مزید سیخ پا ہوا تھا۔

"تم سے پوچھ پوچھ کر تو نہیں چلوں گی اب میں۔ ہر کام تم سے پوچھ کر نہیں کیا جاسکتا نا اب۔ یہ کمرہ سونیا کو دینے کے لیے خالی کررہی ہوں میں۔" انہوں نے اُگل ہی دیا تھا۔

"کیا...... کس خوشی میں......؟" وہ حیران ہوکر اٹھ بیٹھا تھا۔

"تمہاری پھپھو اور پھپھا جی کینیڈا جارہے ہیں چھ ماہ کے لیے تو وہ یہاں رہے گی ہمارے ساتھ۔ کوئی کورسز وغیرہ کرنے ہیں اسے، ڈیزائننگ کے بس اسی لیے یہاں ہمارے ساتھ رہے گی کوئی اعتراض؟" انہوں نے کہا تھا اور ساتھ ہی دوسرے کیبنٹ کے بھی سب کپڑے نیچے کی جانب گرا ڈالے تھے۔ کیبنٹ کی سطح پر چند ایک کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ رسیدیں ہیں۔ مہناز بیگم نے وہ رسیدیں ہاتھ میں پکڑلی تھیں۔

"ارے ہم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے، ان کے ماموں کا گھر ہے جب مرضی آئیں لیکن میں کسی بھی چار فٹ دس انچ کے مسئلے کے لیے اپنا کمرہ نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ اسے کسی اور کمرے میں ٹھہرالیں۔ اب اس گھر میں التمش ہی کا کمرہ تو نہیں ہے نا۔" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ مہناز نے وہ رسید کھولنی شروع کردی تھی۔

"زیادہ چڑ چڑ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اس اکیلی بچی کو تو نہیں ٹھہرا سکتی نا اوپر کے پورشن میں، تم تو جوان بچے ہو، رہ لوگے۔ وہ ڈرتی رہے گی

اس لیے بس یہی میرا فیصلہ ہے۔'' انہوں نے بھی ضدی لہجے میں کہا تھا۔ رسید کھل چکی تھی لیکن چونکہ انہوں نے عینک نہیں پہن رکھی تھی سو واضح طور پر جو لکھا تھا وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

''اکیلی بچی اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آسکتی ہے لیکن اکیلی اوپر کے پورشن میں رہ نہیں سکتی، بہت خوب۔'' وہ سخت ناراض ہو رہا تھا۔

''یہ کیا ہے التمش؟'' مہناز بیگم نے اُس سے پوچھا تھا پھر سائڈ ٹیبل پر پڑی اپنی عینک اٹھالی تھی۔

''کیا......؟'' التمش نے بے دھیانی میں پوچھا پھر ان کے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ کر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

''اوہو! ایک تو آپ میری جاسوسیاں کرتی رہتی ہیں، کچھ نہیں ہے۔ ایک دوست کے ضروری کاغذ۔'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مہناز بیگم نے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر دوسری نگاہ دوبارہ اس کاغذ کے ٹکڑے کی جانب ڈالی تھی۔

''چالیس ہزار...... چالیس ہزار کی انگوٹھی۔ التمش! چالیس ہزار کی انگ...... گوٹھی......'' وہ حیران ہی نہیں پریشان بھی ہوئی تھیں۔ التمش کے چہرے پر خجل سے تاثرات چمکے۔

''بتا تو رہا ہوں ایک دوست کے لیے لی تھی اس نے دینی تھی اپنی گرل...... منگیتر کو۔ میرے پاس بس رسید ہی ہے، رنگ تو اس کے پاس ہے قسم سے۔'' وہ ان کی آنکھوں میں دیکھے بناء بولا تھا۔ بادشاہ التمش کی آواز میں بھیڑ کی منمناہٹ نمایاں تھی۔ مہناز بیگم اس کی جانب مڑیں۔ جیولر شاپ کی رسید ان کے ہاتھ میں لرز رہی تھی۔

''سچ بولو گے یا ماسٹر جی کو فون کروں؟'' وہ غضب ناک لہجے میں بولی تھیں۔

''اللہ کی قسم امی! ایک فرینڈ کے لیے لی تھی۔ اسے دے بھی دی۔ میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ وضاحت کر رہا تھا۔ مہناز اس کے قریب آئیں اور اسے آنکھوں کے حصار میں لے لیا۔ ان کی نظروں میں ایسی کاٹ تھی کہ التمش مزید کچھ بول نہیں سکا تھا۔ سارا طنطنہ اور غرور ہوا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھوں کا زاویہ تبدیل کر لیا تھا۔ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس موضوع پر بات کرنا بے حد مشکل تھا اس کے لیے۔ بالخصوص اس رنگ کا تذکرہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا وہ۔

''کیا نام ہے اس فرینڈ کا؟'' انہوں نے کاٹ کھانے والے انداز میں پوچھا۔ التمش نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''وہ ہے نا...... بُراق......'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مہناز نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی۔

''التمش! سچ بولو، صرف سچ۔'' ان کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ التمش چپ سا ہو گیا پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

''زرمین...... زرمین نام ہے اس کا......''

مہناز بیگم کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

''اس کو دے چکے ہو رنگ یا ابھی دینی ہے؟'' وہ غرائی تھیں۔ التمش نے انہیں دیکھا پھر گہری سانس بھری۔

''دے چکا ہوں، دینے کے لیے ہی خریدی تھی امی اور واپس نہیں لوں گا۔ زبان سے پھر جانا سجتا نہیں مجھ پر۔'' وہ نہایت تابعداری سے بولا تھا، مہناز تھک کر گرنے والے انداز میں بستر پر پڑے اس کے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

''لو بھائیو اور بہنو! میری مہارانی جودھا بائی (اپنے تئیں) جیتی ہوئی بازی بہت بری طرح ہار گئی تھیں۔ ارے...... آپ لوگوں کو ہنسی آ رہی ہے غضب خدا کا۔ یہ تو کوئی بات نا ہوئی۔ جائیں...... میں نہیں بتاتا آگے کا قصہ۔ انتظار کریں اب آپ۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

تمثیلہ زاہد

اُلجھی ڈور



اس نے آہستہ سے کاٹن کا ڈھکن کھولا تھا۔ گرد کی موٹی موٹی تہوں کو اس نے اچھی طرح کپڑے سے صاف کرلیا تھا۔ کاٹن کے اندر بے شمار کتابیں دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے جمع شدہ پیسے اپنے واحد شوق پر خرچ کردیا کرتی تھی۔ یہ کتابیں نہیں متاع حیات تھیں۔ وہ سکون تھا جو انہیں پڑھ کر اسے حاصل ہوتا تھا۔ یہ اس کی تنہائی کی ساتھی تھیں۔ سہیلیاں تھیں۔ آٹھ برس اس نے اپنی سہیلیوں سے دور رہ کر گزارے تھے۔ اتنے برس کب اور کیسے گزر گئے اسے خبر ہی نہ ہوئی اور آج اسے اپنی ساری سہیلیاں روٹھی ہوئی سی لگ رہی تھیں کہ اتنے دنوں سے ہماری خبر تک نہیں لی۔

پہلا دم قدم ہی تو مشکل ہوتا ہے لیکن جب ہم یہ قدم مضبوطی سے رکھ لیتے ہیں تو...... مشکلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ اگر پہلا قدم ہی ڈگمگا جائے تو......؟

تو پھر سنبھلنا مشکل ہے کیونکہ بعض اوقات قدم کے آگے زمین نہیں گہری کھائی آجاتی ہے۔''

لفظوں کی بازگشت اس کے گرد دائرے کی طرح گھوم رہی تھی۔ آہ! اس کا دل ڈوبنے لگا اپنی آنکھیں سختی سے بند کرکے وہ یہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس نے یہ جملے کب اور کس سے سنے تھے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے پیروں کی طرف دیکھا جو زمین پر تھے۔

''ماما...... ماما'' اس کی سوچوں کا تسلسل افراح کی آواز پر ٹوٹا تھا۔ ''نانی کا فون آیا ہے آپ کو پاپا بلا رہے ہیں۔'' وہ جس تیزی سے آئی تھی اس تیزی سے پلٹ گئی۔

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سینے سے لپٹی سہیلی کو واپس کاٹن میں رکھ دیا۔

اس کے اردگرد کی کاٹن کے ڈبے رکھے تھے پھر اس نے اپنے پاس بیٹھے دو سالہ زین کی طرف دیکھا جو خاموشی سے قالین پر بیٹھا ایک بلاک کے اوپر دوسرا بلاک جوڑ رہا تھا۔ جب چھ بلاک کی بلڈنگ اونچی ہونے لگتی تو اپنے وزن سے زمین بوس ہوجاتی۔ وہ نئے سرے سے ایک ایک بلاک اٹھا کر اسے دوبارہ جوڑنے لگتا۔ اس نے دیکھا ایسا کئی بار ہوا لیکن زین نے ہار نہیں مانی اب وہ دوبارہ بلاک جوڑنے میں مصروف تھا۔ آٹھ بلاک اب بیلنس ہوکر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ زین خوشی سے تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کی اس کامیابی پر اس نے اس کے پھولے پھولے گال چوم لیے۔ زین بھی فخر سے ماما کو اپنی کامیابی انگلی کے اشارے سے دکھا رہا تھا۔ وہ بھی زین کو سراہتی نگاہوں سے بار بار چوم رہی تھی۔ اس کا بیٹا اپنی ماں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ماں کی طرح ہتھیار ڈال دینے والوں میں سے نہ تھا۔ اس نے مسکرا کر زین کو گود میں اٹھا لیا۔

''صوفیہ!'' ایک تیز آواز عقب سے ابھری تھی۔ اس کا ذہن منتشر ہونے لگا۔ زین کو گود میں اٹھائے اس نے تیز تیز قدم کمرے سے باہر کی جانب اٹھائے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہاج کی یہ دوسری پکار ہے اور وہ بوکھلا گئی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہاج فون تھامے اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے خجل ہوکر نگاہ جھکالی۔ غلطی اس کی ہی تھی۔ وہاج کو اپنی بات دوبارہ دہرانے کی عادت نہ تھی۔ وہ اپنے دیے حکم کی فوراً تعمیل میں ذرا سی سستی بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ شرمندہ سی مرے مرے قدموں سے لینڈ لائن فون کی طرف بڑھی۔ وہ ایک ہفتہ کی شفٹنگ میں ایسی مصروف رہی کہ ماما کو کال ہی نہ کرسکی اب پندرہ دن بعد ماما کی فون کال خود ہی آگئی تھی۔ صوفیہ نے اپنے ہمت جمع کی اور ریسور کان سے لگا کر بولی۔

''جی ماما۔'' اور پھر جو کچھ اس نے سنا وہ اس کے حواس کھودینے کے لیے کافی تھے۔ اس کا ضبط جواب دینے لگا اور وہ چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ رو دی۔ وہاج گھبرا کر اٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی کمرے میں حرا موجود نہ تھی۔ واش روم سے شڑپ شڑپ آوازیں آرہی تھیں۔

''باتھ روم میں نہا رہی ہے۔'' دانتوں تلے ہونٹ دبائے وہ خوشی سے جھومتے ہوئے خود سے ہم کلام تھی۔ اس نے کمرے میں صحیح وقت قدم رکھا تھا۔

''اللہ کرے پانی چلا جائے ایک گھنٹے تک نہ نکلے وہ۔ اندر ہی رہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ اب اس کی کتابوں کے ایک طرف بڑھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی مطلوبہ کتاب کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو نئی نویلی کتاب اسے نظر آہی گئی۔ ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی تھی۔

''واہ حرا...... یہی وہ نیا نکور ناول ہے جو تم کل بک فیئر سے خرید کر لائی تھیں۔'' اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خزانہ دریافت کرلیا ہے۔ وہ اب اپنی بغل میں ناول دبائے کمرے سے نکل رہی تھی کہ اچانک واش روم کا دروازہ کھٹ کرکے کھلا تھا اور اس کے قدم ساکت ہوگئے

''چور چور...... میرا ناول......'' اس نے حرا کے شور مچانے پر کمرے سے دوڑ لگادی۔ ''شرم نہیں آئی میرا نیا ناول چوری کرتے ہوئے...... ابھی تو میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور تم بغل میں دبائے چل دیں۔'' حرا اسے دبوچ اپنے ناول کو چھینتے ہوئے غرا کر بولی۔ بھاگتے ہوئے اس کے گیلے بالوں سے تولیہ راستے میں گر گیا تھا۔ اب بالوں سے گرتی بوندیں اس کے سرخ چہرے پر ٹپ ٹپ کرتی برس رہی تھیں۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے مزید ایک ہفتہ اس ناول کو ہاتھ نہیں لگانا۔ تم بناؤ چکن رول، بریانی، شامی کباب، وغیرہ وغیرہ۔''

وہ اسے چڑانے لگی حرا کو نئی کھانوں کی ترکیبیں آزمانے کا بے حد شوق تھا وہ اچھی کتابیں فارغ وقت میں پڑھتی ضرور تھی لیکن اس کی ترجیح نت نئے کھانوں کو ٹرائی کرنا تھا۔ وہ کتابیں لے تو آتی لیکن کئی کئی دن یوں ہی گزر جاتے اور وہ پڑھ نہیں پاتی۔ اس کے بہ نسبت اس کی بچپن کی دوست صوفیہ جو ایک گھر چھوڑ کر رہتی تھی کتابوں کی دیوانی تھی۔ کل فون پر یوں ہی حرا نے صوفیہ سے اس نئے ناول کا ذکر کیا تھا اور صوفیہ جو بغیر کھائے رہ سکتی تھی لیکن بغیر پڑھے اسے سکون نہیں تھا۔ فوراً نئے ناول کا نام سن کر اسے حاصل کرنے کی دھن۔ صبح صبح حرا کے گھر تک لے آئی تھی۔ وہ اب مسکین شکل بنائے حرا کی منتیں کررہی تھی۔ حرا کا دل بھی پسیجنے لگا نرم دل تو تھی ہی۔

''مجھے ایک بات بتاؤ اگر وہاج بھائی کو تمہارے ان مشاغل پر اعتراض ہوا تو کیا کروگی...... کرنی تو چولہا ہانڈی ہی ہے نہ۔'' وہ اب اپنے سینے پر ہاتھ باندھے اس سے سوال کررہی تھی۔ انداز بڑی بوڑھیوں والا تھا۔

''کچھ بھی نہیں کروں گی...... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' وہ لاپروا انداز میں کہتی کتاب کے سرورق کو غور سے دیکھ رہی تھی جس میں ایک لڑکی ساحل سمندر کے کنارے گیلی ریت پر کھڑی سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اپنے خالہ زاد کزن سے منگنی ہوئے اسے صرف چھ ماہ ہوئے تھے اس نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے ہی خیالوں اور خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ حرا کی طرح وہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ حرا کے گھر اس کا بچپن سے آنا جانا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں۔ حرا جتنی سمجھ دار تھی صوفیہ اتنی غیر ذمہ دار اور لاپروا...... دونوں گریجویشن کے فائنل امتحان دے کر اب فارغ تھیں۔ صوفیہ کی منگنی چھ ماہ قبل وہاج سے ہوچکی تھی۔ یہ رسم گھر میں چند بڑوں کی موجودگی میں ادا کی گئی۔ وہاج ایک سیلف میڈ انسان تھا۔ وہ صرف دس برس کا تھا جب والدین کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کی پرورش اس کے تایا نے کی کالج پہنچ کر وہ پڑھائی کے ساتھ جاب کرنے لگا پھر ایک فلیٹ بھی بک کروالیا جس کی اقساط ہر ماہ دینے لگا۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اس کے تایا نے۔ صوفیہ کے ساتھ اس کا رشتہ طے کردیا۔ اب وہ اپنے فلیٹ کا

مالک بھی بن چکا تھا۔ سب ہی اسے رشتے سے خوش تھے۔ صوفیہ نے کبھی وہاج کے متعلق جاننے کی کوشش نہ کی۔ وہ آج میں رہنے والی بے ضرر سی لڑکی تھی۔ جسے کل کی فکر ہی نہ تھی۔ اس نے فکروں سے آزاد زندگی میں سانس لے کر پرورش پائی تھی جبکہ وہاج نے زندگی کی خارزار راہوں پر چل کر صرف دکھوں کے ساتھ تنہا آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن قدرت نے ان کا جوڑ لکھا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا آنے والا وقت کس کے لیے کیا کیا تبدیلیاں لے کر آنے والا ہے۔

☆☆☆

میرون جگمگاتے عروسی جوڑے میں بیوٹیشن کے ماہر ہاتھوں سے سجی بنی صوفیہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ایک طرف ماں باپ کو چھوڑنے کا دکھ اور دوسری طرف ایک نئی زندگی کا آغاز اور دوستوں کے ستائشی جملوں نے اسے انوکھا اعتماد بخشا تھا۔ اتنا خوب صورت لمحہ اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ شرمگیں مسکراہٹ تلے حرا کے معنی خیز جملوں اور نصیحتوں کے انبار تلے سر جھکائے بیٹھی تھی کہ اچانک رخصتی کا شور مچنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیروں سے اب ٹھنڈے پسینے پھوٹنے لگے وہ جو مزے سے سب کی تعریفی جملے وصول کررہی تھی۔ اب ماما بابا کی جدائی کا غم اس کے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگا تھا۔ دولہا بڑی تمکنت سے اب اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے ترچھی نگاہ وہاج پر ڈالی جو بڑے شاہانہ انداز میں کھڑا اب اردگرد کے ہجوم سے بے زار نظر آرہا تھا۔ اس نے یوں ہی سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑنی شروع کردیں۔ یہ اس کی اضطرابی کیفیت تھی جو کسی ان ہونی کے خیال تلے اس کے دل و دماغ پر حاوی ہورہی تھی پھر صوفیہ نے آہستہ آہستہ اپنے قدم بڑھائے اور وہاج کی زندگی میں داخل ہوگئی۔

وہاج کی زندگی میں داخل ہو کر اس کا استقبال گہرے سناٹوں نے کیا تھا۔ وہ حیران نظروں سے پاس پھیلی خاموشی کو تکنے لگی جو نئی نویلی دلہن کے لیے کسی شاک سے کم نہ تھا۔ اس کے اندر بجنے والے ساز تھم سے گئے۔ وہاج کا سنجیدہ نپا تلا سا رویہ دیکھ کر اس کے لبوں نے کچھ کہنے کی ہمت نہ کی۔ پھر یوں ہوا کہ یہ لبوں کا قفل کبھی ٹوٹ نہ سکا۔ اس پر تالا لگا کر نہ جانے چابی وہ کس جگہ رکھ کر بھول چکی تھی۔

اسے آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہاج اس سے دس سال بڑا ہی نہیں بلکہ ان کے درمیان دس دہائیوں کا فاصلہ چاہتے ہوئے بھی وہ کبھی پار کر کے آگے نہیں جاسکی تھی۔ وہ پلٹنے کا بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کو آسمان کا لکھا فیصلہ سمجھ کر قبول کرلیا اور یوں ہی سمجھوتے کی لاٹھی پکڑ کر زندگی کی راہ پر چلتی رہی۔ افراح کے بعد زین نے دنیا میں آکر اس کو ایسا مصروف کر ڈالا کہ وہ خود پر نگاہ تک ڈالنا بھول گئی۔ اسے کیا پسند تھا اور کیا ناپسند...... اسے کچھ بھی تو یاد نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ وہ ایک بیوی ہے...... ماں ہے۔

وہ خود بھی ایک انسان ہے...... ایک جیتی جاگتی انسان...... وہ سب بھول چکی تھی۔ زندگی اس کے لیے کافی کا ایک کپ تھا۔ اسے کافی کڑوی ہونے کے بنا پسند نہیں تھی۔ لیکن اب یہی کڑوی کافی وہ اب گھونٹ گھونٹ کر کے پی رہی تھی زندگی یوں ہی سرکتی رہی تین کمروں کے فلیٹ سے نکل کر آج وہ ایک گھر کی مالک تھی۔ گھر کی شفٹنگ کے دوران نکل آنے والا یہ کاٹن اس کی پرانی یادوں کو تازہ کر گیا تھا۔ اسے کچھ کچھ یاد آرہا تھا کہ وہ کیا تھی......؟ یادوں کی یہ تسبیح وہ کب تک پڑھتی رہی اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

☆☆☆

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' وہ بابا کی پیشانی پر ہاتھ رکھے مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔ دو دن کی خدمت نے انہیں کافی بہتر کردیا تھا۔ انہوں نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر اپنا سر ہلایا تھا پھر دوبارہ آنکھیں نقاہت کے مارے بند کرلیں۔ وہ نیند کی دوا کے زیر اثر سو رہے تھے۔ بابا دل کے مریض تھے اور

ماما شوگر کی مریضہ وہ اب اس عمر میں اچانک بگڑ جانے والی بابا کی طبیعت کو نہیں سنبھال پائیں فوراً صوفیہ کو بلایا۔ صوفیہ بابا کے زرد چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر ان کا سر دبانے لگی۔

''صوفیہ بابا سو رہے ہیں تم انہیں آرام کرنے دو اور کچھ دیر خود بھی ریسٹ کرلو میں نے چائے بنائی ہے آکر پی لو۔ فریش ہوجاؤ گی۔'' ماما کمرے میں داخل ہو کر دھیمے لہجے میں بولیں۔

بابا واقعی گہری نیند میں تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ ماتھے سے ہٹا کر کھڑی ہوگئی۔ کیسی فرشتوں جیسی معصومیت اس کے بابا کے چہرے پر تھی۔ وہ ایک بہترین باپ ہی نہیں اچھے شوہر بھی تھے۔ جن کے منہ سے کبھی اس نے کوئی سخت جملہ نہیں سنا۔ کبھی ماما کے لیے بابا کے منہ سے تضحیک اور تذلیل سے بھرے جملے نکلتے نہیں دیکھے تھے۔ ماما کے چہرے پر روشنی ہی روشنی پھیلی تھی اور جب وہ خود پر نگاہ ڈالتی ہے تو اسے اپنے اندر صرف اندھیرا نظر آتا ہے۔ وہ اس اندھیرے میں پچھلے آٹھ سالوں سے خود کو تلاش کر رہی تھی۔ اسے اپنا وجود بے وقت ہی نظر آیا۔ اس نے بھی سارے دھاگے اسی اندھیرے میں چھوڑ دیے۔ ان سروں کو تلاش کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

''اف'' اذیت ناک سوچ نے اس کے ہونٹوں کو دانتوں تلے کچل دیا تھا اور وہ سسک اٹھی۔

''چلو صوفیہ'' ماما اسے یوں ہی گم صم کھڑا دیکھ کر پھر بولیں اور وہ بابا کو ایک نظر دیکھ ماما کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

لان کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا کوئی کرسی پر بیٹھا چائے کے سپ لے رہا ہے۔ اسے لان میں رکھی کرسیوں میں ایک پر ہرا آنچل لہراتا نظر آرہا تھا۔ شاید ماما کا کوئی مہمان تھا۔ وہ ان مہمان خاتون کو سلام کرنے کے غرض سے بالکل سامنے جا پہنچی پھر اس کی نگاہ جیسے جھپکنا بھول گئی۔

''حرا...... تم......'' وہ چیخی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے آٹھ برس بعد بغل گیر ہو رہی تھیں۔

"تم میری شادی پر نہیں آئی تھی نہ......" حرا اب اس سے شکوہ کر رہی تھی۔

"افراح کو دنیا میں آنا تھا اور میری طبیعت صحیح نہیں رہتی تھی بس اسی لیے نہ آسکی تھی تم تو پھر اپنے شوہر کے ساتھ لندن چلی گئی تھیں۔ پلٹ کر خبر بھی نہ لی" وہ بھی اب جواب شکوہ پر اتر آئی تھی۔

"بس یار وہاں انسان مشینی زندگی گزار رہا ہے اور یہ کیا تم نے اپنا حلیہ بنا رکھا ہے؟ لباس کے معاملے میں اب اتنا برا ٹیسٹ بھی نہیں تھا تمہارا۔"

حرا نے صوفیہ کی طرف دیکھا جو اسے پہلے والی صوفیہ سے بالکل مختلف اور لاغر نظر آرہی تھی۔ اس نے بدرنگ سی خاکی رنگ کی چادر اور بہت کھلی سادی سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ صوفیہ نروس سی ہو کر اپنی پلکیں جھپکاتے اپنے سامنے پراعتماد اور پرسکون نظر آنے والی حرا کو دیکھنے لگی۔

"بس بچے...... گھر...... خود پر توجہ دینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"تمہیں خود خیال رکھنا چاہیے کیا شوہر اس حلیے پر تمہیں نہیں ٹوکتے۔" وہ اپنے چہرے پر آئی لٹوں کو ایک ادا سے پیچھے دھکیلتے ہوئے اسی اعتماد سے بولی۔

"نہیں۔" صوفیہ کے لہجے میں شکست تھی جسے وہ تسلیم کر رہی تھی۔ اس کی پلکیں نم ہو کر بھیگنے لگیں۔ حرا بھی اس کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کے ٹکڑوں کو اب غور سے دیکھ رہی تھی۔ ہر لحظہ چہکنے والی بلبل کی مانند صوفیہ کے چہرے میں گھلی زردیاں اور نحیف جسم کو

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---- حمیرا مغل
میک اپ ---- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

دیکھ کر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی دکھ نے اس کو دیمک بن کر اندر ہی اندر چاٹنا شروع کر دیا ہے۔

"یہ میں تمہارے لیے لائی تھی۔" چاکلیٹ اور کچھ کتابیں اس نے ایک شاپر صوفیہ کی جانب بڑھایا تھا۔

"یہ بچوں والے شوق اب میرے کہاں؟" اس نے شوہر کا کہا جملہ دہرایا تھا۔

"تم نے اپنے اندر کا بچہ خود ختم کیا ہے۔"

"کچھ باتیں کہنی بہت آسان ہوتی ہیں۔"

صوفیہ نے سر سے پیر تک سجی بنی حرا کی طرف طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

"کچھ باتیں سمجھنی بھی اتنی مشکل نہیں ہوتیں جتنا انہیں مشکل بنایا جا رہا ہوتا ہے۔" اس کا انداز ناصحانہ تھا۔ پھر حرا نے آگے بڑھ کر صوفیہ کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"بات کیا ہے؟" صوفیہ جو ضبط کی دہلیز پکڑ کر کافی دیر سے بیٹھی تھی سارے بندھن توڑ کر آگے بڑھ گئی اور وہ سب کہہ ڈالا جو اس کے دل میں تھا۔ حرا اس کے چہرے پر گرتے آنسوؤں اور اس کے رویے کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ "بس اتنی سی بات ہے...... جانتی ہو میں لندن سے یہاں کیوں اتنے سالوں بعد آئی ہوں" صوفیہ نے حیران نظروں سے حرا کی طرف دیکھا تھا جو اس کا دکھ سن کر بجائے تسلی کے دو بولوں کے چھوٹی سی بات کہہ اس کے اندر آنے والی بے چینی کو بڑھا رہی تھی۔ "اپنے شوہر کی دوسری شادی کرنے۔" اس کے لہجے میں وہی سکون تھا۔ صوفیہ کو حرا کی دماغی حالت پر اب شبہ ہو رہا تھا۔ وہ کتنے آرام سے وہ بات کہہ گئی جسے عورت اپنے خیال میں بھی سوچنا نہیں چاہتی۔

"صوفیہ! اپنے حالات کا ہمت اور جرأت سے سامنا کرنا سیکھو۔ ہر شخص کی زندگی دکھ سے تمہیں عبارت ملے گی۔ ہم سب اپنے اپنے دکھوں کی گٹھڑیاں اٹھائے زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہارے

اندر کا اعتماد جتنا مضبوط ہوگا' فتح کے دن اتنے ہی قریب آجائیں گے۔ خود کو مفتوحہ علاقہ سمجھ کر زندگی گزارنے کے بجائے اعتماد سے آگے بڑھو۔ یقین کرو انسان صرف اپنے مضبوط اعتماد کی بدولت ہر شخص کے دل کو فتح کر سکتا ہے۔ تمہارے پاس معاشی آسودگی ہے۔ دو بچوں نے تمہاری زندگی کو مکمل کر دیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لینے کے بجائے بن سنور کر رہا کرو۔ تمہارے شوہر اس بات کی پروا کریں نہ کریں۔ تمہیں اپنی زندگی اپنے بچوں کی خاطر خود جینی ہے۔ مجھے دیکھو اولاد کی نعمت سے محروم ہوں لیکن اللہ کی ذات پر بھروسا ہے۔ خوش رہتی ہوں اور اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے شوہر کی دوسری شادی کردوں تاکہ وہ صاحب اولاد ہو جائیں۔ میرے اس فیصلے سے وہ خوش نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ ہم دونوں کتنے تنہا ہیں۔ جو کام کل میری ساس نند تنگ آکر کریں' وہ آج میں خود ہی کر دینا چاہتی ہوں۔" کہتے کہتے آخر میں حرا کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ صوفیہ کو اس کی نظر آنے والی استری شدہ شخصیت کے اندر اب بے شمار سلوٹیں نظر آرہی تھیں۔ صوفیہ نے حیرت سے حرا کی طرف دیکھا تھا اس کا دھیما دھیما سا لہجہ اس کی زندگی کی ساری الجھی ڈوروں کو سلجھا رہا تھا۔

"صوفیہ! وہاج کی کال ہے لو بات کرو۔"

صوفیہ نے ماما کے ہاتھ سے موبائل پکڑ کر جیسے ہی کان سے لگایا تو دوسری طرف لائن کٹ چکی تھی۔ اسے فون ریسیو کرنے میں دیر ہوگئی تھی اور انتظار...... انتظار کرنا تو وہاج کی سرشت میں ہی نہ تھا۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔ اس کی آنکھوں نے وہ روشنی ڈھونڈ لی تھی جس سے اسے وہاج کی سمت پہنچنے کا راستہ مل گیا تھا۔ اس زندگی کی الجھی ڈور سلجھ گئی تھی۔ صوفیہ نے چمکتی آنکھوں سے حرا کی طرف دیکھا تھا جو بڑی دلچسپی سے اس کی بدلتی کیفیت نوٹ کر رہی تھی پھر صوفیہ نے اپنے گداز ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ دبائے موبائل پر مسیج سینڈ کیا تھا۔

"آئی مس یو۔"

مکمل ناول

ام طیفور

من عاجزم محبت کیسم

دوسرا اور آخری حصہ

شاہ بلوط کے دورویہ درختوں کے درمیان کچی پگڈنڈی دور تک جاتی تھی اور ایک مہیب کھائی کے دہانے پر آ کر ختم ہوتی تھی' یہ کھائی قانتہ کو جس قدر دہلاتی تھی، جگنو کو اسی قدر بھاتی تھی' وہ دونوں اکثر یہاں چکر کاٹتی پائی جاتی تھیں، جو سراسر جگنو کی ضد پر ہوتا تھا' وگرنہ جتنا خوف قانتہ کو اس کھائی کے کنارے تک پہنچ کر اپنی لپیٹ میں لیتا تھا، اتنا بقول اس کے وہ فائنل میں فیل ہونے سے نہیں ڈرتی تھی اور جگنو وہیں کنارے پر ایک بڑے سے چٹانی پتھر پر بیٹھ کر کچھ وقت کھائی کی گہرائی میں دیکھتے ہوئے لازمی بتاتی تھی' یہ جگہ ان کے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھی' جگنو کے کمرے کی کھڑکی سے یہ پگڈنڈی صاف دکھائی دیتی تھی اور اس وقت بہت خوب صورت لگا کرتی جب برف باری ہوتی تھی۔

دو دن مسلسل برف باری کے بعد آج ذرا موسم نے سکون کا سانس لیا تھا' گو ٹھنڈ بے تحاشا تھی لیکن چہل پہل برقرار تھی' جگنو سب کو ناشتا کرتا چھوڑ کر خاموشی سے باغیچے کی طرف سے کھلنے والے دروازے سے نکل آئی تھی' دھیمے قدم اٹھاتی ابھی کچھ دور ہی گئی تھی جب پیچھے سے قانتہ کی چیخ نما پکار سنائی دی' وہ اسے آوازیں دے کر رکنے کو کہہ رہی تھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی تھی' سرخ چہرے اور پھولے سانس کے ساتھ حور سے ہتھیایا ہوا۔

''پونچو۔'' پہنے وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔

''کدھر دفع ہو رہی ہو اکیلی، کتنی آوازیں دے ڈالیں' میرا گلا بیٹھ گیا لیکن تم نے شاید کانوں میں روئی دے رکھی ہے۔''

''اصل میں مجھے توقع نہیں تھی کہ تم مجھے فی الحال نظر آؤ گی کیونکہ آج کل تو تمہیں حور کے علاوہ کوئی کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ دوستی کے دعوے تم مجھ سے کرتی ہو اور نبھاتی کہیں اور ہو۔'' نروٹھے پن سے کہتی وہ قانتہ کو بے حد پیاری لگی' لیف گرین کلر کی پشمینہ کی شال میں وہ موتیے کی منہ بند کلی دکھائی دے رہی تھی۔

''وہ کیا ہے نا...... میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اس حور سے میں اس کے تمام ''چونچو'' لے نہیں لیتی، میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ میں ہر دفعہ اس کے چونچو کی اس قدر تعریف کرتی ہوں کہ بے چاری اگلی دفعہ ملنے پر پچھلا بڑی محبت سے مجھے تھما دیتی ہے۔ جسے میں تھامتی پہلے ہوں اور بعد میں کہتی ہوں ''ارے...... اس کی بھلا کیا ضرورت تھی۔''

وہ بڑے فخر سے اپنی کمینگی کا اظہار کر رہی تھی۔ جگنو نے ہنس کر پگڈنڈی کی طرف قدم بڑھائے۔ قانتہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

''ویسے جگنو۔ ایک بات کہوں۔ کیا تم نے نہیں محسوس کیا کہ حور تم سے کتراتی ہے۔ مجھے تو ایسا ہی لگا۔ وہ مجھے تو ہر جگہ اپنے ساتھ گھسیٹنے کی کوشش کرتی ہے لیکن تمہیں ساتھ لے کے جانے کی بات نہیں کرتی۔ ابھی کل جب میں نے ان سب کو اپنے گھر چائے پر بلایا تھا تو اسپیشلی تمہارے ساتھ آنے کا کہا لیکن حور نے مجھ سے کہا کہ تم نے آنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسی وقت بابی جان کو کال کی اور تمہارا پوچھا تو کہنے لگیں کہ جگنو تو دوپہر سے اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں تو بھلا اسے کیسے پتا چلتا کہ تم نے بلایا ہے اور حور تو جگنو بیٹا سے زیادہ بات چیت کرتی ہی نہیں۔ یہاں سے مجھے لگا کہ کچھ تو ہے جو گڑبڑ ہے۔'' وہ دونوں آہستہ روی سے چلتی بہت احتیاط سے پیر جما جما کر رکھ رہی تھیں۔ برف نے پگڈنڈی کو ڈھک رکھا تھا اور پھسلن سی موجود تھی۔ کچھ آگے جا کر جگنو کنارے پر پڑے ایک پتھر پر ٹک گئی۔ نیچے سے ایک سوکھا چرمرایا ہوا پتا اٹھایا اور اسے ہتھیلی میں مسلتے ہوئے بولی۔

''میں نے کبھی اس پر دھیان ہی نہیں دیا۔ مجھے لگا ہی نہیں کہ امیر حمزہ کے علاوہ بھی میرے گھر کوئی قیام کیے ہوئے ہے۔''

''یہ ہی تو تمہارا المیہ ہے۔ کام کے بندوں سے تم کبھی بنا کر رکھتی ہی نہیں۔ اس کو اعتماد میں لو، کل کو تمہارا اور امیر حمزہ کا راستہ ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی



ہے۔ آخر اس کے قریب ہے، بلکہ کبھی کبھی تو مجھے کچھ زیادہ ہی قریب لگتی ہے۔۔ وہ برہان بے چارہ تو مست ملنگ سا بندہ ہے لیکن یہ دونوں تو جاتے ہوئے اور آتے ہوئے سارا رستہ سر پر اٹھائے ہوتے ہیں۔ اتنی بک بک کرتے ہیں کہ میں جو سوچتی تھی کہ مجھ سے زیادہ بھی کوئی بولتا ہوگا بھلا، تو ان دونوں نے میری خوش فہمی کو غلط فہمی میں بدل ڈالا ہے۔" قانتہ ناک چڑھاتے ہوئے بولی تو جگنو کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ مٹھی سے سوکھا پتا جھاڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے اس کی مدد لے کر بھلا کیا کرنا ہے قانتہ! جس کے دل کو روگ لگ جائے اس کی حالت بھی سوکھے پتے جیسی ہو جاتی ہے، جسے کوئی بھی مسل دے، پروا نہیں ہوتی۔"

"تو کیا تم بھی روگی ہوگئی ہو جگنو۔ کیا ان چند دنوں نے تمہیں اس قدر عطا کیا ہے؟ کیا تمہیں مرنے کا شوق چڑھا ہے، جو آج کل تمہارے چہرے پر ماتمی نور برستا ہے...... بولو؟" قانتہ نے اس کے کاندھے کو جھٹکا دیا تھا، سراسیمگی اس کے چہرے سے ہویدہ تھی۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بول سکی، بس خاموشی سے نیم وا ہونٹوں کے کٹورے لیے سامنے دیکھتی رہی اور آنکھوں میں نمی اترتی رہی۔ قانتہ کا جی کیا کہ اسے ایک تھپڑ رسید کرے کہ اس کے ہوش پلٹ آئیں یا پھر کالی بلی بن کر اس کا رستہ کاٹ دے کہ وہ راہ ہی منحوس ہو جائے۔

اسی اثنا میں حور کی آواز نے دونوں کا دھیان بھٹکایا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا، وہ ہاتھ کے اشارے سے قانتہ کو بلا رہی تھی۔ قریب ہی جیپ بھی تیار کھڑی تھی یقیناً یہ لوگ کہیں نکلنے لگے تھے۔ امیر حمزہ بھی بلیک لیدر کی جیکٹ کے ساتھ بلیک ہی جینز میں، دستانے اور گرم اونی ٹوپی پہنے بالکل تیار کھڑا تھا لیکن اس کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا بلکہ اپنے سیل فون میں مگن تھا۔ جگنو کی نگاہ اٹک گئی تھی اور قانتہ اکتا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"آج تم بھی چلو جگنو۔ مجھے تمہارے بغیر مزا نہیں آتا اور حور مجھے لے تو جاتی ہے لیکن سارا وقت اس ریڈی میڈ ہیرو سے باتیں مٹھارتی رہتی ہے۔ چلو نا۔" اس نے جگنو کا ہاتھ تھام کر ہولے سے کھینچا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی، دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"تم جاؤ، میں خود بھی جانا نہیں چاہتی قانتہ! مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ پلیز جاؤ۔" جگنو نے نظر جھکا کر اپنے پیروں کو دیکھا جس میں اس نے اپنے مخصوص سول والے جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ اگر اسے بتا دیتی کہ حور کل اس سے کیسی باتیں کہہ چکی ہے تو یقیناً وہ اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ اس کے سارے پونچو اس کے منہ پر دے مارتی۔

قانتہ کو اندازہ تھا کہ اسے پھر سے قنوطیت نے گھیر رکھا ہے، لیکن اس وقت اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حور کی مسلسل آوازوں سے زچ ہوتی وہ بنا کچھ کہے پلٹ گئی تھی۔ جگنو نے اسے جاتا دیکھا تو دو تین لمبے لمبے سانس منہ سے خارج کیے۔ جب بھی حلق میں نمک کی ڈلی آن پھنستی تھی تو وہ یونہی خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے بیٹھے سے ذرا اچک کر امیر حمزہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور ہنوز سیل فون میں گم تھا۔ دل بے طرح آزردہ ہوا تھا، لیکن سر جھٹک دیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ ان کے درمیان برہان نہیں ہے۔ "اس کی طبیعت خراب نا ہوگئی ہو، ویسے بھی وہ کل سے چپ چپ سا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی کسی کام سے کہیں نکل گیا ہو۔" ان ہی سوچوں میں گم وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سینے پر دونوں بازو لپیٹ کر ہولے ہولے کھائی کی سمت چل پڑی۔

برف میں دھنستے پاؤں اور اس کے کچکچانے کی آواز کتنی پیاری لگتی ہے، اگر وہ بادلوں پر چلے تو کیا ایسی ہی آواز آئے گی، لیکن بادلوں پر چلنے والے زمین پر کب رہتے ہیں، وہ تو آسمان کی وسعتوں میں کہیں کسی کونے میں دھنکے ہوئے بادلوں سے بنے ہوائی محل میں بسیرا کرتے ہوں گے، روز شام ڈھلنے

سے ذرا پہلے اس محل کی ملکہ اپنے حریری لبادے کو نازک انگلیوں کی چٹکیوں میں تھامے باہر نکلتی ہوگی اور اس گلابی بادل پر سوار ہو کر سارے میں گھومتی ہوگی اور جب ستانے کو کسی نرم گدگدائے بادل پر اترتی ہوگی تو اس کی نرمی سے نقرئی قہقہہ اس کے حلق سے نکل کر اوس کی صورت زمین پر برس جاتا ہوگا۔ اور بادل کی ذرا گہرائی میں پیر اتارنے سے میٹھے پانی کی نمی اس کے لبادے کے کنارے گیلے کرتی ہوگی۔ وہ شوق میں دوبارہ پاؤں بادل میں اتارتی ہوگی اور نیچے...... ذرا اور...... ذرا اور نیچے...... اور......

"پاگل ہوگئی ہیں آپ۔ مرنے کا ارادہ لے کر نکلی ہیں کیا۔ ذرا جو لمحے کی چوک ہو جاتی تو آپ تو کود چکی تھیں کھائی میں۔ حد کر دی آپ نے لاپروائی کی۔"

برہان اس کا نرم گداز بازو سختی سے جکڑے، اس سے کہیں زیادہ سخت لہجے میں بازپرس کر رہا تھا۔

وہ آج جان بوجھ کر گھومنے پھرنے کے پروگرام میں شامل نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ دو تین دن سے جگنو سے تنہائی میں بات کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ ناشتے کی میز سے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اٹھا تھا اور بجائے کمرے میں جانے کے چپکے سے باہر نکل آیا تھا، کچھ فاصلے پر ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا جگنو کا انتظار کر رہا تھا جب اچانک موبائل پر بڑے بابا کی کال آگئی تھی۔ ان سے بات کرتے، حال احوال بتاتے وہ چلتا ہوا کچھ مزید فاصلے پر نکل گیا تھا اور جس گھڑی وہ پلٹا، اس نے جگنو کو کھائی کے بے حد قریب پایا، اسے لگا کہ وہ خود ہی رک جائے گی لیکن وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی، بجلی کی سی تیزی سے برہان نے اپنے اور اس کے بیچ کا فاصلہ پاٹا تھا اور جب اس نے بازو سے پکڑ کر اسے واپس کھینچا، اس کا ایک قدم کھائی کے اوپر معلق تھا اور دوسرا بالکل کنارے پر۔

یہ صورتحال حواس باختہ کر دینے والی تھی مگر جگنو کے چہرے کے تاثرات اس قدر نارمل تھے کہ برہان کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا۔ برہان کی ڈانٹ کا بھی اس پر چنداں اثر نہیں ہوا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر یہاں موجود ہی نہیں، برہان نے اس کی آنکھوں کے آگے زور زور سے چند چٹکیاں بجائیں اور پھر قدرے جھجکتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا۔ وہ جیسے ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ حیرت اور بے یقینی سے اس نے برہان کو اور خود کو دیکھا پھر اگلی نگاہ کھائی پر ڈالی تو بدک کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔ چہرے کا رنگ بھی اڑا تھا۔ برہان نے زبردستی اسے قریب ہی ایک بڑے پتھر پر بٹھایا، یہ وہی پتھر تھا جس پر وہ اکثر بیٹھا کرتی تھی لیکن اس وقت قانتہ اس کے ساتھ ہوتی تھی اور وہ خود بھی پورے ہوش و حواس میں ہوتی تھی۔

"آپ نارمل نہیں لگ رہیں اوزئے! پریشان ہیں یا طبیعت خراب ہے، کچھ بولیے۔ رکیں میں آپ کے لیے پانی لے کر آتا ہوں۔" برہان تیزی سے واپس مڑنے لگا تھا کہ جگنو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس کی سانس جو چند لمحے پہلے دھونکی کی طرح چل رہی تھی، اب قدرے بہتر تھی۔ برہان اسی پتھر کے کنارے پر فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی پریشانی اور استعجاب تھا۔ اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"آپ کیا کرنے جا رہی تھیں اوزئے۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کی لاپروائی آج آپ کو موت کے منہ میں لے جاتی، اور شاید کسی کو معلوم بھی نا ہو پاتا کہ آپ کے ساتھ کیا بیت گئی۔ پلیز۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں۔ اگر مناسب لگے تو مجھے بتائیں کہ آپ کو کیا پریشانی ہے، پلیز۔" اس کے التجائیہ لہجے پر جگنو نے پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اس کے لیے فکرمندی واضح نظر آرہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یونی کے ہی مسئلوں میں الجھی ہوئی تھی، پتا ہی نہیں چلا کہ کب زمین ختم ہو گئی۔ آپ نے مجھے بچا لیا۔ اس کے لیے میں آپ کی بے حد شکرگزار ہوں، ورنہ یقیناً بہت بڑا حادثہ ہو جاتا۔" اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کن خیالوں میں کھوئی تھی۔ بہرحال اس کا احسان نا ماننا تو زیادتی تھی۔

"ایک بات کہوں آپ سے۔؟" برہان نے گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا "میں آج خاص آپ سے چند ضروری باتیں کرنے کے لیے ہی گھر ٹھہرا ہوں۔ اصل میں، مجھے آپ سے امیر حمزہ کے حوالے سے کچھ کہنا تھا۔" جگنو کے دل کی دھڑکنوں میں واضح ارتعاش پیدا ہوا تو یعنی کہ بات سب کے محسوس کرنے تک پہنچ چکی ہے۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"ایسا ہے اوزئے! میر میرا بہت اچھا اور پیارا دوست ہے، میرے بچپن کا ساتھی۔ ہم دونوں اب تک ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کے مزاج اور عادات سے اس قدر واقف ہیں کہ بن کہے ایک دوسرے کے دل کی بات جان لیتے ہیں۔ تو پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میر کا آپ کی طرف جھکاؤ مجھ سے مخفی رہ جائے۔ دیکھیں، میں آپ کو ہرگز شرمندہ نہیں کر رہا" اس نے جگنو کو پہلو بدلتے دیکھ کر کہا۔ "میرا مقصد محض یہ بتانا ہے کہ میر میں کچھ لاابالی پن ہے، آپ دونوں کی طبیعتوں میں جو تضاد ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس میں کوئی عیب ہے یا وہ آپ کے قابل نہیں، بس آپ جو بھی قدم اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں کیونکہ میر کی شہر میں بہت سی دوستیاں ہیں۔ اس میں ٹھہراؤ کی کمی ہے، یہ نا ہو کہ آنے والے وقت میں آپ خود کو کسی تکلیف میں مبتلا کرلیں۔"

ایک طویل سانس برہان کے پھیپھڑوں سے یوں خارج ہوا تھا جیسے کب سے روک رکھا ہو، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آخر امیر حمزہ اس کا جگری دوست تھا، کم از کم برائی تو کر نہیں سکتا تھا، محض ڈھکے چھپے لفظوں میں جگنو کو تنبیہ کرسکتا تھا اور وہ اس نے کردی تھی۔ آگے وہ خود اپنا بھلا برا سوچ سکتی تھی۔ لیکن یہ بھی کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اتنی معصوم اور اچھی لڑکی کے جذبات کے ساتھ کھیلے۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ جگنو پر ڈالی جو سر جھکائے، اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ گرین شال کے ہالے میں اس کا چہرہ اس قدر سفید اور تابناک دکھائی پڑتا تھا کہ برہان کو فوراً اپنی نگاہوں کے زاویے تبدیل کرنے پڑے۔ اس کے ذہن میں نیلگوں جھیل میں تیرتی سفید مرغابی کا تصور ابھرا تھا۔ وہ منہ پھیر کر مسکرا دیا۔ اسی اثنا میں جگنو کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں جب چھوٹی تھی نا۔ تو بابی جان کہا کرتی تھیں کہ درخت سے کوئی پتا تب ہی جھڑتا ہے جب وہ اپنے معمول سے ہٹتا ہے، اور پتے کا معمول اللہ کا ذکر کرنا ہے۔ جیسے ہی اس میں چوک ہوتی ہے، وہ بے جان ہو کر شاخ سے یوں ٹوٹ کر گرتا ہے جیسے کبھی وہاں تھا ہی نہیں۔ اسے اپنے معمول کو بھولنے کی سزا مل جاتی ہے۔ پھر اسے کسی کے پاؤں مسل کے چلے جائیں یا وہ چرمرا کر فنا ہو جائے، اسے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ یہ سزا بخوشی تسلیم کرتا ہے۔

مجھ سے بھی چوک ہوگئی برہان صاحب۔ میں بھی اپنے محور سے ہٹنے کی غلطی کر بیٹھی ہوں۔ میری کچھ حدود متعین تھیں، میں انہیں پھلانگ آئی ہوں۔ میں بے خبر تھی کہ دوسری طرف آگ ہوگی، جس کے شعلے لپک لپک کر مجھے لپیٹیں گے۔ میں سرور کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی دیکھتی اپنی ہستی کا غرور اجاڑ آئی ہوں۔ آئینہ کرچی کرچی ہوا مجھے رقص پر مجبور کرتا ہے اور میں پور پور خود کو زخمی کرتی ہوں۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا برہان صاحب۔ اب تو مجھے سہنا ہی ہوگا۔ سزا کا علم ہوتے ہوئے بھی غلطی کرنے والے کے لیے دنیا خندق کھودتی ہے، جس میں اسے زندہ گاڑ دیتی ہے۔ میں بھی گڑنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ عشق میرے اندر گڑ گیا ہے۔"

وہ جو بول رہی تھی، برہان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا یعنی یہ نازک سی لڑکی محبت میں اس قدر آگے جا چکی تھی، وہ بھی بنا زادِ راہ کے۔

اسے یک بیک امیر حمزہ پر بے حد طیش آیا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس کا ایڈونچر کیا رنگ دکھا بیٹھا ہے۔ بھلے سے اس نے کہا ہے کہ وہ اوزئے کے لیے سنجیدہ ہے مگر وہ اس کا یقین نہیں کرسکتا تھا۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہوگیا تھا، اسے جلد از جلد نمٹانا ضروری تھا۔ جتنی جلدی ہوسکے بڑے بابا سے بات کرنا ہوگی، وہی امیر حمزہ کے پاپا کو اس رشتے کے لیے قائل کرسکتے ہیں، بظاہر تو کوئی قباحت بھی نا تھی۔ انتہائی حسین و جمیل تھی اوزئے، صرف ایک پاؤں کا نقص ہی تھا لیکن اس سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے اور پھر امیر حمزہ خود بھی تو انٹرسٹڈ ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ چاندی سے ڈھلی لڑکی زرد پیرہن اوڑھ لے، اسے ساری بات بڑوں کے آگے کھول دینی چاہیے۔

وہ لمحوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ چونکا تو تب جب جگنو وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف چل دی۔ وہ بغور اس کی چال کو دیکھتا چلا گیا۔ ایک خیال اس کے دل میں اترا لیکن اس نے سرعت سے اسے جھٹک دیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے منڈلا رہے تھے۔

☆☆☆

برفیلے پہاڑوں کی کوکھ سے جنم لینے والی ہواؤں نے پوری وادی میں گھیرا ڈال رکھا تھا۔ لیکن یہاں کے باسیوں کو اس کی عادت تھی، وہ سخت جان اور جفاکش تھے۔ ان کے معمولات میں یہ خوفناک سردی کبھی حائل نہیں ہوتی تھی، وہ سردی کو چیلنج کرکے روزانہ کے امور نمٹاتے تھے۔

امیر حمزہ اپنے کمرے کی بند کھڑکی سے کاندھا ٹیکے باہر کھیلتے بچوں کو محویت سے دیکھ رہا تھا، جو فٹ فٹ گہری برف پر اس قدر مہارت سے کھیل رہے تھے کہ ان میں سے کسی کے بھی پاؤں نا لڑکھڑاتے تھے نا کوئی بچہ گرتا تھا۔ سرخ گال اور ناک۔ ناکافی لباس اور چمکتے چہرے۔ یہ بچپن بھی نا۔

امیر حمزہ نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ خود وہ کل سے سردی کی پکڑ میں آچکا تھا اور اب فلو، بخار لیے کمرے میں بند تھا۔ حیدر رحمانی کل سے دو تین بار اس کی خبر گیری کے لیے کمرے میں آچکے تھے۔ وہ ان کے خلوص کے آگے سچ میں شرمندہ ہوجاتا۔ لیکن اب وہ بور ہونے لگا تھا، اس ماحول کا فسوں ٹوٹنے لگا تھا، جی کررہا تھا جلد از جلد واپس چلا جائے۔ یہ مقام اور یہ جگہ پھر لینے کے بعد مزید کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی یہاں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جام ہو چکا ہے۔ وہ اس قدر ٹھہری ہوئی زندگی کا عادی ہی کب تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج ہی برہان اور حور سے بات کرکے واپسی کا پروگرام طے کیا جائے۔ برہان کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ جانے کیوں زیادہ بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ کمرے میں ہوتا تو یا موبائل سے لگا رہتا یا حیدر رحمانی نے ان کی سہولت کے لیے جو لیپ ٹاپ کمرے میں رکھوایا تھا، اسی کے ساتھ مصروف رہتا۔

"شاید مجھ سے اوزئے کے معاملے کو لے کر ناراض ہے۔ چلو وو! واپس جا کر خود ہی سب روٹین میں آجائے گا۔"

اس نے اپنے آپ کو تسلی دی تھی جیسے۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹنے لگا تھا جب اچانک اس کی نظر جگنو پر پڑی۔ وہ باغیچے میں رکھی کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس میں سے فریش اور سرخ چیریز صاف دکھائی دے رہی تھیں اور پھر امیر حمزہ نے اپنی زندگی کا سب سے دلکش منظر دیکھا۔ اس نے جگنو کو ایک چیری اٹھا کر اپنے ہونٹوں کے قریب لاتے دیکھا، اس کے انار کے رس میں بھیگے ہونٹ وا ہوئے تو چھوٹے سے دہانے میں سے جھانکتے سفید مکئی جیسے خوب صورت اور چمکتے دانت واضح ہوگئے اور پھر جس گھڑی چیری نے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا، امیر حمزہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے ہونٹوں کی رنگت چیری کی سرخی کو مات دے رہی تھی۔ امیر حمزہ مبہوت ہوگیا تھا۔ وہ ہر ہر پل حسین تھی اور امیر حمزہ کی نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ اس کے حواس پہلے سے کہیں زیادہ سلب ہوئے تھے۔ وہ ایک طویل اور گہری سانس لیتا بمشکل اس ٹرانس سے نکل کر کھڑکی سے ہٹ کر راکنگ چیئر پر آبیٹھا اور ٹیک لگا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سر کے پیچھے پھنسا کر دھیرے دھیرے جھولنے لگا۔ نظریں چھت پر جمی تھیں پر تصور میں ابھی بھی چند پل پہلے کا منظر بسا تھا۔ وہ ماہ کامل تھی۔ اوس کی بوند جیسی

شفاف۔تتلی کے پنکھ جیسی نازک۔

بے اختیار اس کا جی کیا کہ آج وہ ممی سے بات کرے اوزئے رحمانی کے بارے میں۔انہیں بتائے کہ وہ کیسی حور شمائل ہے۔اس نے ایک جھٹکے سے سیدھے ہوتے ہوئے ارد گرد نظر مار کر لیپ ٹاپ ڈھونڈا۔ برہان کی سائڈ ٹیبل پر وہ اسے پڑا دکھائی دیا۔اس نے وہاں سے اسے اٹھایا اور سکون سے واپس بیٹھ کر اسے آن کیا۔اس کا ارادہ اسکائپ پر ممی سے بات کرنے کا تھا۔ویسے بھی کافی دن ہوئے تھے اسے ان سے بات کیے۔اسکائپ پر ممی کے آتے ہی ان کے گلے شکوے شروع ہو چکے تھے،وہ ہنس ہنس کر بڑے فریش موڈ میں ان کی تسلی کرواتا ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔وہ بے حد فریش اور خوش تھا یہ ممی کو وہاں بیٹھے بھی اندازہ ہو رہا تھا،نا جانے کون کون سے قصے چھیڑے جا رہا تھا۔وادی کی خوب صورتی، یہاں کے لوگ،حیدر رحمانی کی مہمان نوازی۔ابھی اسے اور بھی بولنا تھا جب ممی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میر...... چندا میں بہت اداس ہوگئی ہوں، اب واپس آؤ۔آؤ گے تو ساری باتیں سنوں گی۔ابھی تمہارے پاپا مجھے بلا رہے ہیں،میں ان کی بات سن آؤں تب تک تم ریمان سے باتیں کرو۔کل ہی آئی ہے یو۔کے سے۔" وہ عجلت میں تھیں۔ پیچھے پاپا کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جو انہی کو بلا رہے تھے۔ان کے ہٹتے ہی ریمان کا چہرہ نمودار ہوا۔ریمان اس کی پھوپھو کی بیٹی تھی،یو کے تعلیم کی غرض سے گئی تھی اور اب واپس آ چکی تھی۔امیر حمزہ جانتا تھا کہ ریمان اس میں انٹرسٹڈ ہے۔

"ہیلو میر! کیسے ہو اور ابھی کتنے دن لگاؤ گے وہاں۔ میں بور ہو رہی ہوں۔تم آؤ تو پارٹیز اور ہلا گلا شروع ہو۔" وہ چھوٹے سے پیچ کلر کے ٹاپ کے ساتھ میرون ٹائٹس پہنے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی اس سے استفسار کر رہی تھی۔وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی جس قدر اسٹائلش تھی۔اس وقت بھی وہ غضب کی اٹریکٹو لگ رہی تھی۔امیر حمزہ کی نگاہیں اس پر گڑی تھیں۔وہ ہونٹ سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو جلد ہی واپس آنا پڑے گا کیونکہ تمہیں چین جو نہیں پڑنے والا۔ویسے بھی میں اب یہاں اکتانے لگا ہوں۔ ایک دو دن میں پروگرام بتاتا ہوں خیر چھوڑو۔تم بتاؤ آگے کے کیا ارادے ہیں؟"

"ارادے تو نیک ہیں مگر فی الحال سیلون کھولنے کا موڈ ہے،ساتھ لیڈیز جم۔ یو نو آئی لو ایروبکس۔ یو۔کے میں مجھے قابل انسٹرکٹر مانا جاتا تھا۔اب یہاں پر اپنا ہنر آزمائیں گے۔"

وہ ہاتھ سے اپنے سلکی سنہرے بال پیچھے جھٹکتے ہوئے بولی۔اس نے ناک میں نوز رنگ بھی پہن رکھی تھی جسے بات کرتے ہوئے وہ مسلسل چھیڑے جا رہی تھی۔

"اچھا جی۔ہمیں آپ کا یہ ہنر دیکھنے کا موقع کیسے ملے گا بھلا؟"

"تم واپس تو آؤ،تم پر بڑے ہنر آزمانے ہیں ابھی۔" معنی خیزی سے کہتی ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔امیر حمزہ نے ایک بھرپور نظر اس کے دعوت نظارہ دیتے سراپے پر ڈالی۔وہ ایسی اداؤں کا دیوانہ تھا۔تھرکتے جسموں کا شیدائی تھا اور ریمان کو دیکھتے ہوئے اسے ایک عجیب بے نام سی بے چینی نے لپیٹے میں لیا تھا۔وجہ نا جانے کیا تھی۔؟ وہ الجھ گیا اور عین اسی لمحے وجہ لیپ ٹاپ کے پس منظر سے نمودار ہوئی۔جگنو اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی، ہاتھ میں چیریز کی ٹوکری تھامے۔امیر حمزہ نے بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھا،سارا دھیان اس کی خم کھائی چال پر تھا۔جگنو کچھ گھبرا سی گئی۔اسے امیر حمزہ کے انداز میں بے حد اجنبیت محسوس ہوئی تھی۔وہ یک دم ہکلا گئی۔

"اصل میں۔دراصل۔بابا کہہ گئے تھے کہ آپ کی خبر گیری کروں۔کل سے بخار ہے۔دروازہ کھلا دیکھا تو چلی آئی۔ یہ...... یہ چیریز ہیں، بالکل فریش۔ آپ کے لیے لائی تھی۔" وہ شرمندہ سی باسکٹ وہیں چھوٹی ٹیبل پر رکھتی واپس مڑنے لگی۔ایسے روکھے رویے کی وہ کبھی بھی توقع نہیں رکھتی تھی۔

وہ بھی اچانک،ایک دم سے۔وہ سست روی سے چلتی دروازے تک آئی۔اس کے کان امیر حمزہ کی آواز کے انتظار میں تھے۔ابھی وہ اسے روک لے گا۔ایک دم ہنس دے گا اور اسے کہے گا" کدھر جا رہی ہو۔میں مذاق کر رہا تھا۔" اور پھر واقعی امیر حمزہ کی آواز اس کی سماعت میں امرت بن کر اتری۔اس نے اسے پکارا تھا۔وہ کیف آور سانس خارج کرتی وہیں تھم گئی۔دل جو ہچکولوں کی زد میں تھا،یک دم روم روم میں سکون سا اتر آیا تھا۔اس نے آنکھیں موند کر بنا پلٹے اس کے اگلے جملے کا انتظار کیا۔

"اوزئے، پلیز دروازہ بند کرتی جایئے گا اور اب کے آنا ہو تو ناک کر کے آیئے گا۔"

یک لخت اس کا وجود ڈھول بن کر تحلیل ہو گیا تھا۔ایک وار میں کام تمام۔وہ بری طرح لڑکھڑائی تھی۔بمشکل دروازے کو ہینڈل سے تھامتی وہ خود پر قابو پاتی کمرے سے باہر نکلی،تب اس نے سنا کہ کسی نے امیر حمزہ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا اور جواب میں اس نے کہا۔

"کوئی خاص نہیں۔"

اتنا ارزاں تو اس نے خود کو کبھی بھی نا جانا تھا۔جتنا بے مول اس ایک فقرے نے اسے کیا تھا۔وہ کچھ خاص نہیں تھی تو اتنے دن سے اتنا کچھ خاص کیا چل رہا تھا۔اس نے برہان کے کہنے پر یقین نہیں کیا تھا کیونکہ اسے اپنی محبت پر یقین تھا۔اور اس گھڑی وہ اپنے یقین کی کٹی پھٹی لاش کو سسکیوں کے تابوت میں ڈالے بڑا کڑا عذاب جھیلتی کمرے میں گھسیٹ لائی تھی۔وہ تمام رات اس تابوت پہ سر رکھ کر نوحے پڑھتے قطرہ قطرہ بہتی تھی۔

دوسری طرف امیر حمزہ کی سائڈ ٹیبل پر چیریز کی ٹوکری جوں کی توں پڑی تھی اور اس رات وہ اپنے فیصلے پر مہر ثبت کیے بے فکر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا۔

☆☆☆

اسٹڈی میں ایسی خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی مریض حالت نزع میں ہو اور اس کے گرد بیٹھے قریبی رشتے دار اس کی اکھڑتی بے بس سانسیں گن رہے ہوں اور سانسیں تو واقعی اکھڑ رہی تھیں۔اوزئے رحمانی کی۔انہیں پوروں پہ چننے کے لیے قانتہ اس کے بالکل قریب دل گرفتہ سی بیٹھی تھی۔

ساری رات بند کمرے میں بیٹھ کر جگنو نے اپنے خوابوں کے پر نوچے تھے۔وہ بڑی جلدی عشق کے میدان میں پچھاڑ دی گئی تھی۔اس کے جذبات کو انی میں پرو کر اس کی پیشانی میں گاڑ دیا گیا تھا،خون بھل بھل بہتا تھا اور اس کی آنکھیں کی پتلیوں میں عکس یار رقص کرتا تھا۔وہ بڑی بے خبری میں ماری گئی تھی۔

قانتہ کا بس چلتا تو امیر حمزہ کے وجود کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتی۔وہ نوسر باز تھا یا بہروپیا۔جو بھی تھا، یہاں کیوں تھا۔؟ کس نے اسے دعوت دی تھی کہ آئے اور ایک انجان نادان لڑکی کے خالص جذبات کے ساتھ کھیلے۔وہ جو اسے جانتی تک نا تھی اسے کس حیثیت سے مہرہ بنا کر پٹا گیا تھا۔اور اب جبکہ جگنو اس راہ پر اتنی دور نکل آئی جہاں وہ محبت کی شمعیں جلاتا اسے لے گیا تھا تو یک دم پلٹ گیا۔اور جاتے جاتے وہ سارے چراغ بجھا گیا۔جگنو پلٹنا بھی چاہتی تو گھور اندھیرے میں راہ کھو دیتی۔

"تم......تم یوں روتی کیوں ہو۔جاؤ اور اس کا گریبان تار تار کر دو۔پوچھو اس سے کہ اس نے یہ سب کیوں کیا۔کیا جواز ہے اس کے پاس یوں تمہاری زندگی برباد کرنے کا۔اٹھو۔جاؤ۔اس سے پہلے کہ وہ چلا جائے۔اٹھو جگنو۔" وہ طیش سے بھری اسے اکسا رہی تھی کہ وہ امیر حمزہ سے باز پرس کرے۔ جگنو ایک ہی زاویئے پر کب سے بیٹھی آنکھیں موندے اور سر دیوار سے ٹیکے بیٹھی تھی۔شدت گریہ سے اس کا چہرہ سرخی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ہونٹوں کے کنارے سرخ لاوا بنے جل رہے تھے۔اس کے سوختہ جگر کی طرح۔

"میں پہلا بھی کب گئی تھی قانتہ! اس سے محبت

کی سوغات لینے۔" ایک سسکی سی فضا میں بکھری
"تب بھی وہ خود دان کر گیا اب بھی وہ خود ہی عطا کر گیا۔ میں نے تو بس انگاروں سے جھولی بھری ہے۔ دامن جھٹک دوں گی تو پیر جلیں گے۔ وگرنہ یہ آگ اب میرا جگر کھائے گی۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی جگنو۔ میں اپنی جگنو کو یوں بے نور ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ جس نے یہ انگارے دیے ہیں تھوڑی سی سلگن اس کے کھاتے میں بھی درج ہوگی۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ کیسے بچتا ہے۔" قانتہ اپنے آنسو پونچھتی بڑے جوش سے اٹھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہ معرکہ سر کرلے گی۔ اس نے ہر ہر موقع پر جگنو کی مشکل کو آسانی میں بدلا تھا۔ تو آج بھی وہ حق دوستی ضرور ادا کرے گی۔۔ وہ جانے کے لیے پلٹی تو جگنو نے اس کا ہاتھ تھام کے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اسے روک رہی تھی کوئی بھی قدم اٹھانے سے۔ قانتہ نے بڑی نرمی اور محبت سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور نیچے جھک کر اس کی چمکتی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

"میری تمہاری دوستی کو عشق ناتمام کھا جائے۔ یہ میں ہونے نہیں دوں گی۔ میں اس کا دل موڑنے پر قادر نہیں ہوں لیکن اس کے قدم موڑ لانے کی سکت ہے مجھ میں۔"

یہ کہہ کر تیزی سے اسٹڈی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ اس کا رخ امیر حمزہ کے کمرے کی طرف تھا۔ اس سے پہلے اس نے بابی جان سے حیدر رحمانی کی بابت پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ برہان کو لے کر قریب ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اپنے کسی دوست کی طرف گئے ہیں۔ ان کے حوالے سے تسلی کر کے قانتہ مضبوط لکڑی سے بنی سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی آئی۔ امیر حمزہ کے کمرے کا دروازہ مکمل بند نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے یا باہر گیا ہے۔ قانتہ نے بلا اجازت اندر داخل ہونا مناسب نہیں جانا اس لیے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کانوں میں حور کی آواز پڑی۔ "یہ اندر کیا کر رہی ہے۔؟" اس کے دل میں وسوسے سے جاگے۔ اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا لیا اور ذرا دروازے سے قریب ہو کر کان لگا دیے۔

"میں نے پہلے ہی بولا تھا کہ بس کرو اب۔ چھوٹے ذہن کی لڑکی ہے، گلے پڑ جائے گی لیکن تم پر تو اس کی صورت کا سحر طاری تھا۔" یہ بے زار اور تحقیر سے بھرپور لہجہ حور کا تھا۔ قانتہ کی ساری حسیات چوکس تھیں۔

"ہائے، ظالم صورت کی بات نا کرو۔ اس کی صورت تو میں اگلے دس سال بھی بھول نا پاؤں۔ ایسے چہرے کہاں نظر آتے ہیں جن کی تشبیہہ کے لیے چاند بھی ماند لگے۔ لاکھوں نہیں، کروڑوں میں ایک۔" امیر حمزہ کی تھرتھراتی آواز اس کے جذباتی ہیجان کا پتا دیتی تھی، دوسری طرف حور نے سخت کبیدہ خاطر ہو کر پہلو بدلا تھا۔

"تو ڈال لو گلے میں اس ڈھول کو۔ چار دن ہی بجاؤ گے۔ آخر کو کان کے پردے پھاڑے گا ہی۔"

اس کا اشارہ جگنو کے جسمانی عیب کی طرف تھا یا کسی اور طرف، قانتہ کو اندازہ نہیں ہو پایا لیکن اس کی رگوں میں خون کی گردش نے رفتار پکڑ لی تھی۔

"ایک بات کہوں حور! میرا کل پکا ارادہ بن گیا تھا کہ میں واپسی پر پاپا اور ممی کو اوزئے کے بارے میں بتاؤں، اس کی خوب صورتی، نفاست اور مزاج کا سلجھاؤ، سبھی کچھ ممی کو اپیل کر سکتا تھا۔ وہ اسے بہو بنانے پر لازمی راضی ہو جاتیں لیکن پھر نا جانے مجھے کیا ہوا، میں ریمان سے بات کر رہا تھا اسکائپ پر۔ اس نے مجھے اپنے آپ میں الجھا رکھا تھا جب اچانک اوزئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے سامنے ریمان تھی کامل وجود لیے لیکن دلکشی میں اوزئے کا پاسنگ بھی نہیں۔ اور دوسری طرف اوزئے تھی جس کا حسن کسی کو بھی شاعر بنا دے لیکن اس کی لنگڑاہٹ نے جیسے مجھے جھنجھنا کر رکھ دیا۔ میرے اعصاب جو اس کے حسن کے سحر کے زیر اثر کئی دن سے شل ہوئے پڑے تھے یک دم نارمل ہوتے چلے گئے۔ یہ سب۔ یہ سب چند لمحوں کی بات

تھی۔ ان ہی چند لمحوں نے مجھ سے فیصلہ کروا دیا کہ میں اوزئے کے جسمانی عیب کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتا، بھلے اس جیسی پھر کوئی نا ملے لیکن اس جیسی کا ساتھ مجھے مستقبل میں کئی مقامات پر شرمندگی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اوزئے کی بے تحاشا خوب صورتی ہی دوسروں کو اس کے نقص کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہے، لوگ اسے وفور شوق سے دیکھتے ہیں اور پھر مبہوت ہو جاتے ہیں لیکن اگلا پل انہیں شاکڈ کر دیتا ہے، وہ اس پر ترس کھاتے ہیں۔ اس کے بے داغ حسن کو اس کی ٹانگ کا یہ نقص گہنا کر رکھ دیتا ہے اور میں لوگوں کی ترحم بھری نظروں کا سامنا ساری عمر نہیں کر پاؤں گا۔ میرے لیے یہ ناممکن ہے۔"

وہ بڑے سکون سے اوزئے رحمانی کے ہی گھر میں بیٹھا اس کی شخصیت کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ قانتہ کو اس کی سطحی اور کریہہ سوچ نے کراہیت میں مبتلا کر دیا تھا، اس کا جی چاہا کہ دھاڑ سے دروازہ مارتی اندر جائے اور اس کا منہ نوچ لے یا پھر دھکے مار مار کر اسے اس گھر سے نکال دے یا پھر اس گفتگو کا مزا لیتی حور کو را کا پوشی سے دھکا دے ڈالے لیکن اس نے خود کو جبر کر کے روک لیا۔ وہ جگنو کو مزید ارزاں کیسے کر سکتی تھی۔ کیا اس کی محبت کی تذلیل کرتی......؟ وہ واپس مڑنے لگی لیکن حور کے اگلے فقرے نے پھر اس کے قدموں کو زنجیر کر لیا۔

"میں جانتی تھی میر کہ تم اس لڑکی کے پیچھے ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہے ہو۔ میں نے تو مذاقاً تمہیں چیلنج کیا تھا اسے پٹانے کا لیکن تم کچھ زیادہ ہی سیریس ہو گئے وگرنہ اگر تمہاری دور و قریب کی نظر کام کرتی ہوتی تو اس جیسی کئی پری پیکر ارد گرد دکھائی دیتیں۔ چلو خیر۔ تم نے ٹھیک وقت پر ٹھیک فیصلہ کیا ورنہ اگر تم اس لنگڑی سے شادی کر لیتے تو میں ہمیشہ گلٹ کا شکار رہتی کہ میرے ایک ردی سے چیلنج نے تمہاری لائف خراب کر دی۔ اونہہ!"

حور کے اندر جتنا زہر تھا وہ تمام اس نے اپنی بات میں انڈیل کر اگل دیا تھا۔ کتنی بے رحم تھی یہ لڑکی۔ ٹپ ٹپ۔ قانتہ کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھکتے اس کے بچوں سے پھولے گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ تو امیر حمزہ سے جگنو کے حق کے لیے لڑنے آئی تھی لیکن اسے مات ہوگئی، وہ ہار گئی۔ یہ ہار اس ہار کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو جگنو کو محبت میں ملی تھی۔ اس کی دوست اس راہ پر منزلوں پر منزلیں مارتی آگے بڑھتی چلی گئی جس کی کوئی منزل ہی نہیں تھی۔

"میں نے پاپا کو کل رات ہی کال کر دی ہے۔ اسی وقت خالد کو روانہ کر دیا تھا انہوں نے، کل دوپہر تک پہنچ جائے گا۔ ہمیں اب یہاں سے چلنا چاہیے۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا بولا۔ "بہت ہو گیا ایڈوینچر۔ تم بھی اپنی پیکنگ کر لو اور برہان کو بھی کہہ دو۔ بابی جان بتا رہی تھیں کہ کل صبح انکل رحمانی اسلام آباد جا رہے ہیں دو دن کے لیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی غیر موجودگی میں ہم نکل جائیں، وہاں پہنچ کر کال کر دیں گے کہ پاپا نے ارجنٹ بلا لیا تھا اس لیے آنا پڑا۔ بلکہ تم ایسا کرو کہ برہان کو بھی ابھی مت بتاؤ، کل اچانک سے خالد پہنچ جائے گا تو اسی ہڑبونگ میں نکل چلیں گے، ورنہ اس "اخلاقیات" کے استاد نے ایسے نہیں جانا اور میں اوسٹلی اوزئے کا سامنا کرنا نہیں چاہتا، میری کوشش ہوگی کہ میں اس سے ملے بغیر چلا جاؤں۔ ناؤ ہری اپ۔ پیک یور بیگز۔"

ایک جست میں سارا پروگرام ترتیب دے کر وہ یک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ حور تو جیسے تیار بیٹھی تھی، واپسی کا سن کر تالی بجاتی اٹھ کھڑی ہوئی اور امیر حمزہ کو انگوٹھا دکھا کر "ڈن" کا سگنل دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر آتی، قانتہ تیزی سے سائڈ بیسج کی طرف مڑ گئی تھی۔

اس شخص میں تو اتنی بھی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ اپنے میزبانوں کو واپسی کی خبر کرتا۔ وہ چوروں کی طرح جانا چاہتا تھا۔ تو ٹھیک ہے۔ چور جو ہوا۔ نقب لگانے آیا تھا، کام ہو گیا تھا سو اب چلتا بنے۔

قانتہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ جگنو کو اس سب کی بھنک بھی پڑنے نہیں دے گی۔ وہ اس وقت جس تکلیف

سے دوچار تھی، کچھ بعید نا تھا کہ یہ راز وادی کے بچے بچے پر آشکار ہو جاتا کہ اوزئے رحمانی اپنے مہمان کو دل کا مکیں کر بیٹھی ہے۔ وہ آج کل اپنے آپ میں کہاں ہوتی تھی، اس پہ تو عجب بے خودی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ یوں جیسے عشق کی قبا اوڑھے کوئی انجان روح بھٹکتی پھرتی ہو۔ اسے بے خبر رکھنے میں ہی عافیت ہوتی۔ وگرنہ اس کا دکھ اس کے وجود کے ریشے ریشے سے ابلے گا اور ساری وادی کو سیاہ کر دے گا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ کل اسے کیا کرنا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ ابھی اسے جگنو کا سامنا بھی کرنا تھا۔

☆☆☆

''میں نے کہا تھا نا کہ میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے، امیر حمزہ کو انسان بنانا۔ ایسی بے نقط سنائیں کہ حواس جاتے رہے محترم کے۔ وہ بولی میں، وہ بولی میں کہ آئندہ کے لیے میری ہی بولتی بند ہو گئی، ہاہا۔''

قانتہ کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ اس نے اپنا مذاق اڑایا تھا درحقیقت لیکن اوپری دل سے وہ مکمل جگنو کو تسلی دیے جا رہی تھی۔ وہ کس قدر شکستہ قدموں سے واپس جگنو کے پاس آئی تھی یہ وہی جانتی تھی۔ اسے جگنو کی حالت کا احساس نا ہوتا تو ایک لمحہ بھی یہاں نا رکتی۔ حور اور امیر حمزہ کے مکروہ چہرے دیکھنے کے بعد تو ہرگز بھی نہیں لیکن اس کی مصیبت یہ تھی کہ جگنو میں اس کی جان تھی۔ جگنو صرف اس کی دوست نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی کا تین چوتھائی تھی۔

وہ اسے ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس نے جگنو کو بنانے میں بہت کردار ادا کیا تھا۔ ایک طویل مدت لگی تھی جگنو کا دوستی جیسے رشتے پر اعتبار ابھارنے کے لیے۔ وگرنہ وہ تو سدا سے ایک خول میں بند تھی۔ یہ قانتہ ہی تھی جس نے اس خول کو بڑے سلیقے سے ہٹایا تھا۔ وہ خول ہٹا تھا، ٹوٹا نہیں تھا۔ قانتہ جانتی تھی کہ ایک ذرا سی بے اعتباری جگنو کو واپس اس میں بند کر دے گی۔

وہ بڑا جبر کر کے اس کے سامنے بیٹھی لہک لہک کر بول رہی تھی جیسے واقعی امیر حمزہ کو چار دس شانے چت کر آئی ہو۔ جگنو کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ یک ٹک قانتہ کو تکے جا رہی تھی۔ نا تردید نا تائید۔ بس ایک جامد نگاہ۔

قانتہ نے تھوک نگلی اور اس سے نظر چرا کر دھیان دریچے سے نظر آتے باغیچے کی اور مرکوز کیا۔ ذرا اچک کر باہر دیکھا۔ حبیبہ اور بابی جان کرسیوں پر بیٹھی اون کے لچھے سلجھا رہی تھیں۔ یہ بابی جان کا فارغ وقت کا شغل تھا۔ وہ بے تحاشا بنتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو درختوں پر پھدکتی ننھی چڑیاں بھی چھوٹے چھوٹے اونی سوئٹروں میں ملفوف نظر آتے۔

ایک ٹھنڈی سانس بند شیشے پر دھند کی تہ چھوڑ گئی۔ وہ پلٹی۔ جگنو ابھی بھی اسی انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس دفعہ قانتہ جواب میں مسکرا نہیں سکی تھی۔ چند پل دونوں ایک دوسرے کو یوں ہی گھورتی رہیں۔ جگنو کی اکڑی پلکوں میں جنبش ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے۔

''اس نے میرا مذاق اڑایا نا قانتہ۔ اس نے مجھے رد کیا نا۔ وہ یہی کرنے آیا تھا یہاں۔ لیکن قانتہ میں ہی کیوں۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔؟ مجھے ہی کیوں درد دے رہا ہے۔ مجھے ہی کیوں سولی چڑھا رہا ہے؟''

اس کے لہجے میں اوس اتر آئی۔ وہ ایسا مجبور فقیر دکھائی دے رہی تھی جسے کسی نے تپتی دھوپ میں خیرات کے لیے در پہ بٹھا رکھا ہو اور آخر میں اس کے کاسے میں کھوٹا سکہ ڈال دیا ہو۔ جگنو کی جھولی میں بھی ڈالی گئی محبت کھوٹی تھی۔ یا پھر اس کی جھولی میں چھید تھا۔ محبت ٹھہر ہی نہیں سکی۔

قانتہ بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر ضبط کھو بیٹھی۔ وہ کھڑے قد سے ایک دم گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی، جگنو کے بالکل سامنے اور ہار کر اس کی گود میں سر دھر کے اونچی اونچی بچوں کی طرح رونے لگی۔

''جگنو وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ وہ چور ہے، پکا چور۔ اپنے پیچھے کوئی بھی نشان نا چھوڑنے والا۔ تم اپنی مہار موڑ لو جگنو۔ وہ ایسا پڑاؤ ہے جگنو جہاں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ تم پلٹ چلو۔ پلیز پلٹ چلو۔'' وہ

اس کی گود میں منہ گھسائے بلکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تم غلط کہہ رہی ہو قانتہ! پڑاؤ نہیں تھا وہ بلکہ وہ تو مجھ میں بسیرا کر کے مجھے سنسان کر گیا۔ اس نے تو اپنے کواڑ میرے لیے کھولے ہی نہیں کہ میں وہاں سما جاتی۔ وہ تو میرے دل کے قفل توڑ کر وہاں مکیں ہوا اور جاتے جاتے اسے آسیب زدہ کر گیا۔ میرے دل میں جالے لٹک رہے ہیں قانتہ! خستہ حالی ٹھاٹیں مارتی ہے وہاں۔'' جگنو میکانکی انداز میں بولی اور پھر یک دم اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

''لیکن قانتہ...... کیوں...... میں ہی کیوں۔ پوری وادی میں اسے میں ہی ملی ویران کرنے کو۔ وہ مجھے نظر انداز بھی تو کر سکتا تھا۔ وہ مجھے سرسری بھی تو لے سکتا تھا، لیکن اس نے مجھے خاص لیا اور اب میرے بارے میں کہتا ہے۔'' کوئی خاص نہیں۔''

رہ رہ کر اسے امیر حمزہ کے اس فقرے کی بازگشت ستاتی تھی۔

''جگنو! میری بات سنو۔'' قانتہ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں سختی سے دباتے ہوئے کہا۔'' کل انکل کو دو دن کے لیے اسلام آباد جانا ہے اور میں تمہیں دو دن کے لیے اپنے گھر لے جاؤں گی، سمجھی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اکیلی کڑھتی رہو۔ انکل واپس آجائیں تو میں خود ان سے کہوں گی کہ اب ان سب کو چلتا کریں۔ سنا تم نے؟''

قانتہ کے انداز میں تحکم تھا۔ درحقیقت وہ نہیں چاہتی تھی کہ کل جب امیر حمزہ واپس جائے تو جگنو یہاں ہو۔ وہ اسے کچھ دیر کے لیے سب کی نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتی تھی۔

جگنو نے اس کی بات کے جواب میں اسے خالی نظروں سے دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں بابا کی غیر موجودگی میں کہیں نہیں جاؤں گی قانتہ! بابی جان کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔ میں ٹھیک ہوں۔ میری فکر مت کرو۔ چوٹ ابھی گرم ہے، ٹھنڈی ہو گی تب اثرات سامنے آئیں گے اور شاید میں تب تک خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جاؤں، شاید۔'' وہ ایک کثیف سانس خارج کرتے ہوئے لاچاری سے بولی۔ قانتہ اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی، مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ تاسف سے جگنو کے جھکے سر کو دیکھتی کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

بادلوں کی ملکہ کی رنگت آج زرد دکھائی دیتی تھی۔ اردگرد تیرتے بادل اور ان کی پھوار کی مانند چھلکتی نمی بھی اس کا جی خوش کرنے میں ناکام تھی۔ اس کے گدرائے ہوئے پیروں کے نیچے بادل بوسے دیتے گزر رہے تھے لیکن وہ سب سے بڑے اور دلکش تیز گلابی رنگت والے بادل پر براجمان سر نیہوڑائے بیٹھی بے حد دلگیر تھی۔ آج اس کا بادل بادل پھرنے کا موڈ نہیں تھا۔ اسے تو اپنے راجا کا انتظار تھا جو کئی دن ہوئے اسے وعدے کا سنہری تاروں سے بنا الجھا ہوا لچھا پکڑا گیا تھا، اور اب اسے لپیٹنے میں اس کی انگلیاں فگار ہو چلی تھیں۔ راجا نے کہا تھا کہ اس کے مکمل ہونے سے پہلے میں لوٹ آؤں گا، لیکن کتنے ہی دن بیت گئے۔ وہ الجھا لچھا سنہری گولے میں ڈھل گیا مگر وہ نہیں آیا۔

معاً اس کی نظروں نے دور بادلوں کے ہیولے میں سے کسی کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ وہ مارے خوشی کے یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے پتا بھی نا چلا کہ کب سنہری تاروں کا گولا اس کی گود سے گر کر نیچے کہیں بہت نیچے دنیا کی عمیق گہرائی میں گر گیا، صرف ایک سرا اس کے گلابی لبادے کی مخملیں جھالر سے اٹکا پڑا تھا۔ خوب صورت راجا اس کے قریب آیا۔ بے حد حقارت اور تنفر سے اس کی جانب دیکھا، اس کی آنکھیں شکوہ کر رہی تھیں کہ وہ اس کے وعدے کا پاس بھی نا رکھ سکی۔ اس کا وعدہ اب اس کا نہیں رہا، دنیا والوں کا ہو گیا کیونکہ وہ اس کے دامن سے جھٹک گیا۔ اب وہ دنیا میں جائے گا اور جس کے پاس بھی وہ سنہری گولا ہو گا، وہی اس کی ملکہ بنے گی۔ راجا مڑا اور غصے میں اپنی آتشیں تلوار نیام سے نکالی اور گلابی بادل کے رتھ میں لگی سونے سے بنی

لگامیں ایک وار میں کاٹ ڈالیں۔ دو آنسو ملکہ کی آنکھوں سے ٹپک کے بادل میں سما گئے۔ طلاطم پیدا ہوا اور گڑگڑاہٹ نے راجا کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑا، جاتے جاتے ایک آخری وار رتھ کے نقشیں چاندی جیسے چمکتے پہیے پر کیا اور اسے دولخت کر دیا۔ اور ملکہ کو نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتا بادلوں کے ہیولے میں گم ہو گیا۔ وہ گونگی بنی راجا کو دنیا میں اترتا دیکھتی رہ گئی۔ راجا اپنا وعدہ ڈھونڈنے چلا گیا تھا۔ یک دم ملکہ کی گیلی نگاہوں کی زد میں وعدے کے سنہری گولے کا سرا آ گیا، اس نے جھک کر فوراً اسے اپنی مخملیں جھالر سے الگ کیا اور کسی متاع کی طرح سینے میں بھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ جیسے ایک امید کا سرا لگا تھا۔ وہ واپس اسی بادل پر کسی داسی کی طرح آن بیٹھی اور بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ اس سرے کو دوبارہ لپیٹنا شروع کیا۔ اسے امید تھی کہ ایک دن وہ راجا کا وعدہ دوبارہ حاصل کر لے گی۔ وہ اسے منا لے گی کیونکہ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں سرا ہے۔ لیکن ملکہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جلد ہی کوئی اس کے پیروں کے نیچے سے بادل کھینچنے والا ہے۔

☆☆☆

وہ مسلسل ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہی تھی، حتی کہ اس کی آنکھیں دکھنے پر آ گئیں لیکن اس نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ ایسا جمود طاری تھا اس پر کہ جیسے اسے حنوط کر دیا گیا ہو۔ صبح فجر کے بعد سے وہ بستر پر چت لیٹی تھی اور چاہتے ہوئے بھی سو نہیں پائی تھی۔ دل و دماغ مسلسل امیر حمزہ کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ وہ اس ورد سے تنگ آتی جا رہی تھی پر اسے روک دینے سے قاصر تھی۔ اس کے تو جسم کی رگ رگ تسبیح بن چکی تھی اور ہر رگ میں امیر حمزہ کا جاپ خون کی گردش کے ساتھ جاری تھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں موند لیں، وہ تھک گئی تھی۔ وہ اس اذیت سے چھٹکارا چاہتی تھی پر سبب بنتا نظر نہیں آتا تھا۔ معاً دروازے پر کھٹکا ہوا تھا۔ اس نے فوراً پلکوں کو سختی کے ساتھ ایک دوسرے میں پیوست کیا۔ اس وقت وہ کسی کا بھی سامنا کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بابی جان کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا، اس کے ناشتے کا وقت تھا اور ان کے لیے اس کا وقت پر کھا پی لینا زندگی موت کا مسئلہ ہوتا تھا، لیکن اس کی بند آنکھوں میں حیرت سی مچلی جب اس نے حیدر رحمانی کی آواز سنی۔

''بابا اتنی صبح میرے کمرے میں۔ اف...... کہیں انہیں کچھ شک تو نہیں ہو گیا، مجھ سے باز پرس کرنے آئے ہوں۔'' اس نے تاسف سے سوچا اور سوتی بنی رہی۔ وہ خود کو بابا جان کے کسی سوال کا جواب دینے کا اہل نہیں پاتی تھی۔ اسے نہیں جاگنا تھا۔

''ٹھہرو حیدر بیٹا! میں اٹھاتی ہوں جگنو کو۔ آج پتا نہیں کیوں اتنی سست ہو رہی ہے۔ پہلے بھی ایک دفعہ جگانے کی کوشش کر چکی ہوں۔'' بابی جان، حیدر رحمانی سے کہتیں اس کے بیڈ کی پائنتی کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

''نا نا نا رہنے دیں بابی جان۔ مت اٹھائیں۔ تھکن ہوئی ہو گی جب ہی سو رہی ہے۔ ویسے بھی اتنے دن سے مہمانوں کے ساتھ گھومنا پھرنا چل رہا ہے۔ آپ مت اٹھائیے اسے۔ میں کال کر لوں گا اسلام آباد پہنچ کر۔ دو دن ہی کی تو بات ہے۔ کوشش کروں گا جلد از جلد واپسی ہو جائے کیونکہ برہان کہہ رہا تھا کہ انہیں بھی گھر والوں کی طرف سے کال پر کال آ رہی ہے، جیسے ہی میں آؤں گا وہ لوگ نکل جائیں گے۔ میں نکلتا ہوں اب، چنگیز نیچے جیپ لے کر پہنچ گیا ہے۔'' حیدر رحمانی نے جھک کر جگنو کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے چوما اور معمولی سا سہلاتے ہوئے رکھ دیا۔ جگنو کا جی بھر آیا۔ اس کے بند پپوٹوں کے پیچھے نمی جمع ہونے لگی۔ اس کا دل کیا ابھی اسی وقت آنکھیں کھولے اور اٹھ کر اپنے بابا کے گلے لگ جائے، خوب روئے، اتنا روئے کہ وہ جانا سکیں لیکن وہ جنبش بھی نا کر سکی۔ یوں ہی چت پڑی رہی۔

''مت فکر کرو حیدر بیٹا! خیریت سے جاؤ اور خیریت سے واپس آؤ۔ رابطے میں رہنا بیٹا۔''

"جی ان شاء اللہ اور میں واپس آلوں تو ارمغان مشہدی سے بات کروں گا امیر حمزہ کے سلسلے میں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا انتخاب بہترین ہے۔ چلیے آجایے۔ میں بھی نکلوں اب۔"

وہ بھرپور یقین سے کہتے بابی جان کو لیے کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے اور دروازہ بند ہوتے ہی آنسو جگنو کی بند آنکھوں کے کناروں سے نکل پڑے۔ اس کے بابا جان کیا سوچے بیٹھے ہیں۔ اس کے لیے جس کے لیے میں کچھ خاص نہیں۔

پتا نہیں اس کے دل کو گھبراہٹ نے کیوں گھیر رکھا تھا۔ وہ ابھی بھی بابا جان کو روک لینا چاہتی تھی پر بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ یوں جیسے اس کے ارادوں پہ بندش کر دی گئی ہو۔ وہ حنوط شدہ لاش کی طرح پڑی اپنے بھرے بھرے وجود کا نوحہ گلے میں تعویز کی صورت ڈالے اہرام محبت میں قید ہو چکی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ حیدر رحمانی کو گئے چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ سب کھانے کی میز پر جمع تھے۔ بابی جان آج خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی تھیں ورنہ حیدر رحمانی کی موجودگی میں انہوں نے کبھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

حور اور امیر حمزہ حسب معمول اونچا اونچا بول رہے تھے، ان کے بے تکے قہقہے چھت پھاڑ رہے تھے۔ ہر دو منٹ بعد وہ معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر گھڑی پر وقت دیکھتے اور پھر باتوں میں مشغول ہو جاتے۔ ساتھ ساتھ کھانے سے بھی بھرپور انصاف ہو رہا تھا۔ برہان البتہ نا جانے کس سوچ میں غرق بابی جان کو چونکا گیا تھا۔ انہوں نے اس کی پلیٹ کی جانب نگاہ کی جس میں بس الٹے سیدھے چمچ چلائے گئے تھے ورنہ چاول جوں کے توں پڑے تھے۔

"برہان بیٹا! کیا بات ہے، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں کیا؟ اگر کچھ اور کھانے کا جی ہو تو مجھے بتاؤ بیٹا، میں ابھی بنا لاتی ہوں۔ آپ تو کچھ بھی نہیں کھا رہے۔" وہ ایک دم چونکا تھا۔ افسردہ سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا اور پھر وہ بابی جان کو دیکھتے ہوئے بڑے رسان سے بولا۔

"بس یوں ہی میرا دل نہیں کر رہا۔ اصل میں اتنے دن سے حیدر انکل کی کمپنی کی عادت سی ہو گئی ہے، اس لیے آج اکیلے کھانے میں کچھ مزا نہیں آ رہا۔"

اس نے بابی جان کی تسلی کے لیے بات بنائی تھی یا کچھ بھی تھا، حور نے ضرور اس کی طرف تنفر سے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ امیر حمزہ کی طرف رخ پھیر لیا تھا۔

"میرا خیال ہے میں کچھ دیر آرام کرتا ہوں، شاید مجھے طبیعت میں بہتری محسوس ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور امیر حمزہ پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈال کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اوندھے منہ بستر پر یوں گرا جیسے کتنی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے دماغ کی چولیں یک دم چٹخنے لگیں۔ اب سے گھنٹہ پہلے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے چرمرانے لگا۔

حیدر انکل کو سی آف کرنے کے بعد وہ یوں ہی وادی میں نکل گیا تھا۔ کتنی دیر وہ پھرتا پھراتا رہا تھا۔ اتنے دن میں اسے حیدر رحمانی سے بلا کی انسیت پیدا ہوئی تھی۔ بڑے بابا نے جوان کے مزاج کی سختی کے متعلق کہا تھا، برہان نے انہیں یکسر الٹ پایا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹے ہوئے انسان تھے۔ اپنی بیوی سے انہیں آج بھی روز اول سی محبت تھی اور پھر اوزے! اس کے حوالے سے جو خواب انہوں نے دیکھ رکھے تھے، وہ تمام انہوں نے برہان سے دوستوں کی طرح شیئر کیے تھے اور اس بات نے اس کے اندر شدید قسم کا گلٹ پیدا کیا تھا کیونکہ امیر حمزہ کی لاکھ یقین دہانیوں کے باوجود بھی اسے اندر سے بے یقینی تھی۔ امیر حمزہ کوئی گیم کھیل رہا ہے، اس بات کا اسے یقین تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آج ہی امیر حمزہ کا اوزے کے ساتھ نکاح پڑھوا دیتا لیکن یہ معاملہ اس کے بس کا نہیں تھا، یہاں سے جا کر ہی بڑوں سے بات کی جا سکتی تھی۔ اسے امید تھی کہ بڑے بابا، ہمایوں انکل کو اس رشتے کے لیے قائل کر لیں گے۔

ان ہی اوٹ پٹانگ خیالوں میں مگن اس نے ناجانے کتنا وقت وادی میں پھرتے پھراتے صرف کر ڈالا تھا۔ چھوٹے سے ڈھابے سے چائے کا کپ پی کر وہ واپس آ گیا۔ گیٹ کھلا تھا اس لیے سیدھا اوپر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ابھی سیڑھیوں کے آخری اسٹیپ پر تھا جب اس نے امیر حمزہ کو جگنو کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بری طرح ٹھٹکا۔ ناگواری کی تیز لہر کے زیر اثر وہ دبے پاؤں چلتا کمرے کے باہر آن کھڑا ہوا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ برہان نے بہت احتیاط سے اندر جھانکا۔ کمرے کے بیچوں بیچ جگنو چھوٹے سے غالیچے پر گھٹنوں کے بل یوں بیٹھی تھی جیسے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھا بھکاری، جسے مانگنے کا سلیقہ نا آتا ہو۔ حزن و ملال سے بھرپور چہرے کے گرد بکھری لٹیں اس کی ہار کا پتا دیتی تھیں۔ امیر حمزہ یقیناً کھیل لپیٹ گیا تھا۔ برہان کے جی میں آیا کہ اندر جائے اور اسے دلاسا دے، مگر وہ اس سے کیا کہتا؟

وہ ایک طویل اور تکلیف دہ سانس چھوڑتا وہاں سے ہٹ گیا۔ ویسے بھی اسے جگنو کے حالت دیکھ کر خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"کاش...... کاش وہ اس کا دکھ دور کر سکتا۔"

اس نے بستر پر اوندھے لیٹے زور سے مکا تکیے پر کھینچ مارا۔ اس کا بس چلتا تو وقت کو پلٹا دیتا اور کبھی یہاں نا آیا ہوتا۔ تو ایک دلربا، نازک سی لڑکی دکھوں سے آشنا نا ہوتی۔

یوں ہی خود سے لڑتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے مسلسل آوازیں دے رہی تھی۔ وہ فوراً لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہو گیا ہے برہان! کب سے اٹھا رہی ہوں۔ اٹھو جلدی کرو، ہمیں ابھی نکلنا ہے۔ اٹھو...... امیر حمزہ کی ممی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ اس کے پاپا نے خالد کو ارجنٹلی بھیجا ہے ہمیں پک کرنے کے لیے۔ وہ بہت پریشان ہو گیا ہے۔ ہمیں ابھی نکلنا ہو گا۔"

برہان کے حواس ابھی مکمل الرٹ ہوئے تھے۔ ذہن چونکہ ابھی تک بے دار نہیں ہوا تھا اس لیے بوکھلاہٹ میں فوراً اٹھ کر اپنی چھوٹی موٹی چیزیں سمیٹنے لگا۔ حتیٰ کہ جب حور نے اسے بتایا کہ اس کا سارا سامان پیک ہے تب بھی وہ حیرت کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر اس اوزے کی حالت کا اثر تھا، جلدی جلدی وہ اس کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

"اچھا بابی جان! ہم نکل رہے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا کیجیے گا کہ سب خیریت ہو۔ آپ نے اتنے دن ہمارا بہت خیال رکھا اور اب ہمیں یوں ایک دم انکل حیدر کو بھی اطلاع دیے بغیر واپس جانا پڑ رہا ہے، اچھا نہیں لگ رہا لیکن مجبوری ہے۔ امیر حمزہ کی ممی کی کنڈیشن اچھی نہیں۔ آپ پلیز دعا کیجیے گا کہ سب بہتر ہو جائے۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو میں ابھی چند دن مزید آپ کے پاس رکتی۔ لیکن......"

حور کی لفاظی اور بابی جان کے چہرے پر حیرت کے شدید تاثرات۔ برہان یک دم جیسے ہوش میں آیا۔ وہ ان کا جواب سنے بغیر ان سے عجلت میں پیار لیتا سائڈ سے باہر نکلتا چلا گیا۔ حور ابھی بھی وہیں کھڑی اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھا رہی تھی۔

امیر حمزہ اسپورٹس جیپ میں خالد کی مدد سے سامان رکھ رہا تھا جب اس نے کن انکھیوں سے برہان کو تیزی سے خود کی طرف آتے دیکھا۔ اس نے اپنے چہرے پر فوراً پریشانی اور سراسیمگی طاری کر لی تھی۔

"یار میر! یہ حور کیا کہہ رہی ہے۔ کیا واقعی آنٹی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں؟ اور بڑے بابا نے مجھے فون پر کیوں نہیں بتایا۔ حیرت ہے۔" اس کے لہجے میں چھپی حیرانگی اور بے یقینی امیر حمزہ کو صاف محسوس ہوئی تھی۔

"انہوں نے تمہیں کال کی تھی مگر نیٹ ورک ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے بھی صبح ہی کال آئی تھی اور خالد کو تو مجھ سے پوچھے بغیر روانہ کیا انہوں نے۔ ممی دو دن سے ہاسپٹلائزڈ ہیں۔ بس مجھے کسی بھی طرح جلد از جلد ان تک پہنچنا ہے۔" دل میں چور تھا کہ کہیں

برہان وہاں کسی کو کال نا کر لے اس لیے فوراً جواب دیا مگر دانستہ لہجے کو سپاٹ رکھا تا کہ اس کو پریشان جان کے برہان زیادہ سوال جواب نا کرے لیکن برہان کے ہر انداز سے بے چینی عیاں تھی۔ اس نے بالوں میں دو تین دفعہ ہاتھ پھیر کر انہیں سنوارا اور پھر دونوں ہتھیلیوں کو چہرے پر پھیرتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں انکل حیدر کو بتا کے نکلنا چاہیے۔ اس طرح مناسب نہیں لگتا میر۔ اتنے دن انہوں نے ہماری مہمان نوازی کی ہے، اب یوں ایک دم اچانک سے ہم بلاوجہ نکل پڑیں تو کتنا آکورڈ لگے گا۔''

''بلاوجہ نہیں...... میری ماں بیمار ہیں برہان اور تمہیں یہ سب غیر مناسب لگ رہا ہے۔ واہ، سوپر۔'' امیر حمزہ تیوریاں چڑھائے طنزاً بولا کہ وہ یک دم شرمندہ سا ہو گیا۔

''سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا میر۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ اصل میں اس اچانک ٹینشن نے میرے حواس سلب کر لیے ہیں۔ ٹھیک ہے چلو لیکن میں انکل کو کال کرنا لازم سمجھتا ہوں۔''

اس نے کہنے کے ساتھ ہی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا، مگر اس سے پہلے کہ نمبر پش کرتا، امیر حمزہ نے فون اچک لیا۔

''ڈونٹ گیٹ سو کانشس۔ ان کو کل رات ہی انکل ارمغان کی کال جا چکی ہے۔ مجھے بتا چکے ہیں وہ اور ساتھ میں منع بھی کیا کہ اب کال نا کرنا وہ اسلام آباد سیمینار میں بے حد بزی ہیں اور موبائل سوئچ آف کر رکھا ہے۔ اس لیے تم بے فکر ہو کر چلنے کی کرو بس۔ ہری اپ۔ حور کو بھی بلاؤ، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ ملنے ملانے میں زیادہ وقت برباد نا کرے۔'' برہان ناگواری سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شک ابھی بھی ہلکورے لے رہا تھا مگر اس نے محض سر جھٹک کر خاموشی سے اپنا سیل فون پاکٹ میں ڈالا اور بے زار شکل بنائے جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ امیر حمزہ نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر فوراً آنکھوں پر سن گلاسز چڑھا لیے۔ آج بہت دن بعد دھوپ نکلی تھی۔ سورج کی حرارت بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ سامنے سیدھی پگڈنڈی بالکل سنسان پڑی تھی۔ جیپ کا رخ دوسری طرف تھا۔ برہان نے پلٹ کر شیشے کے پار کھائی کی طرف جاتے رستے پر جگنو کو تلاشا۔ اسے آس سی تھی کہ شاید وہ اس وقت وہیں کہیں سے نمودار ہو جائے تو کم از کم وہ اپنے ایک میزبان سے تو مل سکے گا۔

لیکن وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ خاص طور پر اب جیپ سے اتر کر واپس اندر اس سے ملنے جاتا تو پتا نہیں حور اور میر اس بات کو کیا رنگ دیتے۔ اس کی بھنویں اکٹھی ہو گئی تھیں، آنکھوں کو پرسوچ انداز میں سکیڑتے ہوئے اس نے رخ اونچا کر کے داہنی طرف اوزئے رحمانی کے کمرے کی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ بند تھی اور دبیز پردوں کی آڑ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک مایوس کن سانس خارج کر کے وہ سیدھا ہو گیا۔ امیر حمزہ مسلسل ٹانگیں تھرکائے جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اکتا کر تھوڑا اتر چھا ہوا اور ہارن پر ہاتھ رکھ دیا پھر حور کو باہر آنے میں وقت نہیں لگا تھا۔ وہ بڑی ادا سے چلتی ٹریولنگ بیگ گھسیٹتی آ رہی تھی۔ اس کے چمکتے ارغوانی رنگ لیے بال دھوپ میں دہک اٹھے تھے۔ آج تو اس کے چہرے پر محسوس کی جانے والی تازگی تھی، جیسے بہت بڑے بوجھ سے چھٹکارا پا کے آئی ہو۔ جیپ کے قریب آ کر بیگ خالد کے حوالے کیا اور اپنی سیٹ کا دروازہ کھولنے سے پہلے ایک بھرپور استہزائیہ نگاہ ''رحمانی ولا'' پر ڈالی۔ لیکن ابھی بیٹھنے بھی نا پائی تھی کہ آناً فاناً وہ ہوا جس کا ان تینوں میں سے کسی نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

وہ صبح بابا کے جانے کے بعد سے ہی اپنے اندر عجب ویرانی محسوس کر رہی تھی۔ ایک خالی پن سا اسے اندر باہر سے کاٹ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلی دفعہ وادی سے باہر گئے ہوں، کئی کئی دن تک سیمینارز آئے روز چلتے ہی رہتے تھے، لیکن آج کے جانے میں کچھ کسک سی تھی۔ وہ جو نہیں روک لینا چاہتی تھی وہ یوں ہی نہیں تھا۔ اپنے ہی گھر میں یک دم اجنبیت کا احساس جاگ اٹھا تھا، وہ دبک کر بستر میں بیٹھ رہی تھی۔ تب تک...... جب تک امیر حمزہ نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ اس کی اجازت کے جواب میں امیر حمزہ کا چہرہ نمودار ہونے پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ دل کو فوراً خوش گمانی نے تھپتھپایا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی روشنی کھینچ لائیں۔ وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باادب، باملاحظہ کی کیفیت تھی۔

''کیسی ہو اوزئے؟'' اس کے حال پوچھنے پر بھی وہ جامد کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ گلا صاف کر کے دوبارہ گویا ہوا۔ ''انفیکٹ...... میں آنا نہیں چاہتا تھا تمہارے پاس، لیکن پھر سوچا کہ اب چونکہ ہمارے جانے کا وقت قریب ہے، زندگی میں پھر کبھی ملاقات ہونا ہو۔ جانے سے پہلے چند باتیں کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کا طرز تخاطب بے حد پر تکلف تھا۔ جگنو کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ ''دیکھو اوزئے! تم بہت بہت اچھی لڑکی ہو۔ یہ سچ ہے کہ جب میں یہاں آیا تھا تم نے مجھے پہلی نظر میں ہی اس قدر متاثر کیا تھا کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔ یہ سب اچانک ہوا تھا۔ اب سوچوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی سحر تھا جس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں سچ کہوں تو میں نے آج تک تم جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔ میں اگر تمہاری دلکشی کو ماپنے لگوں تو پیمانہ اس کا بوجھ سہار نا پائے۔ تم سر سے پیر تک مجسم حسن ضرور ہو اوزئے مگر...... مکمل نہیں ہو اور میں تمہارا ادھورا پن نہیں بانٹ سکتا۔ یہاں میں خود کو لاچار پاتا ہوں۔ میں تمہاری معذوری کو اپنی مجبوری نہیں بنا سکتا۔ مجھ میں اتنا ظرف ہے اور نا ہی میں محبت کے اس مقام پر ہوں جہاں محبوب کا ہر عیب اس کی ادا لگتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے تم سے کبھی محبت ہوئی ہی نہیں۔ یہ محض ایک کشش تھی جس نے مجھے تمہاری اور کھچنے پہ مجبور کیے رکھا، وگرنہ یہ تو حور کا دیا چیلنج تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں تمہیں محبت کے دام میں پھنساؤں اور میں یہ چیلنج جیت گیا۔ اس کے آگے جو کچھ بھی ہوا یقین کرو اس کی ذمہ دار تم خود ہو۔ تمہیں لگا کہ میں تم پر اس حد تک مرمٹا ہوں کہ شادی کر لوں گا تو یہ تمہاری غلطی تھی اوزئے۔'' وہ اس قدر رسان سے بول رہا تھا جیسے کسی چھوٹے بچے کے ہاتھوں ہونے والے نقصان پر اسے سمجھایا جاتا ہے۔ ''اب جبکہ بات کھل ہی گئی ہے تو پلیز اپنے دل و دماغ کو میرے خیالوں سے باہر نکال لو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے کیونکہ میں اب دوبارہ یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ میں ایک جگہ پر دوبار پڑاؤ نہیں ڈالتا۔ چلتا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے ایک آخری بار ضرور کہوں گا کہ تم حسن کا استعارہ نہیں ہو بلکہ استعارے تمہارا حسن دیکھ کر تشکیل پاتے ہوں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔'' جاتے جاتے بھی شکاری آخری دانہ ڈال گیا تھا کہ لو میرے پیچھے اسے بیٹھی جپتی رہنا۔ وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ اس کی زندگی سے۔ پر وہ مکمل آیا ہی کب تھا۔ جگنو نڈھال سی گھٹنوں کے بل نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔ لٹی پٹی اور تباہ حال۔

تو گویا وہ ایک چیلنج ٹھہری۔ راکاپوشی کی چوٹی۔ خاص جسے کوئی سر کرنے کے لیے اتنی دور سے آیا اور اپنی جیت کا جھنڈا گاڑ کر واپس ہو لیا۔ لیکن...... لیکن وہی کیوں۔ وہی کیوں؟

جگنو کے حلق سے ایک ہذیانی سی دبی دبی چیخ نکلی۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں اپنے بال پکڑ کر نوچے جا رہی تھی۔ اپنے چہرے پر کس کس کر تھپڑ مار رہی تھی۔ میں ہی کیوں۔ میرے ساتھ ہی کیوں کا ورد اس کی زبان بے اختیار کیے جا رہی تھی۔ اسی ہیجانی کیفیت میں وہ بیٹھے سے سجدے کی حالت میں گئی اور دھاڑیں مار مار کر روتی چلی گئی۔

نا جانے کتنا وقت وہ یوں ہی پڑی رہی۔ نا اس کا جسم دکھ رہا تھا نا تھک رہا تھا کیونکہ جیسی دکھن اور تھکن اس کی روح میں اتری تھی اس کے آگے یہ وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ امیر حمزہ اس کی روح میں ایسا چھید کر گیا تھا جس سے ہر وقت اب آہیں رستیں۔ نوحے ......

روروکر اس پر نیم مدہوشی سی طاری ہونے لگی تھی جب اس نے کمرے سے باہر بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ پھر گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز اور ڈگی کے بار بار کھلنے بند ہونے کی آواز۔ لمحے کا ہزارواں حصہ لگا تھا اس کے حواسوں کو جان پکڑنے میں۔ وہ لڑکھڑاتی اٹھی اور بھاگ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ نیچے کوئی انجان جیپ کھڑی تھی جس کی فرنٹ سیٹ پر سن گلاسز لگائے امیر حمزہ بیٹھا تھا اور پیچھے اکتائے چہرے والا برہان۔ وہ چند ثانیے یوں ہی دیکھے چلی گئی۔ دل میں خیال اٹھا کہ آج پھر کہیں گھومنے پھرنے کا ارادہ ہے، لیکن آج ان کے ساتھ قانتہ کیوں نہیں۔؟ اور...... اور بابا کا ڈرائیور کدھر ہے، یہ جیپ کس کی ہے بھلا......؟ وہ اپنے دکھتے سر پر سوچ سوچ کر مزید بوجھ ڈال رہی تھی جب دفعتاً حور دکھائی دی۔ وہ اپنا چھوٹا سا ٹریولنگ بیگ گھسیٹتی گھر سے باہر نکل رہی تھی اور عین اسی وقت جگنو کی تمام حسیات۔ بے دار ہو گئیں۔ اسے یہ ادراک کرنے میں رتی برابر بھی دقت نہیں ہوئی کہ یہ سب واپس جا رہے تھے۔ یوں اچانک، ایک دم۔

''اوہ......تو امیر حمزہ تم سچ میں چوروں کی طرح نکلنے لگے ہو۔ تم حقیقتاً راہزن نکلے۔ تم نے لوٹنے کے لیے میرے شفاف جذبوں کی گھات لگائی اور جب مجھے مات ہو گئی تو راستہ بدل چلے ہو۔ ایسے کیسے امیر حمزہ۔ میں کوئی لوٹ کا مال نہیں تھی۔ میں اوزے رحمانی تھی، سیپ میں بند موتی جیسی۔ اوس کے قطرے جیسی۔ تم مجھے یوں ہلکا جان کر کیسے جا سکتے ہو۔ تمہیں کبھی نہیں آنا تا میرے پاس، لیکن میں تمہیں جانے ہی کیوں دوں گی۔ تم نہیں جا سکتے امیر حمزہ! ہرگز نہیں۔ مجھے زندہ دیوار میں چنوا کر مت جاؤ امیر حمزہ۔''

وہ بے چین ہوتے ہوتے یک دم ہسٹیریائی ہوئی تھی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہوتی چلی گئیں اور وہ دیوانہ وار یونہی ننگے پاؤں نیچے بھاگی جس گھڑی حور محظوظ مسکراہٹ چہرے پر سجائے گاڑی میں بیٹھی، جگنو لنگڑاتی ہوئی گیٹ پار کرتی تیزی سے ان کی جیپ کی طرف بڑھی۔

''امیر حمزہ...... امیر حمزہ...... رکو......تم ایسے نہیں جا سکتے۔ رک جاؤ پلیز۔''

''اوہ شٹ...... یہ ایڈیٹ کیسے باہر آگئی۔ یہ سب تمہارے دیر کرنے کی وجہ سے ہوا حور۔ کم آن مین۔ چلاؤ جیپ کو۔''

امیر حمزہ جگنو کو دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ وہ ہرگز اس سے ایسے ردعمل کی امید نہیں کر رہا تھا۔ اس نے طیش میں خالد کو جیپ چلانے کو کہا۔ جیپ دھیرے سے رینگنا شروع ہوئی۔

''پاگل ہو گئے ہو میر! گاڑی روکو خالد۔ میر، اوزے سے بات کرو تم...... وہ...... وہ دیکھو تو سہی کس حالت میں ہے۔'' برہان کو شدید تکلیف ہوئی تھی امیر حمزہ کی حرکت پر۔ اسے جگنو پر بے طرح ترس آیا تھا

''نو......'' حور کی خالد کو تنبیہہ۔ ''تم گاڑی نہیں روکو گے خالد! ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے، وہاں میر کی ممی کی حالت نازک ہے اور یہاں یہ اسٹوپڈ میلوڈرامہ کرنے نکل آئی۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے حور! یا پھر تم ہو ہی اس قدر سنگ دل۔ ایٹ لیسٹ میں جگنو کی بات سنے بغیر نہیں جاؤں گا۔ وہ کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں ہے۔ پروفیسر حیدر رحمانی کی بیٹی ہے، وہی پروفیسر جن کے گھر میں ہم اتنے دن سے مہمان تھے، سمجھی۔'' برہان کی سخت انداز اور الفاظ میں گوشمالی کے باوجود امیر حمزہ نے خالد کو ابرو سے چلنے کا اشارہ کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اسپیڈ تیز کرتا، جگنو فاصلہ پاٹتی ان تک پہنچ چکی تھی اور اب وہ امیر حمزہ کی سائڈ سے اس کے جیپ کے دروازے کو تھام چکی تھی۔

''امیر حمزہ...... امیر حمزہ...... آپ ایسے کیسے جا رہے ہیں۔ مجھے بے خبر رکھ کر۔ پلیز...... پلیز...... گاڑی روکیں۔ ایک دفعہ میری بات سن لیں۔ پلیز......'' وہ ہلکی رینگتی جیپ کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ امیر حمزہ نے اس کی التجا پر قطعاً کان نہیں دھرا تھا۔ یوں ہی بے نیاز بنا بیٹھا رہا جیسے وہ تو کسی اور سے مخاطب تھی۔

''آپ کو اللہ کا واسطہ ہے امیر حمزہ۔ مجھے کس جرم کی سزا دیے کے چلے ہیں۔ اس طرح مت جائیں۔'' وہ بلک اٹھی تھی۔ جیپ کے دروازے کو تھامے۔ نیم لنگڑاہٹ کے ساتھ دوڑتی وہ برہان کے اعصاب کا کڑا امتحان بن گئی۔ وہ ضبط نہیں کر پایا تو چیخ پڑا۔

''میر اس کی بات سنو۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ روکو خالد! جیپ کو روکو۔ میر! بات سنو اس کی۔''

''مجھے اس کی بات سننے میں کوئی انٹرسٹ نہیں، سمجھے۔ یہ تو پاگل ہے۔ سرِ راہ تماشا بنانے پر تلی ہے۔'' اسی وقت رخ موڑ کر جگنو کی طرف کیا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''اور تم اچھی طرح سن لو۔ مجھے تمہارے جیسی لنگڑی میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔ ذرا سا منہ کیا لگایا، تم گلے کی ہڈی بننے لگی۔'' امیر حمزہ جگنو کے یوں پیچھا لے لینے کی وجہ سے بوکھلا سا گیا تھا۔

''میں مر جاؤں گی امیر حمزہ! اللہ کی قسم میں مر جاؤں گی۔ اس طرح سے مت کریں، ایک بار بات سن لیں۔ تسلی سے...... سکون سے۔'' وہ زار زار روتی بھکارن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال بکھر چکے تھے۔ دوپٹا آدھا کندھے پر تو آدھا پیروں میں رل رہا تھا۔ شدت گریہ سے ناک سے پانی بہہ رہا تھا لیکن امیر حمزہ کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

قانتہ نے جو ابھی ابھی اس کے قریب آئی تھی، اس کے قریب پہنچ کر اسے بازو سے تھام کر اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر جگنو نے بے حد مضبوطی سے جیپ کے دروازے کو جکڑ رکھا تھا۔ قانتہ کو یک دم شدید طیش نے لپیٹ میں لیا۔ وہ انتہائی نفرت کے ساتھ امیر حمزہ سے مخاطب ہوئی۔

''ہم وادی کے لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اپنے مہمان کی کسی کے منہ سے برائی برداشت نہیں کرتے کجا کہ خود اسے برا بھلا کہنا۔ لیکن میں آج یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تم جیسا گھٹیا اور گرا ہوا آدمی وادی میں اب سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ تم انتہائی کمینے اور غاصب ہو۔ جگنو چھوڑو جیپ کا دروازہ۔ چلو واپس۔ تم ناحق خود کو ایک ذلیل شخص کے لیے رسوا کر رہی ہو۔ چلو جگنو...... چلو۔''

حور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان دونوں کو جیپ کے نیچے کچلوا دے۔ اس نے امیر حمزہ کو طیش دلاتے ہوئے کہا۔

''میر! آخر تم کب تک ان دونوں کی بکواس سنو گے۔ آگے کیوں نہیں بڑھواتے جیپ کو۔''

جیسے ہی خالد نے جیپ آگے بڑھائی جگنو ایک جھٹکے سے ڈھلک کر گر پڑی۔ قانتہ بروقت اسے پرے نا گھسیٹ لیتی تو یقیناً وہ جیپ کے نیچے ہوتی۔ وہ جگنو کے گلے لگی گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ ایسی صورتحال کا تو اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ ابھی بھی اسے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے یہ سب اس کی آنکھ کا واہمہ ہے۔ بھلا کوئی کیسے ''اوزے رحمانی'' پر ایسا ظلم ڈھا سکتا ہے۔ اور کیا اوزے رحمانی خود کو اس قدر ارزاں کر سکتی تھی کہ آج اس میں اور کسی بھکارن میں فرق کرنا مشکل تھا۔ وہ اس بدترین وقت میں بھی اس قدر خستہ حال ہوئی تھی کہ اگر حیدر رحمانی اسے اس طرح دیکھ لیتے تو صدمے سے ان کا دل بند ہو جاتا۔ یہ سوچ آتے ہی قانتہ نے جھرجھری سی بھر لی اور جگنو کو اور زور سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

کاش...... کاش کہ وہ امیر حمزہ کے سامنے ہی نا آئی ہوتی۔ کاش کہ امیر حمزہ اسے دیکھ کر ریجھتا نہیں۔ کاش کہ جگنو اسے ٹھکرا دیتی۔ یا کاش کہ یہ لوگ یہاں آئے ہی نا ہوتے۔ بہت سے کاش آنکھوں کا پانی بن کر قانتہ کے ٹھٹھرے رخساروں پر جم گئے۔ اس نے دور ہوتی جیپ کو دیکھا اور تھوک دیا۔

سکتہ زدہ جگنو نیم وا ہونٹوں سے بنجر آنکھیں لیے لمحہ لمحہ امیر حمزہ کو ہمیشہ کے لیے خود سے دور ہوتا دیکھ رہی تھی۔ غصے میں بکتے جھکتے امیر حمزہ نے ایک زہر بھری نگاہ سائڈ ویو مرر سے جگنو پر ڈالی۔ وہ مٹی اور برف میں لتھڑی، بکھرے بالوں والی مخبوط الحواس عورت دکھائی دے رہی تھی۔ بہتی ناک اور گالوں پر

آنسوؤں کی میلی لکیریں۔

''آخ......'' امیر حمزہ کو اسے شدید کراہیت کا احساس ہوا۔ وہ غرور و تکبر کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اسے خود پسندی کی موجیں اس وقت بہت اونچا اٹھائے ہوئے تھیں۔

لیکن ایک شخص تھا جس کی کل کائنات اس پل مٹی اور برف میں لتھڑی پکی پگڈنڈی پر روتے ہوئے سر پٹخ رہی تھی۔ برہان نے بھی سائڈ ویو مرر سے جگنو کے لحہ بہ لحہ دور ہوتے عکس کو دیکھا تھا۔ جیپ نے رفتار پکڑ لی تھی۔ عکس معدوم ہوتا چلا گیا لیکن اس کی بصارت وہیں رہ گئی۔ جوں جوں وہ وادی سے دور ہو رہے تھے اس کا وجود کھوکھلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ وادی کو اپنی روح دان کر آیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

کمرے کی گمبھیر خاموشی میں وقفے وقفے سے ابھرنے والی سسکیوں کی آوازیں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ یہ سسکیاں بابی جان اور حبیبہ کے حلق سے خارج ہو رہی تھیں جبکہ قانتہ غصے اور بے بسی سے پھولتے پچکتے نتھنے لیے، تیوریاں چڑھائے جگنو کے زخمی ہاتھ پر مرہم کا لیپ کر کے پٹی لپیٹ رہی تھی اور ساتھ ساتھ بابی جان اور حبیبہ کو تنبیہی نظروں سے گھور بھی رہی تھی۔ لیکن بابی جان کا خود پر اختیار ہی کب تھا، وہ تو جگنو کے مضروب پیروں کو دیکھ کر ہی چھلنی ہو گئی تھیں۔ نا جانے کتنی ٹھوکریں کھائی تھیں کہ ناخن ٹوٹ گئے تھے اور ان میں سے خون رس رہا تھا۔ جو پاؤں پہلے ہی لاچار تھا اسی کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھاگتی رہی تھی، وہ اس وقت بابی جان کو پہلے سے زیادہ خم کھایا محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں مگر ماں ہی کی طرح پالا تھا، اس کے دل کا درد ان سے چھپا نہیں تھا، جانتی تھیں کہ وہ پردیسی اس کے دل کو گہرا گھاؤ دے کر چلا گیا ہے۔ انہوں نے تو مقدور بھر کوشش کی تھی کہ امیر حمزہ، جگنو کا نصیب بن جائے مگر...... اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کو گرم چادر کے پلو سے خشک کرتی وہ شکوہ کناں انداز میں جگنو سے گویا ہوئیں۔

''اتنا تنگ تو تم نے مجھے کبھی بچپن میں نا کیا تھا میری جان! ایسی بے خودی تمہاری فطرت میں تو نا تھی۔ تم تو اپنی آہ بھی زبان کو دانتوں تلے لے کر دبا لیا کرتی تھیں، تو آج کیسے تم نے گوارہ کیا یوں سر راہ تماشا بننا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میری جگنو ایسا کر سکتی ہے...... بولو میری بچی۔''

جواب میں جگنو کی وہی چپ تھی جو وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اوڑھے ہوئے تھی۔ پتھرائی آنکھیں چوپٹ کھلے دریچے پر جمی تھیں، جہاں سے نظر آتے اونچے پربت برف کی اوٹ میں سے اس پر ہنس رہے تھے۔ وہ ان کو ہنسنے دینا چاہتی تھی، بلکہ وہ ساری کائنات کو دعوت دینا چاہتی تھی کہ آؤ۔ آؤ اور ذرہ ذرہ مجھ پر ہنس لو۔ آؤ اور قطرہ قطرہ مجھ پر ٹھٹھے لگاؤ۔

قانتہ نے پاس رکھے صاف کپڑے سے اپنے مرہم والے ہاتھ پونچھے اور بائیں ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو مسل کر بابی جان سے مخاطب ہوئی۔

''بابی جان۔ اس کو میں دومنٹ میں انسانی جون میں لے آؤں گی۔ آپ فکر نا کریں۔ تب تک تین چار پیالیاں گرم گرم قہوے کی بنا لائیں۔ ذرا دماغوں میں جو سردی جا گھسی ہے نا، اس میں کمی آئے اور عقل کام کرے۔'' اس نے التجائیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ اس کی بات سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اچھا تھا ذرا قانتہ اکیلے میں اسے سمجھاتی۔ انہیں نے حبیبہ کو بھی اٹھایا جو جگنو کے پیروں پر بڑی احتیاط سے مرہم لگا کر فارغ ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر، مرہم پٹی کی ساری چیزیں سمیٹ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

چند لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ قانتہ بھی اسی سمت دیکھنے لگی جدھر جگنو کی نظروں کا ارتکاز تھا۔ آج جو کچھ بھی ہوا تھا اس نے سب کے اعصاب بری طرح متاثر کیے تھے۔ اسے ابھی تک وہ سارا منظر بھلائے نہیں بھول رہا تھا تو جگنو کی کیفیت تو سب سے سوا تھی۔

''میں تم سے کیا کہوں جگنو۔؟ میرے تو سارے الفاظ نے جیسے خودکشی کر ڈالی ہے۔ میں تمہاری اس حرکت پر افسوس کروں یا تمہیں پھٹکاروں، کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ بس اتنا بتا دو کہ آخر کیوں۔ کیوں کیا تم نے یہ سب۔ کیوں تم اس ذلیل شخص کے پیچھے اتنی اندھی ہو گئی کہ پوری سڑک پر کسی پھٹی لیر کی طرح گھسیٹی گئی ہو۔ تم اتنی بے مایا تو نہیں تھیں جگنو۔'' بالآخر قانتہ نے ہی اس جان لیوا خاموشی کی جھیل پر پتھر پھینکا۔ وہ اس سے جو پوچھ رہی تھی اس کا جواب جگنو کو ادھیڑ ڈالتا پر وہ پھر بھی بول پڑی تھی۔

''ہر انسان کی زندگی میں ایک نقطہ ہوتا ہے قانتہ۔ وہ نقطہ اس کی روح کی اکائی ہوتا ہے۔ سب اسے کھوج نہیں پاتے۔ اور جو کھوج لیتے ہیں وہ اسے پا لیتے ہیں۔ لیکن میں وہ کم نصیب ٹھہری جس کی روح کی اکائی تو موجود ہے پر روح نہیں رہی۔ میری روح نکل گئی قانتہ۔ اب اکائی اس نقطے کو گود میں لیے بیٹھی ہے، لیکن وہ اسے کہاں سینچے گی بھلا۔ روح ہی نہیں رہی تو۔'' وہ کیا بول رہی تھی۔ کیا فلسفہ اگل رہی تھی قانتہ کو خاک پلے نہیں پڑا تھا مگر وہ جگنو کی ان باتوں سے شدید خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس کے بے انتہا سفید چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر چند خراشیں آ چکی تھیں۔ اس نے بے چین ہو کر اس کا گھٹنا زور سے ہلایا۔ جگنو نے جیسے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ قانتہ کے منہ سے اٹک اٹک کر اگلا جملہ برآمد ہوا۔

''مجھے الجھاؤ نہیں جگنو! میں جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب گتھیوں کی صورت میں نا دو۔ میں نے تو آج جو جگنو دیکھی اس کے اندر عزت نفس کو زنجیروں میں جکڑا دیکھا۔ کیوں تم نے اسے آزاد نہیں چھوڑا جگنو۔ کیوں تم نے اس کی پکار نہیں سنی۔ بولو۔؟''

''میں وہی تو لینے بھاگی تھی پاگل۔'' وہ بے حد زور سے چلاتے ہوئے بولی۔ قانتہ بے اختیار تھوڑا پرے ہوئی۔ ''وہ میری عزت نفس پہلے دن سے غصب کر بیٹھا تھا۔ اس نے اسے مجھ میں سے کشید کر لیا تھا، تبھی تو میں وہ نہیں رہی جو میں تھی اور جو میں بن گئی وہ اسی لیے کہ میرے اندر اس نے کچھ چھوڑا ہی نہیں قانتہ! کیا میری انا اور عزت نفس میری جھولی میں ہوتیں تو میں بھری جھولی لیے کسی لٹیرے کی منتیں کرتی؟ میری جھولی میں سو چھید ہوئے قانتہ۔ سب گر گیا۔ سب چلا گیا۔ میں اس سے اپنی انا اور خودداری واپس مانگنے بھاگی تھی۔ بھلا اب اس کے کس کام کی۔ مجھے لوٹا دیتا۔ میں زندہ تو رہ پاتی۔ اب مجھے مرنا پڑے گا قانتہ۔ اب میری جھولی خالی ہے۔ اس سے پہلے کہ میرے چھید زمانے کی نظروں میں آ جائیں، مجھے مرنا چاہیے۔'' وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی، قانتہ کو یقین ہو گیا تھا۔ وہ اسے ٹوک بھی نہیں پا رہی تھی۔ ''بھلا میری متاع مجھے لوٹا جاتا۔ میرے مرنے نے اسے کیا سکھ دے دینا ہے۔ ساری عمر کیسے سنبھالے رہے گا وہ۔ یہ چیزیں بڑی بھاری پڑتی ہیں اگر اپنی نا ہوں تو۔ میری عزت نفس کو پلڑے میں ڈالے گا تو اس کی ہستی بھاپ بن کر تحلیل ہو جائے گی۔ بڑی غلطی کی اس نے۔ تم فکر نہیں کرو قانتہ۔ یہ دنیا انہی چکروں میں چکر کھاتی رہے گی۔ گھبرانا نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا سب۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پتا نہیں اس نے خود کو تسلی دی تھی یا قانتہ کو۔ پر قانتہ کا ضبط ٹوٹ گیا تھا، وہ پھپک پھپک کر رو دی۔ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے نیچے بیٹھ کر اپنا سر جگنو کی گود میں رکھ دیا اور دونوں بازوؤں سے اس کی ٹانگوں کے گرد حلقہ بنا کر انہیں جکڑ لیا۔ بچوں کی طرح روتی ہوئی قانتہ کا سر سہلاتے ہوئے جگنو خالی اور ویران آنکھوں سے سیاہ پربتوں کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ بھی اپنی ذات میں ایسا ہی بلند پربت تھی جسے کوئی سر نا کر سکا تھا اور آج وہ ریزہ ریزہ بیٹھی اپنی تسخیر کی داستانِ الم رقم کر رہی تھی۔

☆☆☆

شام ڈھلتے ہی وادی کو دبیز دھند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ قانتہ نے بڑی مشکل سے جگنو کا لباس تبدیل کروا کر اسے زبردستی دودھ کے ساتھ نیند کی گولی دی تھی۔ اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو وقتی ہی سہی، نیند کی اشد ضرورت تھی۔ حیدر رحمانی کی اسٹڈی ٹیبل کے دراز میں یہ دوا ہر وقت موجود رہتی تھی، قانتہ وہیں سے اٹھا لائی تھی۔ وہ آرام کرسی پر

تب تک بیٹھی رہی جب تک کہ جگنو گہری نیند میں نہیں چلی گئی تھی۔اس کے بعد وہ دھیرے سے اٹھی اور جگنو کا لحاف ٹھیک کرنے کے بعد سائیڈ لیمپ کے شیڈ پر پاس پڑی کتاب رکھ کر اس کی روشنی کو مدھم کیا۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی وقت جگنو کی آنکھ کھلے اور کمرے میں مکمل اندھیرا ہو۔ایک گہری تاسف آمیز نگاہ جگنو کے ستے ہوئے چہرے پر ڈال کر وہ دبے قدموں چلتی کمرے سے باہر چلی گئی۔اور اس کے جاتے ہی ایک جھٹکے سے جگنو نے آنکھیں کھولیں تھیں۔دو گرم گرم آنسو کنارے پھلانگتے باہر کو لپکے اور کنپٹیوں سے ہوتے بالوں میں کھو گئے۔

''آہ بابا'' اس نے دکھ سے حیدر رحمانی کو پکارا۔''بابا! کاش آپ ابھی نا جاتے۔کاش آپ اس وقت میرے پاس ہوتے۔آپ کے جاتے سے جو میرے دل میں آپ کو روک لینے کی خواہش تھی وہ بے جا نہیں تھی۔یہ حادثہ کہیں کنڈلی مارے بیٹھا میرے لاشعور میں ڈر پیدا کر رہا تھا۔کاش آپ نا جاتے تو آج میں سڑک پہ رلتی ہوئی تماشا نا بنتی۔آج امیر حمزہ کو جرات نا ہوتی میرے ساتھ کھیل کھیل جانے کی۔آ جائیں بابا۔پلیز کہیں سے آ جائیں۔جلدی آئیں۔مجھے لگتا ہے جیسے آپ دیر کر دیں گے اور میں آپ کو کبھی دیکھ نہیں پاؤں گی۔مجھے ایک دفعہ آ کر سینے سے لگائیں اور جی بھر کر رونے دیں۔مجھ پر بڑا کاری وار ہوا ہے بابا۔مجھے پھولوں کے دھوکے میں زہر سے بجھے کانٹوں پہ گھسیٹا گیا ہے بابا۔میرے ہر مسام سے دکھ ابل پڑے ہیں۔آ کے دیکھ جائیں مجھے۔شاید پھر ملاقات ہونا ہو''

اس کی آنکھوں سے ایک تار آنسو جاری تھے۔

یک دم اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑی۔داہنی طرف کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔وہ اٹھ بیٹھی۔سیاہ وول کے لباس میں وہ سر تا پا ماتم زدہ تھی۔کھڑکی سے باہر دھند چکراتی پھر رہی تھی۔اس نے بستر سے پاؤں اتار کر جوتوں میں پھنسائے اور پوری توجہ سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ایک ساعت میں دھند نے گلابی پیرہن اوڑھ کر اس کی کھڑکی پر دستک دی اور پھر اسی پل کھڑکی کی درزوں سے تیزی کے ساتھ گلابی غبار سا اس کے کمرے میں بھرنے لگا۔

بادلوں کی ملکہ کا محل زمین بوس ہوا پڑا تھا۔وہ سر اٹھائے بے یقینی کی کیفیت میں بیٹھی اپنے محل کو دیکھ رہی تھی جو یوں چھٹ کے بکھرا پڑا تھا جیسے کسی نے دھنک کے رکھ دیا ہو۔اس نے وعدے کا سنہری گولا سینت کر راجا کو بلایا تھا۔اسے وہ گولا دکھاتے ہوئے یاد دلایا تھا کہ اب وہ اس کا راجا بنے گا۔راجا نے تکبر سے گردن اونچی کر کے ایک نظر اس سنہری گولے پر ڈالی اور بڑی نخوت سے ایک ہاتھ سے اس کا سرا تھام کر استہزائیہ ملکہ کو دیکھا۔ہوا میں ذرا سا اچھالا اور واپس دنیا میں پھینک دیا۔ملکہ کا دل کٹ کر رہ گیا'اس نے گلابی بادل پر دوزانو بیٹھ کر نیچے جھانکا۔تمام وعدے گرد بن کر اس کی فضا میں بکھر چکے تھے۔زخمی نگاہیں راجا پر جما کر دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے وہ سرا واپس مانگ رہی تھی۔لیکن راجا نے بے نیازی کی حدوں کو چھوتے چٹکی میں مسل کر وہ سرا جیسے جھاڑ دیا۔سنہری گولا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملکہ کی پہنچ سے دور چلا گیا۔وہ ہچکیوں سے رو دی۔گلابی بادل اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے، جیسے اسے دلاسا دینا چاہتے ہوں۔راجا نے ایک بار پھر طیش میں آتے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالی اور آگے بڑھ کر ملکہ کے محل کی فصیل پر کاری ضرب لگائی۔ایک،دو،تین۔لگاتار لگاتا چلا گیا۔وہ بادلوں کے جھرمٹ کو پرو کے بنایا گیا گھروندہ راجا کی خود غرضی کی نذر ہو گیا۔چھٹ گیا۔دھواں دھواں ہو گیا۔

راجا چلا گیا۔ملکہ کو گہری چوٹ دے کر۔تمام عمر کا صدمہ پہنچا کر۔بادلوں کی ملکہ کے گلابی لبادے کو ہجر کی سیلن نے چوری سے کسی سرمئی بادل کی تہ سے نکل کر چاٹنا شروع کر دیا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے گلابی چمکتے بادلوں کے بیچ سے جگہ جگہ گدلے بادلوں نے سر سالیا تھا۔روشن سنہری فضا اچانک سے پژمردہ اور گہری محسوس ہونے لگی تھی۔اسی اثنا میں بادلوں کو

چیرتا ہوا گہرا سرمئی رتھ ملکہ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔وہ سہم کے اس رتھ کو دیکھنے لگی۔ملکہ نے اس رتھ کو بغور دیکھا،وہ خالی نہیں تھا۔ایک نہایت حسین و جمیل عورت اس میں بڑی شان سے براجمان ملکہ کو بے حد نرمی اور محبت سے دیکھ رہی تھی۔اس کے سفید لباس پر سونے اور چاندی کے ستارے ٹنکے تھے جن کی ذرا سی جھلملاہٹ کے ساتھ ایسے کئی ستارے دنیا میں بارش کے قطروں کی صورت ٹپک پڑتے۔ملکہ ساکت و صامت اس پری پیکر کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔معاً اس عورت نے تھوڑا سا آگے کو جھک کر ملکہ کو پکارا۔

''میرے ساتھ آؤ۔میں تمہاری ماں ہوں۔تمہیں اب میرے پاس رہنا ہے۔آؤ میرے ساتھ۔آؤ۔''

اس کی آواز میں ایسا الوہی سا تاثر تھا، ایسی چاشنی تھی کہ بادل جھوم جھوم کر اسے ٹہوکے دینے لگے۔ملکہ نے اپنا سیلن زدہ لبادہ سمیٹا اور میکانکی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔اس حسین عورت نے اپنے گھیردار لباس کو زور سے جھٹکا تو کئی ستارے ٹوٹ کر روش کی مانند بکھر گئے۔

''ان ستاروں کے تعاقب میں چلتی چلی آؤ پیاری۔تمہیں آخری سرے پر میں محو انتظار ملوں گی۔دیر مت کرنا۔ان کے بجھنے سے پہلے راہ کھوج لینا ورنہ منزل کھو دو گی۔''

وہ عورت اتنا کہہ کر ایک دل آویز مسکراہٹ اچھالتی اپنا رتھ آگے بڑھا لے گئی۔بادلوں کی ملکہ نے بہت بے چین ہو کر ان ٹوٹے تاروں کو دیکھا جن کی ٹمٹماہٹ ابھی آنکھیں خیرہ کرتی تھی اور رتھ کے تعاقب میں پہلا قدم اٹھا دیا۔

☆☆☆

رات بے حد سرد اور تاریک تھی'تارے تک کہرے کے لبادے میں منہ چھپائے پڑے تھے'گیدڑوں کی بھکاری آوازیں بے حد قریب محسوس ہو رہی تھیں'پر اس کے پیر تھمے نہیں تھے،وہ بے خودی آگے بڑھتی جا رہی تھی'اس کے ہر احساس پہ اس وقت بے حسی غالب تھی'سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں اس کے بے کل پیروں سے لپٹی گھسٹتی جا رہی تھیں،جیسے اس کے پاؤں پڑ کے اسے انتہائی قدم اٹھانے سے روک لینا چاہتی ہوں'سرد ہوائیں اس کے لباس کو چیرتی ہوئی سرسرا رہی تھیں لیکن وہ وول کے سیاہ لباس میں،ہلکی سی سیاہ شال اوڑھے ٹھنڈ سے یوں بے نیاز تھی جیسے قبر میں پڑنے والا مردہ'دو قدرے بڑے سائز کی چمگادڑیں اس کے سر کے بالکل اوپر سے ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی گزریں تھیں یوں کہ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو اس کی یخ پیشانی نے محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

ملکہ نے تیز روی سے رتھ کا تعاقب کرنا چاہا تھا۔نتیجے میں اپنے ہی لباس کی گھیردار جھالر میں پاؤں اٹک گیا۔وہ منہ کے بل لہراتی ہوئی کسی گداز بادل کی تہہ میں اتر گئی۔بڑی دقتوں سے اپنے آپ کو باہر گھسیٹا۔پورے قد سے کھڑی ہوئی تو دیکھا ستاروں کا جھرمٹ کافی فاصلے پر جا چکا تھا۔وہ لمبا کر اس کے پیچھے لپکی ورنہ گمراہ ہو جاتی۔بھلا اب رتھ کے پیچھے بھی نا جاتی تو کہاں جاتی۔اپنا مسکن تو وہ چھوڑ آئی تھی۔وہ بیچ راہ میں ٹھہر جاتی تو پرائے بادل اسے ہرگز پناہ نا دیتے۔اس رتھ میں اس کی ماں سوار تھی۔وہ اسے اپنے پیچھے چلے آنے کا کہہ گئی تھی تو اب وہی اس کی جائے پناہ تھی۔ملکہ نے اپنے قدموں کی رفتار کو تیز تر کیا اور ستاروں کے پیچھے ہو لی۔اس سے پہلے کہ وہ کھو جاتے۔

جوں جوں رتھ قریب آتا گیا اس کے چہرے کے تاثرات پرسکون ہوتے چلے گئے۔وہ بے حد خوب صورت تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ ویران اور بے رونق تھا۔وہ اپنے محور سے نکل آئی تھی۔یہ جگہ اس کے لیے انجان تھی مگر آگے رتھ میں اس کی ماں تھی،اسی کے بھروسے وہ بادلوں کو بھول ستاروں میں کھونے چلی تھی۔

☆☆☆

اونچے نیچے راستے سے ہوتی وہ قدم بہ قدم اس کھائی کی جانب بڑھ رہی تھی جس کے عین سرے پہ وہ زندگی کے مفہوم سے آشنا ہوئی تھی' اور اب وہیں پر موت ہاتھ باندھے اسے اپنے اسرار سے آشنا کروانے کے لیے کھڑی تھی' وہ پہنچ چکی تھی، بے دم، بے روح سی کیفیت میں' وہ ہرگز بھی حواسوں میں نہیں لگتی تھی، یوں جیسے ایک ٹرانس کی کیفیت طاری تھی اس پر، جس کے زیر اثر وہ یہاں تک چلی آئی تھی۔ کھائی کے کنارے کھڑی وہ کسی ادھ جلی چتا کی طرح دکھائی دے رہی تھی، جس کا انتم سنسکار کرنے کے بعد اس کی راکھ اڑائی جانے والی تھی۔

☆☆☆

اس کے ہاتھ ایک روشن ٹمٹماتا ستارہ آ گیا تھا۔ سرخوشی کے عالم میں اس نے دونوں ہتھیلیوں کی اوک میں تھام کر سینے میں بھینچ لیا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ستارہ راکھ بن چکا تھا۔ سرمئی راکھ۔ اس نے سہم کر اسے ہتھیلی سے جھاڑا اور جھٹ سے چند قدم دور بادل میں اٹکے ایک اور ستارے کو چھوا، ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی وہ بھی یوں تحلیل ہو گیا جیسے بھاپ کا بنا ہو۔ وہ دکھ کی شدت سے بلک اٹھی۔ اسی اثنا میں اسے رتھ دکھائی دیا مگر اب وہ بالکل خالی تھا۔ وہ پری پیکر اس میں نہیں تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی اس کے قریب چلی آئی۔ وہ عورت ایک مخصوص فاصلے سے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلا رہی تھی۔ یکا یک اس کے بے جان ہوتے وجود میں جان سی پڑ گئی۔ وہ اس عورت کی جانب یوں لپکی جیسے ذرا سی دیر کرنے پر وہ پھر سے کہیں کھو جائے گی۔ اس عورت کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہاں رنگین بادلوں سے بنا ایک نرم و گداز تخت ہوا کے دوش پر معلق تھا۔ ایک ممتا بھری مسکان چہرے پر سجائے اس عورت نے اپنے بازو وا کیے۔ وہ جھر جھر بہتی آنکھوں کے ساتھ اپنی پیاسی روح کو سیراب کرنے کے لیے دونوں بازو پھیلائے، اس عورت کے سینے میں سمانے کے لیے دیوانہ وار بھاگی۔ پر اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماں کا لمس پاتی، یکا یک کسی ہیولے کی مانند وہ فضا میں اونچا اٹھنے لگی۔ بادلوں کی وہ معصوم ملکہ حیرت سے گنگ یہ منظر دیکھتی چلی گئی۔ ہیولا فضا میں تیرتا اس کے عقب میں لہرایا۔ ملکہ اپنے بانہیں معلق کیے ایڑی کے بل گھومی۔ اس کی کٹی پھٹی کھال والی ایڑیوں نے بادل کو چیر دیا۔ اور پھر۔ ایک جھٹکے سے وہ یوں نیچے گہرائی میں اترتی چلی گئی جیسے گلے میں پھندا ڈالے پھانسی کے منتظر کے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا گیا ہو۔ ہیولا تیزی سے دائیں بائیں چکرانے لگا۔ گرتے سے بادلوں کی معصوم ملکہ کی حسرت زدہ آنکھوں کا پانی کسی بادل پر چھلک گیا تھا۔ گھن گرج کے ساتھ تمام بادلوں نے بین ڈالنا شروع کیا۔ مغموم سا وہ ہیولا بھی دھیرے سے کسی بادل میں مدغم ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

نیم وا سفید ہونٹ، زرد چہرہ، بنجر آنکھیں اور سیاہ لباس' وہ سچ میں زندہ چنوائی گئی لاش کا پنجر تھی' معاً اس کی نگاہوں میں کوئی احساس جاگا تھا، اس نے دھیرے سے اپنے سن ہوتے دماغ کو ہوش کی طنابیں تھامتے محسوس کیا' اس مقام کو وہ بھلا کیسے بھول سکتی تھی، اس کی ان کہی داستاں کی نشانی' اس کی آنکھ کا کونا ذرا سا نم ہوا، اس نے بڑی طاقت صرف کرتے ہوئے دونوں بازو دائیں، بائیں فضا میں معلق کیے' بھینی بھینی سی پراسرار خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اب وہ ایسی کیفیت میں تھی کہ جی چاہ رہا تھا فوراً پلٹ لے یا کبھی نا پلٹے' اس کی تقدیر نے کبھی نا پلٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ کھائی کے کنارے اُگے فلک بوس درخت پہ بیٹھا الو یک دم اپنی جگہ سے اڑا اور تیزی سے جھپٹنے والے انداز میں اس کی طرف آیا تھا' اس کے پروں کی تیز اور زوردار پھڑپھڑاہٹ پہ اس نے سراسیمگی سے آنکھیں پوری کھول کر چہرہ اونچا کر کے آواز کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ ذرا سا رخ موڑ کر خود کو کھائی کی مخالف سمت کیا' بازو ابھی بھی معلق تھے۔ الو تیزی سے اس کی جانب آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے پنجے، اس کے چہرے کو

نوچتے ہوئے گزر جاتے، وہ ایک قدم پیچھے ہوئی اور دونوں بازو یوں ہی اٹھائے وہ کسی بے جان پتلے کی طرح الٹ گئی' الو ایک جھٹکے سے واپس آسمان کی طرف رخ کر گیا' کھائی نے تفاخر سے اپنے پیٹ کے بھرے جانے پر ایک دلدوز گونج کی صورت نعرہ مارا تھا' وہ کھائی ایک زندہ وجود نگل گئی اوزئے رحمانی اپنی کہانی سمیت اندھی کھائی کی نذر ہو گئی' صبح ساری وادی میں یہ خبر پھیل گئی کہ اوزئے رحمانی نے خودکشی کر لی۔

کھائی کے کنارے اُگے اس فلک بوس درخت کی شاخ پہ بیٹھے الو نے یہ "انسانی خبر" سنی تھی اور گول گول آنکھیں گھماتے "دن کے اندھے" نے نیچے کھائی کے اندھیرے میں اوزئے رحمانی کی لاش کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی، پر شب کی تاریکی میں ظلم ڈھانے والے دن کے اجالے میں یوں آنکھیں پھوڑے لیتے ہیں جیسے کسی بربریت سے ان کا کبھی واسطہ نا رہا ہو۔

☆☆☆

وہ رات بڑی سفاک تھی جس کی سحر کے منہ کو بھی خون لگا تھا جیسے۔

"رحمانی ولا" کے کواڑ چوپٹ کھلے تھے، اجالا ہو جانے کے باوجود گھر کی تمام لائیٹس روشن تھیں۔ سارے ماحول پر سراسیمگی کا غبار چھایا تھا۔ ہال کمرے کی فرشی نشستوں پر قریبی گھروں سے آئے کچھ لوگ بیٹھے چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ قانتہ نے ایک ذرا جھانک کر جائزہ لیا اور پردے برابر کر دیئے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر اس قدر سوج چکی تھیں کہ کھول کر رکھنا محال ہوا جا رہا تھا۔ وہ ست روی سے چلتی بابی جان کے کمرے میں چلی آئی، جہاں انہیں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوئے پانچ گھنٹے سے زائد کا وقت بیت چکا تھا۔ ان کی پائنتی سے جڑی بیٹھی حبیبہ ابھی بھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ قانتہ بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ حبیبہ نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ قانتہ نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں بھرا اور التجائیہ لہجے میں حبیبہ سے مخاطب ہوئی۔

"دیکھو حبیبہ! اب تم بھی بہت سا رو چکی اور میں بھی۔ بابی جان رونے کے قابل نہیں رہیں۔ حیدر انکل کو کال کی جا چکی ہے، وہ بھی پہنچ جائیں گے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ابھی تم سے کچھ نا پوچھوں، تم رونا چاہتی ہو۔ میں نے تمہیں بہت زیادہ وقت دیا ہے۔ خدا کے لیے اب تو مجھے بتاؤ کہ رات آخر کیا ہوا تھا۔ جگنو نے خودکشی کیوں کر لی۔ تم لوگ کہاں تھے؟" وہ ایک ہی سانس میں سوالات کی قطار کھڑی کر کے ہانپ گئی۔ ساتھ ہی آنسوؤں کی لمبی لکیر آنکھ سے نکل کر ٹھوڑی سے ٹپک ٹپک کر گود میں رکھے ہاتھوں پر گرنے لگی۔ یک دم حبیبہ اس کے پیر پکڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے کچھ پتا نہیں آیاس۔ (مقامی زبان میں بہن کو کہتے ہیں) میں تو سو رہی تھی جب ایک دم بابی جان گرتی پڑتی مجھے اٹھانے آئیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ مجھے بولیں کہ "اٹھو حبیبہ۔ جلدی اٹھو۔ جگنو کمرے میں نہیں ہے، بلکہ وہ کہیں نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میری بچی پتا نہیں کہاں گئی۔" میں جلدی سے اٹھی اور ان کے ساتھ ایک بار پھر سارا گھر چھان مارا مگر جگنو آیاس کہیں نہیں تھی۔ گیٹ کھلا دیکھ کر بابی جان میرا ہاتھ پکڑ کر باہر ڈھونڈنے چل پڑیں لیکن عین اسی لمحے برف پر سے ان کا پاؤں پھسلا اور وہ سر کے بل جا گریں۔ بڑی مشقت سے میں انہیں کچھ گھسیٹ کر اور کچھ سہارے سے اٹھا کر اندر لائی تو وہ مچل اٹھیں اور میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں کہ میں باہر جا کر ان کی جگنو کو دیکھوں۔ کیسے بھی ہو ڈھونڈ لاؤں۔ ان کی حالت دیکھ کر۔ میں بڑی ہمت کر کے باہر آئی مگر۔ مگر۔ مجھے معاف کر دیں آیاس۔ میں ڈر گئی۔ باہر اتنی دھند اور تاریکی تھی کہ میں مارے خوف کے گیٹ بھی نا پھلانگ سکی اور واپس آ گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے بابی جان سے آ کر کہہ دیا کہ میں ہر جگہ تلاش کر آئی مگر جگنو آیاس کا کہیں پتا نہیں چلا۔ بس تب سے بابی جان روتے روتے بے ہوش ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ہوش آتا بھی تو دوبارہ رونے لگتیں اور غنودگی میں چلی جاتیں۔۔ میں نے

بڑی مشکل سے رات کاٹی تھی، جیسے ہی پو پھٹی میں فوراً آپ کو بلا لائی۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں باہر نہیں جا سکی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے بابی جان سے جھوٹ بول دیا۔'' جبیبہ اپنے دونوں جڑے ہاتھوں پر پیشانی ٹکا کر رونے لگی۔ قانتہ نے خود کو دکھ کی انتہا پر محسوس کیا۔ وہ شکوہ کرتی بڑی بے بسی سے بولی۔

''جبیبہ۔ بس ''اتنا سا'' نا کہو۔ اتنے سے میں نا جانے جگنو پر کیا بیت گئی۔ اتنے سے میں نا جانے وہ بچا لی جاتی۔ اتنے سے میں ''حیدر ولا'' برباد ہو گیا جبیبہ۔ اتنا سا نا کہو۔''

جبیبہ کا رونا چیخوں میں بدل گیا۔ وہ بابی جان کے بیڈ کی پائنتی سے سر ٹکرانے لگی۔ قانتہ نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے تو اپنے آپ کو دلاسا دینے کے لیے کوئی چاہیے تھا۔

علاقے کے مرد، جن میں قانتہ کے بھائی اور باپ بھی شامل تھے، صبح سے کھائی کے پاس تھے۔ اسی کوشش میں کہ شاید کوئی نشان مل جائے جگنو کے زندہ ہونے کا۔ لیکن یہ ناممکن تھا کیونکہ کھائی اس قدر گہری تھی اور اس کی گہرائی میں درختوں کی اتنی بہتات تھی کہ ممکن ہی نا تھا کہ وہاں گرنے والا زندہ بچا ہو اور مرے ہوئے کی لاش ہی مل جائے اور جگنو وہاں کودی ہے، اس کا سب سے بڑا ثبوت اس کھائی کے کنارے اگے درخت کے تنے سے اٹکی اس کی شال۔ جو نا جانے کیسے گرتے ہوئے وہیں رہ گئی ہوگی۔ لوگ اسے خودکشی ہی قرار دے رہے تھے۔ مگر قانتہ کا دل نہیں مانتا تھا کہ جگنو نے اپنی جان کھائی میں کود کر خود لی ہے۔

ان ہی لایعنی سوچوں میں قانتہ اندر باہر کے چکر کاٹتی ''حیدر رحمانی'' کی منتظر تھی۔

دوسرے پہر نے جب تیسرے پہر پر دستک دی تو باہر گاڑی رکنے کی آواز نے قانتہ کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ ''کیا بیتے گی حیدر انکل پر۔ کیسے سہیں گے وہ یہ صدمہ؟''

ان کے پیچھے جو سانحہ رونما ہو چکا تھا اس کے نتائج دیکھنے کے لیے قانتہ جگنو کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ بابی جان کے کمرے میں جلدی سے جھانکا تو وہ جائے نماز پر سجدے میں گری گریہ وزاری سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ جبیبہ خود بھی روتے ہوئے ان کی پیٹھ سہلا رہی تھی! قانتہ فی الوقت ان کو روتا چھوڑ کر فوراً باہر بھاگی۔ اس کے بابا اور ایک دو مقامی افراد ''حیدر رحمانی'' کو گھیرے کھڑے تھے۔ ان کے نرغے میں ''حیدر رحمانی'' اڑی رنگت اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ یوں کھڑے تھے جیسے کوئی ننھا بچہ، بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ قانتہ نے تاسف سے آنکھیں بھینچ لیں یقیناً ''حیدر رحمانی'' کو بتا دیا گیا تھا۔ ان کے چہرے کے عضلات کا تناؤ ان کی حالت ظاہر کر رہا تھا۔ قانتہ نے واپس پلٹنا چاہا مگر عین اسی وقت ''حیدر رحمانی'' نے اسے دیکھ لیا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آئے۔

''قانتہ بچے ...... یہ ...... یہ کیا بول رہے ہیں بیٹا! کیسا مذاق ہے یہ ...... کدھر ہے میری جگنو! بھلا ایسے بھی مر سکتی ہے وہ۔ مجھے بتاؤ بچے، کدھر ہے وہ۔ میں سفر سے آیا ہوں، ان لوگوں کو کچھ تو میرا احساس ہونا چاہیے تھا۔ کسی کی اولاد کو لے کر ایسا مذاق کرتا ہے کوئی۔ حد ہے ویسے۔ تم بتاؤ بچے۔ کدھر ہے جگنو ...... اور ...... اور باقی سب کہاں ہیں۔ برہان بیٹا! امیر حمزہ اور وہ بچی حور ...... بولو بچے ...... یہ سب کیا ہے؟'' ان کا سانس صدمے کے زیر اثر چھوٹا ہو رہا تھا۔ وہ جس حقیقت کو جھٹلا رہے تھے، اس کا قانتہ نے جھکے سر کے ساتھ آنسوؤں کی جھڑی میں اقرار کیا۔

''جگنو نے کھائی میں چھلانگ لگا دی انکل! وہ ...... وہ مر گئی ...... کل رات کی مر گئی۔''

ایک عرصہ پہلے جب مدیحہ رحمانی مری تھی، اس وقت اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس ہاتھ کی بے بس پکڑ آج بھی ان کا دل جکڑتی تھی۔ لیکن اس سمے انہیں اپنا دل کٹ کٹ کر ٹکڑوں میں بٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ تیزی سے واپس گیٹ عبور کرتے، ان کا رخ اس کھائی کی جانب تھا، جہاں ابھی بھی کافی افراد جمع تھے۔ حیدر رحمانی کو آتا دیکھ کر سب چھٹ گئے۔

کھائی کے کنارے پیروں کے بل بیٹھ کر انہیں نے کھائی کی وسیع گہرائی میں نظر دوڑائی۔ ایک بار، دوبار، بار بار۔ ان کے بے تاثر چہرے پر آنکھوں سے آنسو یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے جیسے غم نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر چشمہ جاری کر دیا ہو۔

''اوزئے ئے ئے ے۔'' ایک طویل پکار ان کے حلق سے نکلی اور گونج کی صورت واپس پلٹ آئی۔ بس پھر وہ نہیں رکے۔ مسلسل جگنو کو پکارے جاتے تھے، پکارے جاتے تھے۔ ''اوزئے بیٹا! آواز دو مجھے، میں تمہارا ابابا ...... مجھے آواز دو میری بچی ...... کہاں ہو تم ...... میں تمہیں نکال لوں وہاں سے۔ مجھے آواز دو میری جان! دیکھو ...... دیکھو ...... میری بات سنو۔ میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔ میری سانسیں بھاری ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں ہوش کھو دوں، مجھے پکار لو اوزئے! تم وہیں کہیں ہو ...... وہیں کہیں ...... یہ بات مجھے مرنے بھی نہیں دے گی میری بچی! مجھے آواز دو اوزئے۔ میں مر جاؤں گا اوزئے ...... میں تمہارے لیے ہی تو جیا ہوں اب تلک لیکن میں تمہارے بنا نہیں جی پاؤں گا میری جان! پکار وا اپنے بابا کو اوزئے۔''

ان کا حلق بیٹھ گیا چیخ کر، چلا کر، بلک کر۔ ہر طرح سے انہوں نے اپنی لخت جگر کو پکارا۔ پر وہاں صرف دبیز گہرائی تھی اور کچھ نہیں۔ وہ درخت کے تنے سے سر ٹکرانے لگے۔ پتھروں پر مار کر پیشانی پھوڑ لی۔ ارد گرد کھڑے نفوس انہیں قابو کرنے میں ناکام ہوئے جا رہے تھے۔ ان کا درد سب ہی کو محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں دونوں بازوؤں میں جکڑ کر قانتہ کے بھائی نے زبردستی بڑے پتھر پر بٹھایا۔ وہ اس پتھر سے لپٹ لپٹ کر روئے۔ یہ وہی پتھر تھا جہاں ان کی جگنو بیٹھا کرتی تھی۔۔ یہ وہی پتھر تھا جس پر اس نے اپنا نام کندہ کر رکھا تھا۔ وہ اس نام کو چوم چوم بے حال ہوئے۔ ان کی آنکھیں چڑھیں۔ وہ فضا میں یوں دیکھنے لگے جیسے کسی نے ان کے چہرے کو زبردستی جکڑ کر اوپر کر رکھا ہو۔ ان کے گال پھڑکنے لگے۔ ہونٹ ٹیڑھے ہوئے۔ رال بہی اور وہ بے جان سے ایک جانب لڑھک گئے۔

''سر مقتل جو کبھی اے قاتل تیرا گزر ہو
چپکے سے پونچھ لینا، آنکھ جو ذرا نم ہو
میں ملوں گی تجھے ادھوری داستاں کی طرح
پیاسا بادل، دھندلی راکھ، ٹوٹا ہوا تارا ہو

☆☆☆

''ڈیڑھ سال بعد (سڈنی) آسٹریلیا ......

ساحل سمندر پر ڈوبتا سورج اپنی تپش بجھانے کو بے تاب تھا۔ دور، بہت دور لہریں اچھل اچھل کر اسے چھونے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔ بظاہر اتنے قریب دکھائی دینے والی چیز درحقیقت کس قدر دور ہوتی ہے، کوئی اس نظارے کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

وہ ہر روز بلاناغہ یہ منظر دیکھنے کے لیے یہاں آ بیٹھتا تھا۔ اس نے ریت پر ٹانگیں لمبی پھیلا کر، بازو پیچھے ٹکا کر چہرہ اونچا کیا اور گہرے سانس بھرے۔ چند پل یوں ہی بیٹھ رہنے کے بعد وہ یک دم سیدھا ہوا اور جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک پاکٹ سائز ڈائری نکالی۔ یہ شوق بھی اسے آسٹریلیا آنے کے بعد ہوا تھا۔ جب ذہنی خلفشار حد سے زیادہ بڑھ جاتا اور دل دکھ کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگتا تو وہ اپنی اذیت کو لفظوں میں ڈھال کر اس ڈائری پر اتار لیتا تھا۔ ایک عرصہ ہو گیا تھا اسے خود سے جنگ لڑتے۔ اس کے پاس رونے کو بہت سے دکھ تھے۔ لکھنے کو بہت سے ملال تھے۔ اس نے اوپری جیب سے پین کھینچا اور ڈائری کے خالی صفحے سیاہ کرنے لگا۔

''زندگی سے بڑھ کر میں نے بے اعتبار کسی شے کو نہیں پایا۔ یہ وہ حرافہ ہے جس پر آپ جتنی بھی چاہت لٹاؤ، کتنا بھی اپنا بنائے رکھو، اس کی طرف سے دل کو لگا بے وفائی کا دھڑکا نہیں جاتا۔ یہ آخر کار دلبری چھوڑ، کج ادائی پر اتر ہی آتی ہے۔

جینے کے کئی ڈھنگ ہیں، لیکن موت کا وتیرہ کبھی نہیں بدلا۔ مرنا ہمیشہ دل کی بندش سے مشروط ہے اور

اگر غم کلیجہ چبا جائے تو موت کیسے دبوچتی ہے؟

میں نے زندگی میں موت کے اتنے کاری وار دیکھے ہیں کہ مجھے لگتا ہے جیسے اب یہ مجھ پر مسلسل مسلط ہے کیونکہ میں اس کے بہت سے راز جان چکا ہوں بالکل ایسے، جیسے کوئی بڑا مجرم اپنا بھید پانے والے کی سپاری دے دیتا ہے اور موقع پاتے ہی اسے مروا دیتا ہے۔ مجھے اپنے آس پاس ایسے افراد بکثرت دکھائی دیتے ہیں جو بظاہر سانس لیتے، چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے وہ مردہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کا اعتبار ٹوٹ چکا ہوتا ہے، بھرم، مان بھروسا سب دھوکے کی نذر ہو چکے ہوتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ مرنا کوئی جسم پر ہی لازم نہیں۔ مرتا تو اعتبار بھی ہے، دفن تو بھروسا بھی ہوتا ہے۔ مردہ تو ضمیر بھی ہوتا ہے۔ ہر بقا کو فنا ہے اور ہر فنا میں بقا ہے۔ یہ ایک متواتر عمل ہے جو کبھی نہیں رکتا۔ ایک جذبے کی موت دوسرے کی حیات ہے۔

میں نے زندگی میں سب سے زیادہ اعتبار امیر حمزہ پر کیا تھا۔ میر میری زندگی کا وہ خوش رنگ پہلو تھا جس نے میری بدرنگی کو کبھی اجاگر ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ میری ان کہی کو کہہ دکھانے والا میر ہی پہلا شخص تھا۔ لیکن میں غلط تھا، بلکہ ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ غلط تھے۔ جو بونڈنگ ہمیں لگتا تھا کہ ہمارے درمیان ہے وہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کا اصل نہیں جانچ پائے۔ اور پھر ایک مقام ایسا آیا کہ ہماری حقیقت ایک دوسرے پر واضح ہو گئی۔ ہمارا اندر، باہر آ گیا۔ ہم ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے کیونکہ جو سامنے آیا تھا وہ قطعی بھیانک تھا۔

اصل میں مجھے ٹھیک سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جس دن حور نے گھر میں اعلان کیا تھا کہ مجھ جیسے خبطی کے ساتھ ساری عمر برباد نہیں کر سکتی۔ اس کی اس بات نے مجھے زیادہ اذیت دی تھی یا اس کے یہ جتانے نے کہ امیر حمزہ ہی وہ انسان ہے جس کے خواب آج تک وہ دیکھتی آئی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے حور سے جذباتی لگاؤ نا سہی مگر انسیت ضرور تھی۔ میں اس سے ایسے بولڈ اسٹیپ کی امید نہیں کر رہا تھا۔ امید تو مجھے میر سے بھی یہ نہیں تھی کہ وہ ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ مگر میں نے احتجاج میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بڑے بابا خوب بولے۔ حور کو تھپڑ تک دے مارا۔ مجبوراً مجھے بیچ میں آ کر یہ کہنا پڑا کہ حور کا یہ قدم درست ہے، میری اور اس کی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو پائے گی۔ کل کے رونے سے آج رو لینا بہتر ہے۔ بڑے بابا نے ہار تو مان لی مگر انہیں چپ لگ گئی۔ حور اور میر میرے سامنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے منڈلاتے رہتے مگر نا جانے کیوں میرے دل میں رقابت کا جذبہ سر نہیں اٹھاتا تھا بلکہ صرف دکھ منڈلاتا تھا۔ دھوکا دہی کا۔ اوزئے رحمانی کے ساتھ کیے گئے ظلم کا۔ جبکہ ان دونوں کے کسی انداز سے شرمندگی ثابت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے وہ منظر بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ مجھے اوزئے رحمانی بھی نہیں بھولتی تھی۔ اور پھر خبر ملی کہ وہ مر گئی۔ مجھے اچنبھا نہیں ہوا کیونکہ میں نے اسے اسی لمحے مرا ہوا دیکھ لیا تھا جب جیپ کے ساتھ بھاگتے بھاگتے وہ تھک کر گری تھی۔ اس پل اس کا وجود سرد خانے میں پڑی لاش جیسا دکھنے لگا تھا اور تب سے میرے روم روم میں مستقل ایک درد رہنے لگا تھا۔ بڑے بابا کو حیدر انکل کے فالج کی خبر ملی تو پہلی فرصت میں جا کر انہیں اور بابی جان کو یہاں لے آئے۔ حبیبہ بھی ان کے ہمراہ آئی تھی کیونکہ وہ یتیم لڑکی بچپن سے ان کے ساتھ تھی۔ حیدر انکل کو اس حال میں دیکھنا میرے لیے بہت کڑا مرحلہ تھا۔ اس قدر لائق پروفیسر اور کل کے بچے اس کی ناک کے نیچے اسی کے گھر میں نقب لگا کر بیٹھے رہے۔ اپنی سب سے قیمتی متاع، اپنی بیٹی گنوا کر اب حیدر انکل کے پاس لٹانے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ ایک جان تھی جو ہمارے یہاں آنے کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد نکل گئی۔ بابی جان کو پہلے ہی اوزئے کا صدمہ چاٹ چکا تھا، رہی سہی کسر حیدر انکل کی موت نے پوری کر دی۔ بیٹوں سے بڑھ کر محبت اور خیال رکھا تھا انہوں نے بابی جان کا۔ ان کی موت آخری کیل ثابت ہوئی

اور ان کے پیچھے پیچھے بابی جان بھی چل دیں۔ تقدیر نے ان کی بساط کے سب مہرے سمیٹ دیے تھے۔ ہنستا مسکراتا چھوٹا سا گھرانہ ایڈونچر کی نذر ہو گیا۔

بڑے بابا کو حور کی دن بدن بڑھتی ہوئی خودسری نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور کچھ وہ جان چکے تھے کہ امیر حمزہ اور حور، حیدر انکل کے گھرانے کی بربادی کا سبب ہیں۔ وہ دکھ اور صدمے سے گھل رہے تھے۔ میرے مشورے پر انہوں نے حور کی امیر حمزہ کے ساتھ دھوم دھام سے شادی تو کر دی لیکن گھر کے دروازے حور پر بند ہو گئے۔ بڑے بابا کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر میں نے کچھ عرصے کے لیے فیضان بھائی کے پاس آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کیا۔ کاروباری فکریں ساری سب سے پرانے ورکر جی۔ ایم چشتی صاحب کے سپرد کیں اور بڑے بابا کو لے کر یہاں آ گیا۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے میں اور بڑے بابا یہیں ہیں۔ واپس جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ چھ ماہ ہوئے فیضان بھائی نے اپنی کولیگ سے شادی کر لی ہے۔ اچھی مخلص سی لڑکی ہے۔ بڑے بابا سے خوب باتیں کرتی ہے، دل لگائے رکھتی ہے ان کا کیونکہ حور سے قطع تعلقی کر کے جیسے وہ خود کو سزا دے رہے ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ وہ انہیں بے حد یاد آتی ہے۔ چند ماہ پہلے حور نے کال کرنے کے بعد بڑے بابا سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بری طرح رو رہی تھی، بلک رہی تھی لیکن بڑے بابا نے اپنا دل کچل کر اس کی کال بند کر دی تھی۔ ان کے چہرے کی شکستگی مجھ سے چھپی نہیں رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں پونچھتے تھے اور بڑبڑاتے تھے۔

''میری حور خوش نہیں۔ میں جانتا تھا وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کے حصے کی بددعائیں تو آج بھی کسی کھائی میں چکراتی پھرتی ہیں۔ پھر بھلا وہ کس طرح آسودہ رہ سکتی تھی۔''

میں نے بڑے بابا کی پریشانی بھانپ کر بالا ہی بالا حور اور امیر حمزہ کے خانگی معاملات کا پتا کروایا تو معلوم ہوا کہ ان دونوں کی شادی بہت خطرناک موڑ پر کھڑی آخری سانسیں کھینچ رہی ہے۔ امیر حمزہ اسے مارتا تھا اور کمرے میں لاک کر کے آفس جاتا تھا۔ انکل ہمایوں اور اس کی ممی اس معاملے میں خاموش تماشائی کا رول پلے کر رہے تھے۔ وہ بھی اس شادی سے خوش نہیں تھے، شاید وہ اندر ہی اندر چاہتے ہوں کہ یہ بندھن جلد از جلد ٹوٹ جائے۔ ذرائع سے مجھے یہ خبر بھی ملی کہ امیر حمزہ کے بہیمانہ تشدد کی وجہ سے حور کا مس کیرج ہو چکا ہے اور وہ خود ذہنی مریض بنتا جا رہا ہے۔ اسے جیسے اپنی ذات پر بھی بے اعتباری تھی۔ یہ جان کر مجھے حقیقتاً بے حد دکھ اور تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں بے بس تھا۔ صرف بڑے بابا کا دل اس کی طرف سے نرم کرنے کی کوشش کر سکتا تھا تاکہ کل کو اگر حور کی یہ ''نمائشی شادی'' ٹوٹ بھی جاتی ہے تو اسے واپس آنے کے لیے اپنے باپ کے گھر کے دروازے کھلے ملیں۔

کچھ فیصلے جونک بن کر ہماری زندگی سے خوشیاں چوس لیتے ہیں۔ یہ جونکیں جھٹکنے پر بھی جدا نہیں ہوتیں تاوقتیکہ آپ کی سانس بدن سے جدا ہو جائے۔ حور کو اب ساری عمر اپنے فیصلے کا خراج دینا تھا۔ وقت اسے کبھی بھی آئینہ دکھانا نہیں بھولے گا جس میں وہ تمام عمر اپنا خودغرض چہرہ دیکھ کر نگاہ چرایا کرے گی۔

ہم سب کی زندگی میں بیتے وقت کی یادیں بڑی گہری چھاپ چھوڑ گئی ہیں اور اپنا وجود تو مجھے سرتاپا اوزئے کی یادوں کا مرقع لگتا ہے۔ میں جس لمحے ''اوزئے رحمانی'' کا اسیر ہوا، آج بھی اسی میں جیتا ہوں۔ میرے اندر وہ اچانک سے سرایت کر گئی تھی۔ یوں کہ مجھے پھر کبھی دوسراہٹ کی طلب نا رہی۔ میں نے امیر حمزہ پر رشک کیا ہے، جس کے لیے میں نے اوزئے کو بلکتے دیکھا تھا۔ جس گھڑی وہ جیپ کا دروازہ چھوڑ کر پگڈنڈی پر گری تھی، اس پل نے مجھے آج بھی باندھ رکھا ہے۔ سائڈ ویو مرر سے نظر آتا اس کا آخری مضروب عکس ہمیشہ کے لیے میری

افسانہ آفتاب

آتے ہیں جو کام دوسروں کے



بصارتوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔ ہاں۔ واقعی۔ سچی مجھے اوزئے رحمانی سے عشق ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں اس نے خودکشی کی، جبکہ میں جانتا ہوں وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ میں اس کی بے خودی کا گواہ ہوں۔ میں نے جب اسے کھائی میں گرنے سے بچایا تھا، وہ ہوش وخرد سے بے گانہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جس گھڑی وہ کھائی میں گری ہوگی، وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوگی لیکن بدقسمتی سے اس بار میں اس کے قریب نہیں تھا۔ وہ ہراس میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ رکھا ہے جو اس پل ابھرا تھا جب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کھائی میں گرنے لگی ہے۔ تو جس پل وہ گری ہوگی تب اس کے چہرے پر کیسی بے بسی رقم ہوگی۔ شاید اس نے مجھے یاد کیا ہو۔ اپنا ہاتھ بڑھایا ہو مدد کے لیے۔ کسی نوکیلے پتھر کو تھاما ہو مگر وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ یہ سوچ جگر چھلنی کر دینے کو کافی ہے۔ وقت کی طنابیں ہاتھوں سے چھوٹ جائیں تو پچھتاوے کا گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہے اور اوزئے رحمانی میری جان کو بہت سے پچھتاوے لگا گئی تھی۔

سورج کا آخری سرا سمندر میں گم ہونے کو تھا۔ اس نے تھکی تھکی سی سانس رک رک کر خارج کی اور ڈائری بند کر کے پاکٹ میں ڈالی۔ آنکھ کے کنارے پر جمع ہوئی نمی کو انگلی سے جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ریت پر پڑی جیکٹ کو کندھے کی پشت پر ڈالا۔ اسی پل اس کا سیل تھرتھرایا تھا۔ جیکٹ کی پاکٹ سے اس نے سیل فون نکالا، ایک نگاہ اسکرین پر ڈالی۔ مبہم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں سے جھانکا۔ ”قانتہ......“

روزانہ کی دس بارہ کالز قانتہ کے معمول میں تب سے شامل تھیں جب سے وہ حیدر انکل اور بابی جان کو ساتھ لے آیا تھا۔ پہلے وہ کبھی کبھار اس سے بات کر لیتا تھا، یہاں تک کہ آسٹریلیا آنے کے بعد بھی ایک دو بار اس سے بات کی تھی مگر پھر فون پر اس کی لمبی اور گہری خاموشی سے وہ ٹھٹک گیا تھا۔ وہ نہیں بولتی تھی مگر اس کی چپ کو زبان ملنے لگی تھی۔ عجیب لڑکی تھی۔ ایک لفظ کبھی نہیں کہا تھا برہان سے، پھر بھی وہ بے خبر نا تھا۔ اس راہ کی ہی خاک چھانتا وہ کتنا آگے نکل آیا تھا مگر نا جانے کیسی نشانیاں چھوڑ آیا تھا جو یہ سونے جیسے دل کی مخلص لڑکی تعاقب کرتی اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ کوئی پل نا جاتا تھا کہ وہ یہ فاصلہ پاٹ ہی لیتی۔ برہان خوف زدہ تھا، وہ تو ٹنڈ منڈ درخت تھا، اس کے پاس چھایا نہیں تھی۔ پھر بھلا قانتہ کس آس میں اس کے نیچے بیٹھ کر ستانا چاہتی تھی؟ وہ واپس پلٹ کر دیکھتا تھا تو صرف اوزئے دکھائی دیتی تھی تو قانتہ کو کیسے اس کی بصارت قبول کرتی؟ اس نے بے بسی سے نم آنکھوں کو مسلا۔ ایک گہری نظر آتی جاتی موجوں پر ڈالی اور یہ ایک نگاہ اس پر آگہی کا ایک زنگ آلود در وا کر گئی۔ اس پر زندگی کی ”اصل“ کو کھول گئی۔ یوں جیسے ایک فلیش بیک لاشعور میں اٹکے بہت سے مناظر کو کھینچ کر یادداشت کے پہلے پنے پر چسپاں کر دیتا ہے، ایسے ہی برہان کی روح میں گڑی میخ لہروں کے تلاطم نے اکھاڑ ڈالی تھی۔ مختصر سی زیست کا گہرا فلسفہ اس کے لیے نئی راہ متعین کیے بیٹھا تھا۔

سمندر کی ہر موج اگلی کے تعاقب میں بھاگتی اس میں ضم ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ یہ جانے بغیر کہ ایسی ہی ایک موج فدائی بنی اس کی خاطر مٹ جائے گی لیکن اس سے سمندر کو فرق نہیں پڑتا وہ لہریں اگلتا رہتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کی زندگی میں ان موجوں کی صورت اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس سے محبت کو فرق نہیں پڑتا، وہ مسلسل ہے۔ مسلسل ہے۔ مسلسل ہے۔



''شازمہ تیار تو ہونا، آج تمہاری اپائنٹمنٹ ہے۔ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔'' آذر نے آفس سے آتے ہی کہا تھا۔

''آپ فریش ہو جائیں میں تیار ہوں۔'' شازمہ نے کہا۔ جب آذر فریش ہو کر آیا تو شازمہ چائے کی میز پر اس کی منتظر تھی۔

''اچھا کیا تم نے چائے بنالی میں چائے کے لیے کہنے ہی والا تھا تمہیں، جب تک تمہارے ہاتھوں کی چائے نہ پیوں مزا ہی نہیں آتا مجھے۔'' آذر شازمہ کے خوب صورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ جو پیچ اور بلیو کنٹراسٹ سوٹ میں پیاری لگ رہی تھی۔

''چلو اٹھو بھی۔'' آذر نے چائے کا مگ رکھتے ہوئے کہا۔ آذر گاڑی کی چابی اٹھائے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ شازمہ اس کے پیچھے ہولی۔

''پیشنٹ کا بی پی بے حد ہائی ہے۔ آذر صاحب میں ٹریٹمنٹ تو کر رہی ہوں مگر بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے آپ کی مسز کو کسی بات کی پریشانی ہے کیا۔'' ڈاکٹر نے دوستانہ انداز میں استفسار کیا تو آذر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ڈاکٹر میں کیا کروں میں ہر ممکن کوشش تو کر رہا ہوں، مگر میں بے بس ہوں۔'' آذر نے بھیگی آنکھوں سمیت ڈاکٹر عشرت سے کہا تھا۔

''بیٹا آپ مایوس کیوں ہو رہی ہیں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں، غم اور خوشی دونوں ہماری زیست کا حصہ ہیں۔ خود میرے ساتھ کئی کیسز ہو چکے ہیں۔ تو کیا میں نے جینا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے خود دو بچوں کو کھویا ہے۔ میں نے اللہ پر بھروسا کیا اور دیکھو آج میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ شادی کے بعد عورت کو ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ خوش رہا کرو اور نماز پڑھا کرو۔'' ڈاکٹر عشرت نے شازمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں کوشش کروں گی کہ اپنا دھیان دوسرے کاموں میں بٹاؤں۔'' شازمہ نے ڈاکٹر عشرت کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''ساری زندگی پڑی ہے۔ اللہ ہماری اولاد کی بھی آرزو پوری کر دیں گے۔ جب مجھے پرابلم نہیں، میرے گھر والوں کو مسئلہ نہیں تو پھر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو تم۔'' گھر پہنچ کر آذر نے شازمہ کو کاندھے سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا تھا؟ شازمہ نے بھیگی پلکوں سمیت اپنے مخلص ہم سفر کو دیکھا تھا۔

''مجھے ہمہ وقت یہی خوف ستائے رکھتا ہے کہ کہیں آپ دوسری شادی نہ کر لیں۔'' شازمہ نے روتے ہوئے آذر سے کہا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو شازی، کیوں فضول سوچ سوچ کر خود کو خوار کرتی رہتی ہو، کیا تمہیں ایسا لگتا ہے میں تمہارے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں۔ بتاؤں کیا میں اتنا خود غرض انسان ہوں بولو جواب دو۔ آئندہ اگر تم نے ایسی فضول بات مجھ سے کی تو میں تم سے بات کرنا بھی چھوڑ دوں گا میں تو پھر یہی سمجھوں گا نہ کہ تم میری محبت پر شک کرتی ہو۔'' آذر نے خفا ہوتے ہوئے شازمہ سے کہا۔

''آپ کے وجود سے ہی تو مجھے ہمت ملتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم ابھی تک حقیقی خوشیوں سے محروم ہیں۔ آپ کے آفس چلے جانے کے بعد تنہائی مجھے پاگل کر دیتی ہے۔ آذر مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت سے کیوں محروم رکھا ہوا ہے؟'' شازمہ نے دوپٹے سے آنکھوں کو رگڑتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

''تم بالکل ہی پاگل ہو شازی ہماری شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں۔ اور تم بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو۔ صبر کرنا سیکھو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' آذر نے شازمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اب موڈ ٹھیک کرو اور رونا دھونا بند کرو اور کچن میں جا کر میرے لیے اسٹرابری شیک بنا لاؤ۔'' آذر نے شازمہ کا دھیان بٹانے کے لیے کہا تھا۔

آپ سے مجھے بے حد ہمت ملتی ہے آذر'' شازمہ نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''ہوں اور مجھے تم سے'' آذر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

''بھابھی کیا کہا ڈاکٹر نے......'' (نند) رفعت نے چکن کڑاہی بناتی شازمہ سے کہا تھا۔

''وہی جو ہر بار کہتی ہیں کہ دیر اللہ کی طرف سے ہے۔'' شازمہ نے بھیگی مسکراہٹ لبوں پہ سجا کر جواب دیا تھا۔

''ہوں فضول! آپ خود کو خوار کرتی ہیں اور بھائی بھی آپ کی وجہ سے ہر وقت ٹینشن میں رہتے ہیں۔'' رفعت نے رائتے میں ہری چٹنی ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ''زونی کو تو آپ جانتی ہیں نہ میری فرینڈ پانچ سال بعد بیٹا ہوا ہے اسے، کل بتایا اس نے مجھے۔'' رفعت نے رائتہ مکس کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا اللہ مبارک کریں۔'' شازمہ نے سالن کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو اگر فارغ رہنے سے بوریت ہوتی ہے تو میرے بچوں کو پڑھا دیا کریں، آپ کہیں تو میں کل ہی بھیج دوں گی اس سے آپ مصروف بھی ہو جائیں گی اور میرا بھی فائدہ ہو جائے گا۔'' رفعت نے کھیرے کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''گڈ! آپ خوش رہا کریں اور اللہ پہ کامل یقین رکھیں۔ بے شک اللہ نے ہر چیز اور ہر کام ہونے کا ایک وقت متعین کر رکھا ہے۔ جو چیز نہیں اس پہ کڑھ کر کیا فائدہ جو نعمتیں میسر ہیں۔ ان کا شکر ادا کرنا سیکھیں۔'' رفعت نے شازمہ کا حوصلہ بڑھایا۔

''ہوں اللہ نے مجھے ہر نعمت ہر آسائش سے نوازا ہے۔ ایک کمی ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ میں کوشش کروں گی اپنے جذبات پہ قابو رکھ سکوں۔'' شازمہ نے کیبنیٹ سے برتن نکالتے ہوئے کہا۔

''بھابھی ہم باتیں ہی کرتے رہیں گے یا کھانا بھی لگائیں گے، مجھے سچ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ بچوں کے چکر اور یہاں آنے کی جلدی میں ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا میں نے۔'' رفعت نے سلاد بناتے ہوئے کہا تھا۔

''بریانی تو تقریباً تیار ہی ہے۔ کڑاہی بھی بن گئی ہے۔ روٹیاں میں بنا چکی ہوں۔ بس میں لگاتی ہوں کھانا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔'' شازمہ نے بریانی ٹرے میں نکالتے ہوئے کہا۔

اس دوران آذر بھی آفس سے آ گیا تھا اور کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔

''بیٹا تم شازمہ کو آفس کیوں نہیں لے جاتے ہو۔ ماشاء اللہ M.B.A کی ڈگری ہے۔ اس کے پاس، کیوں اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگوا رہے ہو۔ میں اور تم جب گھر پہ نہیں ہوتے ہیں تو بچی سارا دن اکیلی بور ہوتی رہتی ہے۔ ایسے تو یہ بچی ڈپریشن کا شکار ہو جائے گی۔ خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ ہر انسان کے لیے ایک صحت مند مصروفیت ضرور ہونی چاہیے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' شامہ چائے بنانے کچن کی طرف گئی تو افتخار صاحب (سسر) نے آذر سے کہا۔

''ہوں آپ کی بات 100% درست ہے۔ میں بات کروں گا شازمہ سے۔'' آذر نے افتخار صاحب کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

''شازی تم آفس کیوں نہیں جوائن کر لیتی ہو۔'' آذر نے دوسرے روز شام کی چائے پیتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی میں گھر میں ہی ٹھیک ہوں۔ جب سے رفعت کے بچے پڑھنے آنے لگے ہیں۔ کالونی کے بھی کافی سارے بچے پڑھنے آ رہے ہیں۔ اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ ان بچوں کے ساتھ، دل بھی بہل جاتا ہے میرا۔'' شازمہ نے فرنچ ٹوسٹ آذر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''گڈ! تم چاہو تو گھر کے پچھلے حصے کو بھی کوچنگ سینٹر کے طور پر استعمال کر سکتی ہو۔'' آذر نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''واقعی اب تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا ہے۔'' شازمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''خوش رہا کرو، تمہاری مسکراہٹ کتنی خوب صورت ہے۔'' آذر نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''آپ بھی نہ حد کرتے ہیں۔'' شازمہ نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے مشورے پہ ضرور عمل کروں گی۔ آذر میں ان بچوں کو پڑھانا چاہتی ہوں جو وسائل نہ ہونے کی صورت میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے اور شروعات میں اپنے ہی گھر سے کروں گی میں نے ماسی سکینہ اور عارف (ڈرائیور) کو بھی کہہ دیا ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کو بھیج دیا کریں اور بھی جو ضرورت مند بچے ہیں۔ انہیں بھی لے کر آئیں۔ اب میں سوچتی ہوں۔ میں کیوں خود کو ضائع کروں۔ کیوں نہ اپنی تعلیم کو مصرف میں لاؤں اللہ نے مجھے اس قابل بنایا ہے۔ تو اس کے کسی بندے کے کام ہی آ جاؤں۔ کل کو اگر ایک بچہ بھی پڑھ لکھ کر کسی اعلا عہدے پہ فائز ہو جائے گا تو کتنا اجر ملے گا مجھے۔'' شازمہ نے آذر کو اپنا آئندہ کا منصوبہ بتایا۔

''گریٹ! تمہاری طرح تمہاری سوچ بھی کتنی خوب صورت ہے۔ اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں ضرور کامیاب کریں گے اور ہاں اگر میری مدد کی ضرورت پڑی تو میں حاضر خدمت ہوں۔'' آذر نے شازمہ کو سراہا۔

''جی ضرور۔'' شازمہ نے کہتے ہوئے چائے کی ٹرے اٹھائی اور کچن کی جانب چلی گئی اور آذر شازمہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

وقت کی سب سے اچھی خصوصیت تو یہی ہوتی ہے۔ کہ یہ کسی کے لیے رکتا نہیں ہے۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ وقت کا کام گزرنا ہوتا ہے۔ اور یہ گزر ہی جاتا ہے۔ آذر اور شازمہ کی شادی کو سات سال کا عرصہ بیت گیا۔ مگر آج بھی ان کا آنگن سونا تھا۔ اس عرصے میں افتخار صاحب دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر زندگی کی بازی ہار گئے۔ شازمہ کا ٹیوشن سینٹر، کوچنگ سینٹر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آذر نے گھر کے پچھلے حصے کی زمین پر ایک عمارت تعمیر کروا دی تھی۔ اس نے شازمہ کے شوق اور لگن کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا۔ جہاں وہ ہمت ہارنے لگتی وہ اس کی طاقت بن جاتا اور اسے ہمت دیتا۔ شازمہ اپنا گھر اور کوچنگ بخوبی اور بڑی ہی خوش اسلوبی سے چلا رہی تھی۔

''آذر کیوں نہ ہم کسی لاوارث بچے کو گود لے لیں۔ پلیز! میری بات سن لیں۔ میں بے حد مجبور ہو کر آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں اللہ کی ذات سے ناامید تو نہیں ہوں۔ مگر......'' شازمہ نے آذر سے کہا۔

''شازی تم اپنی جگہ بالکل رائٹ ہو مگر بعد میں محرم نامحرم کا بڑا ایشو ہو جاتا ہے۔ بس صرف یہی وجہ ہے جو میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں۔ میں اور تم کتنے ہی بچوں کی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔ وسیلہ تو اللہ نے ہمیں ہی بنایا ہے نہ۔ شاید اگر ہماری اولاد ہوتی تو ہمارا ذہن ہی نہیں جاتا اس طرف مجھے اپنے پروردگار پر پورا بھروسا ہے۔ وہ ہمیں ہماری امیدوں سے زیادہ خوشیاں عطا کرے گا۔ بس تم صبر کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑا کرو۔'' آذر نے شازمہ کو سمجھایا۔

''ہوں بات تو آپ کی بالکل درست ہے۔ مگر میں نے بھی مجبوراً آپ سے کہا۔'' شازمہ نے بھیگی آنکھیں صاف کیں۔

''الحمد للہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ کی ذات پر بھروسا رکھو۔ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ کہ اس کے بندوں میں کتنا صبر و تحمل اور برداشت ہے۔ دعا کیا کرو کہ ہم اللہ کے آگے سرخرو رہیں۔ اور اس کی آزمائش پہ پورا اتریں۔ اللہ اپنے بندوں کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا آئی سمجھ۔'' آذر نے شازمہ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''بے شک۔'' شازمہ نے تائید کی۔

☆☆☆

''باجی یہ ہے میری بہن کا بیٹا۔'' عارف نے بچوں کو پڑھاتی شازمہ سے کہا۔

کچھ دن پہلے ان کے ڈرائیور عارف نے اپنی بیوہ بہن کے بیٹے کا ذکر کیا تھا اس نے شازمہ سے کہا کہ اس کی بہن کا ایک ہی بیٹا ہے پانچ سال عمر ہے اس کی اپنے والد کے انتقال کے بعد بہت بگڑ گیا

ہے۔ وقت پر فیس نہ دینے کی صورت میں اسکول والوں نے بھی اسے نکال دیا ہے۔ عارف نے شازمہ کو درخواست کی تھی کہ وہ اتنے سارے بچوں کو پڑھاتی ہے اس کے بھانجے کو بھی پڑھا دے۔ شازمہ کی رضامندی پہ وہ آج اپنے بھانجے کو لے کر آیا تھا۔

شازمہ نے بغور اس بچے کا جائزہ لیا۔ دبلا، پتلا، سانولی رنگت، آنکھوں میں شرارت لیے وہ بھی بغور شازمہ کو دیکھ رہا تھا۔

''چیکو سلام کرو باجی کو'' عارف نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

''السلام علیکم!'' بچے نے شازمہ پر سلامتی بھیجی۔

''ادھر آؤ بیٹا!'' شازمہ نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

''اب تم جاؤ۔'' شازمہ نے عارف سے کہا۔

''بیٹا کیا نام ہے آپ کا۔'' شازمہ نے پوچھا۔

''سب مجھے چیکو بولتے ہیں۔'' بچے نے جواب دیا۔

''اسکول میں کیا نام تھا تمہارا، جب تم اسکول جاتے تھے۔'' شازمہ نے اس کی گھبراہٹ کم کرنا چاہی۔

''اسکول میں تو جازب تھا میرا نام۔'' چیکو نے نام یاد آ جانے پر خوش ہو کر جواب دیا۔

''گڈ! اتنا پیارا نام ہے تمہارا، اور تم خود بھی بے حد پیارے ہو۔'' شازمہ نے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''اگر تم مجھ سے پڑھو گے نہ تو میں تمہیں اچھی اچھی چیزیں دوں گی، ماروں گی بھی نہیں اور ڈھیر سارے کھلونے بھی دوں گی۔'' شازمہ نے جازب سے کہا۔

''مگر مجھے پڑھنا اچھا نہیں لگتا، مجھے کھیلنا پسند ہے۔'' جازب نے منہ بسورتے ہوئے شازمہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے تھوڑا سا پڑھنے کے بعد میں تمہارے ساتھ کھیلوں گی بھی۔'' شازمہ نے جازب سے کہا۔

''آپ کو پتا ہے اگر میں آئس کریم کھالوں تو میں بہت اچھا پڑھتا ہوں۔'' جازب نے معصومیت سے کہا۔

''گڈ! میں تمہیں روز آئس کریم بھی دوں گی لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا مجھ سے۔'' شازمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر آپ مجھے آئس کریم دیں گی نہ تو میں آپ کا دوست بن جاؤں گا۔ اور پھر میں اپنے دوست کی ہر بات مانوں گا۔'' جازب نے سمجھ داری سے جواب دیا۔

''گڈ۔'' شازمہ نے جازب کی ذہانت کو بھانپ لیا تھا۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا اور میٹرک کے بعد سے جازب نے خود بھی کوچنگ سینٹر میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنی پڑھائی کا خرچا خود اٹھا رہا تھا۔ وہ بے حد ذہین ثابت ہوا۔ آذر اور شازمہ اس پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا اور اس کے شوق و لگن کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ آذر اور شازمہ نے ہر قدم پہ اس کا ساتھ دیا اور آج وہ سوفٹ ویئر انجینئر بن کر ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا۔

''آنٹی یہ ڈگری میں نے اپنے لیے نہیں بلکہ آپ کے لیے حاصل کی ہے۔ آپ جس لگن اور محنت سے مجھے پڑھاتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا اگر میں نہیں پڑھوں گا تو آپ ہرٹ ہو جائیں گی۔ پھر میں پڑھتا چلا گیا۔ کبھی کھلونوں کی لالچ میں، کبھی آئس کریم کے لالچ میں۔ مجھے اچھا لگتا تھا میرے پڑھنے سے آپ خوش ہوتی تھیں۔ تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ آپ اور انکل میرے مسیحا ہیں۔ میں آپ دونوں کا احسان تاحیات نہیں اتار سکوں گا۔ آپ دونوں نے میرے لیے ماں، باپ سے بڑھ کر کیا ہے۔'' جازب، شازمہ کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگائے بے تحاشا رو رہا تھا۔ شازمہ بھی جازب کے سر پہ ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔

''بیٹا! تم نے بھی ہمیشہ ہم دونوں کو ماں، باپ ہی کی طرح سمجھا ہے اور ہم نے بھی تمہیں اپنی اولاد ہی کی طرح پیار کیا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہیں کامیاب دیکھ کر مجھے کتنی خوشی مل رہی ہے۔ آج میرے تمام اسٹوڈنٹ ہی اعلا عہدے پر فائز ہیں۔ مگر تم نے ہماری زندگی میں شامل ہو کر مجھے اولاد کی محرومی

سے نجات دلا دی۔ مجھے لگتا تھا تمہارے ساتھ وقت گزارنا، تمہاری چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنا۔ تمہاری باتیں سننا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اگر میرا بیٹا ہوتا تو۔ بالکل تمہاری طرح ہی ہوتا۔'' شازمہ نے جاذب کے آنسو صاف کرتے ہوئے محبت سے کہا۔

''آنٹی میں نے اپنے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اسپورٹس چینل جوائن کرلیا ہے۔'' جاذب نے بتایا۔

''بیٹا! جس کام کو بھی کرو محنت اور لگن کے ساتھ کرو اور دوسری بات ہمیشہ اپنے ساتھ دوسروں کا بھی خیال ضرور رکھو۔'' شازمہ نے خوش ہوتے ہوئے جاذب کو نصیحت کی۔

''جی ضرور۔'' جاذب نے شازمہ سے کہا۔ ''آنٹی کمنگ ویک دوسرے چینل پہ ''مدرز ڈے'' سلیبریٹ کیا جارہا ہے۔ میں بھی اپنی والدہ کے ہمراہ پروگرام میں انوائیٹڈ ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں۔ امی تو اب حیات نہیں ہیں اور اگر ہوتیں بھی تو میں آپ کو اپنے ہمراہ لے کر جاتا۔ آپ چلیں گی نہ میرے ساتھ؟'' جاذب نے شازمہ سے اجازت طلب کی تھی۔

''جی بیٹا میں ضرور چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' شازمہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''تمہارے انکل بھی کب سے ورلڈ ٹور کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ اب تمہارے پروگرام کے بعد ہی ان کے ہمراہ جاؤں گی۔'' شازمہ نے کہا۔

☆☆☆

ممی میں نے حریم سے کورٹ میرج کرلی ہے اور کل اسے میں گھر لے کر آرہا ہوں۔ چاہے آپ دونوں کو اچھا لگے یا نہیں۔ مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔'' علی نے کھانے کی میز پر دھماکا کیا۔ عاطف اور عائشہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''کیا تم نے اس ماڈل سے شادی کرلی اور ہمیں بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔'' عائشہ نے غصے بھرے لہجے میں علی سے کہا۔

''بتایا تو تمہارے آپ لوگوں کے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔'' علی نے کھانا کھاتے ہوئے بدتمیزی سے تڑخ کر جواب دیا۔

''علی تمیز سے بات کروں اپنی ماں سے بات کر رہے ہو تم۔'' عاطف نے خون کے گھونٹ پیتے علی سے کہا۔

''پلیز! نو لیکچر مجھے پتا ہے کس سے کس طرح بات کرنی ہے اور اگر آپ لوگوں نے میرا زیادہ دماغ خراب کیا تو میں حریم کے گھر شفٹ ہوجاؤں گا۔'' علی نے غصے سے کرسی پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''آج رات میں حریم کے گھر رکوں گا اور پلیز مجھے کال کرکے تنگ مت کیجیے گا۔ آئی نو کتنی پروا ہے آپ لوگوں کو میری۔'' علی نے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ عاطف اور عائشہ سکتے کی عالم میں بیٹھے رہ گئے۔

عائشہ کے آگے ماضی کے ورق تیزی سے پھڑپھڑانے لگے۔ وہ صاحب اولاد ہونے پہ بے حد اترائی تھی۔

''عائشہ دیکھو میں علی کے لیے کیا کیا لے کر آئی ہوں۔'' شازمہ نے علی کی پسند کی ڈھیر ساری چیزیں علی کے سامنے لاکر اسے تھمائی۔

''واؤ خالہ، آئی لو یو۔'' علی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو بیٹا۔'' شازمہ نے خوش ہو کر جواب دیا۔

''آپی آپ کو کتنی بار منع کیا ہے۔ مت لایا کریں علی کے لیے کچھ بھی، پہلے ہی کیا کم کھلونے ہیں علی کے پاس۔ میں اور عاطف علی کے منہ سے نکلی ہر فرمائش پوری کردیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ خواہ مخواہ علی کی عادتیں بگاڑ رہی ہیں۔'' عائشہ نے جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے نخوت بھرے انداز میں کہا تھا۔ شازمہ صرف عائشہ کو دیکھ کر رہ گئی۔ ایسے بے شمار واقعات عائشہ کے سامنے اپنی بدصورتی سمیت آ کر اسے ستانے لگے۔ کہتے ہیں نہ ہمیں جس چیز پہ گھمنڈ ہوتا ہے۔ اللہ اس سے ہی ہمیں خوار کرواتا ہے۔ علی نے جو بھی سیکھا اپنی ماں سے ہی سیکھا تھا۔

☆☆☆

مارننگ شو میں تمام گیسٹ اپنی والدہ سمیت کرسیوں پر براجمان تھے۔ شو کا آغاز شو کی میزبان نے اپنے خوب صورت انداز میں کیا۔ کنزی نے سوالات کا آغاز جاذب سے کیا۔

''جاذب جی کہتے ہیں ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے کیا آپ کی زندگی میں ایسی عورت ہے؟'' کنزی نے سوال مکمل کرکے جواب کے لیے مائیک اس کے ہاتھ میں دیا۔

''جی بالکل! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ میری کامیابی کا سارا کریڈٹ میری والدہ کو جاتا ہے۔ اگر یہ ہستی میری زیست کا حصہ نہ بنتی تو آج میں آپ سب کے سامنے نہ ہوتا۔'' جاذب نے شازمہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''گڈ! آپ جتنی محنت اور لگن سے کام کر رہے ہیں۔ یقیناً ابھی مزید بے شمار کامیابیاں آپ کی منتظر ہیں۔'' کنزیٰ نے جاذب کو سراہتے ہوئے کہا۔ کنزیٰ نے مائیک شازمہ کے ہاتھوں میں تھمایا۔

''آپ بھی کچھ کہیں۔'' کنزیٰ نے کہا۔

''میں صرف اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہتی ہوں کہ میرے رب نے مجھے اتنی بڑی ذمہ داری کے لیے منتخب کیا۔ ورنہ میری کیا بساط کہ میں اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا سکتی، یہ سب ہی کچھ اللہ کے حکم سے ممکن ہوا ہے۔'' شازمہ نے نم ہوتی آنکھوں سمیت اپنے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

عائشہ ریموٹ ہاتھوں میں تھامے اسکرین پہ نظریں جمائے بے یقینی سے شازمہ اور جاذب کو استعجاب بھری نظروں سمیت دیکھ رہی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ہر مقام پر شازمہ سے خود کو برتر اور اعلا ارفع سمجھتی تھی۔ وہ تو ''صاحب اولاد'' ہونے پہ ہمیشہ فخر محسوس کیا کرتی تھی۔ مگر آج وہی اولاد اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ بعض اوقات انسان سب کچھ پا کر بھی تہی داماں رہ جاتا ہے۔ اور کچھ لوگ بڑی سے بڑی کمی ہونے کے بعد بھی، آسودہ اور مطمئن رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا اللہ ان سے ہمیشہ راضی ہوتا ہے۔

☆☆☆

آذر اور شازمہ دن بھر کی تھکان دور کرنے کے لیے ہوٹل کے روم میں براجمان تھے۔ کہ یکدم شازمہ کے سیل فون پہ میسج ٹون گنگنانے لگی۔ شازمہ نے مسکرا کر سیل فون اٹھا کر دیکھا تو کئی محبت بھرے میسجز پوری آب و تاب کے ساتھ ایستادہ تھے۔ وہ ہر میسج کا جواب دینے لگی۔ جاذب کا بھی فکرمندی سے لبریز میسج موجود تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے خاصا فکرمند ہو رہا تھا۔ شازمہ اس کی حساس طبعیت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جاذب کو ریپلائی کرنے لگی۔ آذر بغور شازمہ کو دیکھ رہا تھا۔

''حد ہے یار ایک تو تمہارے بچوں کو تمہارے بنا چین نہیں ملتا۔'' آذر نے مسکرا کر اس کے ہاتھوں سے سیل فون لینا چاہا۔

''آپ بھی نہ...... حد کرتے ہیں۔'' شازمہ نے سیل فون پرے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اللہ کا کرم نہیں تو اور کیا ہے آذر کہ میں ان لوگوں سے اتنی دور ہوں اور انہیں میری فکر ستائے رکھی ہے۔'' شازمہ نے مسکرا کر سیل فون بیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں تم بے حد لکی ہو شازی کہ تمہارے چاروں اطراف محبت کرنے والوں کا ایک ہجوم موجود ہے۔ کبھی کبھی مجھے تم پہ رشک آتا ہے۔ تم واقعی محبت کیے جانے کے لائق ہو شازی۔'' آذر نے شازمہ کے ہاتھوں کو تھام کر اسے محبت سے دیکھا۔

''آپ نے میرے آنچل میں جو محبت اور اعتماد کے جگنو تھمائے ہیں نہ آذر، اس کی روشنی میں با آسانی میں نے یہ سفر تمام کیا ہے۔ میں دعا کرتی ہوں۔ میں رہوں یا نہ رہوں یہ ان گنت محبتیں تاعمر میرے ہمراہ رہیں۔'' شازمہ نے آسودہ مسکراہٹ سمیت آذر کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆

ناولٹ

دستِ شفا

نور احمد

''م، ح، ب، ت۔ محبت۔ م سے شروع ت پر ختم۔ میں سے لے کر تم تک کا سفر اور تُو سے آگے نصیبوں والے جاتے ہیں۔ محبت بت شکن ہوتی ہے اور اس حیرت کدے میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلا بت اپنا توڑنا پڑتا ہے۔ یہ ابتدا ہے، پہلا اصول ہے، بڑا کٹھن ہوتا ہے اس پہلی سرحد کو عبور کرنا۔ اس پہلی رکاوٹ کو پھلانگنا، فاصلوں پر کھڑے ہو کر محبت کی خوش نمائی کا منظر دیکھنے والے بہت سے انجان، جب اس سے متاثر ہو کر اس کی جانب بڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ قدم اٹھنے پر نیچے زمین نہیں ان کی اپنی ذات ہوگی۔ بہت سے لوگ اس جذبے کے زیر اثر قدم اٹھا تو لیتے ہیں مگر رکھ نہیں پاتے۔ چیختے چلاتے خوف زدہ ہوتے واپس پلٹ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محبت کے سامنے ناممکن و محال کچھ نہیں، وہ گزر جاتے ہیں۔ خود سے آگے بڑھتے ہیں تو تم کا سفر شروع ہوتا ہے اور محبت کی ت تو ایک گرداب ہے، دلدل ہے۔ اس سے گزرنا ممکن ہے اور نہ ہی کوئی اس سے گزرنا چاہتا ہے جب ''میں'' ''تم'' میں دکھائی دینا شروع ہو جائے تو بھلا کوئی کیسے آگے جائے۔ اس کے لیے کوئی ہاتھ چاہیے، کوئی دست غیب ''تم'' کو چھوڑ دیا ''میں'' سے آگے گزر پائی ہو؟''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا، دلفریب مسکراہٹ ایک پل کے لیے وہ اپنی تمام اذیت، وحشت کو فراموش کر بیٹھی۔ اس کی روح کے بے آب و گیاہ صحرا میں کن من ہوئی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس کی مسکراہٹ تو گویا بھنور کی آنکھ تھی جس کے گرد جم کر کھڑا ہونا ناممکن تھا۔ آنکھوں کے پانی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، وہ پھر اندر ہی کہیں لوٹ گیا۔ اب کے اس کی نگاہوں میں بے شمار شکوے در آئے، آج کتنے دنوں بعد ایسے یہ چند گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں۔ اتنی بے التفاتی، اتنی بے مہری، پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کس گناہ کی سزا میں یہ قیامت میرے سر پر ٹوٹی ہے؟ میں نے تو کبھی یوں نہیں چاہا، سب گلے دل میں مچل رہے تھے، آنکھوں سے عیاں ہو رہے تھے۔ مگر انہیں نوک زبان پر لانا محال تھا، مقابل بھی کائیاں تھا، جیسے اس کے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔ جانتا تھا پر مانتا نہیں تھا، ماننے کے لیے شرائط رکھ دیتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی، مریم کی بے بسی اس کے دل کی دیواروں سے سر پٹک پٹک کر بین کرنے لگی۔ درد نوحہ کناں ہوا تو اس کی سلونی رنگت سفید لٹھے کی طرح لگنے لگی۔ وہ پھر سنجیدہ ہو گیا، سنجیدہ اور افسردہ۔ جیسے اسے ادراک ہو گیا ہو کہ اس کی مسکراہٹ نیم قاتل ہے اور مقابل گھائل۔

''تمہیں ''میں'' سے آگے بڑھنا ہوگا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ جیسے کسی بچے کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد کروایا جاتا ہے۔ ''ورنہ......'' ورنہ میں چھپا کوڑا اس کی روح پر لگا، وہ تڑپ اٹھی، اس کا تن من سلگ گیا ورنہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کا جواب اسے خود ڈھونڈنا تھا اور اس کے بعد کا مدعا وہ سمجھ گئی ورنہ دعوٰی محبت سے پیچھے ہٹنا ہوگا۔

نو واردانِ مدرسۂ عشق کے لیے
درسِ وفا کا قاعدہ آساں ضرور ہو

☆☆☆

''بھئی میں تو چچا جان کی منطق سمجھنے سے قاصر ہوں، میرے ساتھ خدا واسطے کا بیر باندھے پھرتے ہیں۔ دوستی کرنے کی کوشش کی، تحفے تحائف دیے یہ تو یہ میں تو ان کے قدموں میں سرخ قالین بن کر بچھنے کو بھی تیار ہو گیا مگر ان کے دل کی سختی، نرمی میں نہ بدلی۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے دل میں میرے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی بلکہ ایسا ہے کہ وہ نیتاً گنجائش نکالنا ہی نہیں چاہتے۔ میرے کھانے پینے، چلنے پھرنے یہاں تک کہ دیکھنے پر بھی انہیں اعتراض ہے۔'' جبکہ وہ پورے انہماک سے ڈایاگرام بنا رہی تھی۔ ''اے لڑکی سنو! کیا میں بھونکتا ہوں؟'' اس نے پنسل سے میز بجاتے ہوئے اسے اپنی جانب

متوجہ کیا۔

''کیا میں کچا گوشت کھاتا ہوں یا کسی کا حق کھاتا ہوں؟'' اس نے لمحہ بھر کے لیے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی طرف دیکھا، گردن نفی میں ہلائی اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ ہادی نے اپنی تقریر کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑا۔ ''میرا اخلاق و کردار ان کی نظر میں مشکوک ہے، کوئی ڈھنگ کی وجہ سامنے لانے میں ابھی تک تو وہ ناکام ہیں۔ حالانکہ قسم لے لیں جو ان کی بیٹی کے علاوہ کسی کو نظر بھر کر دیکھا بھی ہو۔ کسی کے بارے میں سوچا بھی ہو بلکہ وہ تو اسے بھی ایک نظر دیکھنے نہیں دیتے، ان کی خوں خوار شخصیت کے سامنے بندے کا پتا پانی ہوجاتا ہے۔ بچپن سے ان کے عتاب کا شکار ہوں، خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں، کوئی ان سے میرا گناہ پوچھے۔ ارے لوگو میری داستان الم سنو، میرے درد ناک گیت کی فراق زدہ نوا سنو۔ میں ان پتھریلی سرد دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر تھک چکا ہوں، کوئی ہے جس کا کلیجہ میرا درد محسوس کر کے پھٹ پڑے۔'' اس کے پنسل چلاتے ہاتھ رک گئے، اس نے پھر سر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا اور ہادی کو دیکھتے ہوئے گردن نفی میں ہلا دی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ ''میرا قصور محض اتنا ہے کہ میں ان کی بیٹی سے سچی محبت کرتا ہوں۔'' وہ حیران ہوئی تو کیا محبت جھوٹی بھی ہوتی ہے؟

''اس حادثے میں بھی میرا اپنا ذرہ برابر ہاتھ نہیں، بچپن سے مجھے بتایا گیا کہ یہ تمہاری منگیتر ہے۔ اب بندہ اپنی جائز منگیتر سے بھی محبت نہ کرے تو کدھر بھٹکتے۔ وہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں گے تو مجھ جیسا خواہشات رکھنے والا بے ضرر انسان نہیں دیکھ پائیں گے۔ کمیونیکیشن کے اتنے جدید دور میں، میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اتنا مجبور؟ تف ہے مجھ پر۔ یا اللہ میری پیدائش کے لیے تجھے یہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کا یہ قدیم خاندان ہی ملا تھا؟ میں نے اپنا لیپ ٹاپ کسی غریب مستحق اسٹوڈنٹ کو دان کر دینا ہے اور دیکھنا تم، اپنے سیل فون پر تیل چھڑک کر آگ لگادوں گا اور اپنا گریبان پھاڑ کر کسی جنگل میں جا بیٹھوں گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم ذرا اپنے کام سے فارغ ہو کر قریب ترین جنگلات کی لسٹ بنا دینا مجھے۔''

''اس کی ضرورت نہیں، چھانگا مانگا قریب ترین جنگل ہے۔'' وہ جھٹ سے بولی۔ ہادی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''نہیں، وہ مصنوعی طریقے سے اگایا گیا ہے، میں کسی قدرتی جنگل کو ترجیح دوں گا۔'' وہ خفگی سے بولا تو اس نے شانے اچکا دیے، اب کے ہادی تلملا اٹھا۔

''سنو، تم اتنی اثر پروف کیوں ہو؟ پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارے سامنے اپنا دکھڑا رو رہا ہوں۔ کون کم بخت کہتا ہے لڑکیاں جذباتی اور ہمدرد ہوتی ہیں؟ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا۔ سنو کیا میرے عاشقانہ کردار میں رتی بھر بھی پختگی نہیں ہے جو میرے الفاظ تم پر یوں بے اثر ثابت ہو رہے ہیں۔'' ہادی کی بے چارگی پر اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ صاف، شفاف، جھلمل کرتی پہاڑی ندی جیسی کھلکھلاہٹ۔

''یار میں نہیں مانتا، ان کی امریکی پالیسیوں کو، میں ان کا ہونے والا داماد ہوں یا شمالی کوریا جس کی طرف انہیں ہر وقت نقصِ امن کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔''

''ویسے مجھے لگتا ہے بطور عاشق آپ کا کردار واقعی ابھی ناپختہ ہے شاید اسی لیے اتنا شور مچاتے ہیں۔'' فلسفیانہ انداز میں یہ جملہ بول کر اپنی دانست میں اس نے تیر مارا تھا۔

''اس میدان کارزار میں ابھی آپ کو مزید عمل پیہم کی ضرورت ہے۔''

''میری جان بھی حاضر ہے یار! مگر اس میدان سے کسی طرح چچا کو نکال دو۔'' وہ پھر سے

بے تحاشا ہنسنے لگی۔

''اچھا بس کرو اب، بددعائیں نہ لے لینا۔''

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

''اوکے فائن، بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا۔'' وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

''ڈائریکٹر پروڈیوسر تو آپ ہیں، میرے لیے جس کردار کا انتخاب کریں گے ادا کردوں گی مگر ایک لارج چیز پڑا لگے گا۔'' ہادی نے اس ایف ایس سی کی ننھی منی اسٹوڈنٹ کو بغور دیکھا۔

''سنو لڑکی! نہ تمہاری اتنی عمر ہے، نہ تمہارا اتنا سائز ہے لیکن تمہاری خوراک......''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... پھر یہ تقریر کسی اور کے سامنے دہرائیں۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ کسی کو آپ پر ترس آجائے۔'' وہ رکھائی سے کہتے ہوئے اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

''نادان لڑکی! نیکی کرنا ہی کافی نہیں اسے دریا میں ڈالنا بھی ضروری ہے۔''

''پہلے نیکی کرنے کی عادت تو ہو لینے دیں۔''

''بہتر، پلان تو سادہ سا ہے، تمہیں زرش کو اپنے گھر بلانا ہوگا کل کی تاریخ میں ہی۔''

''لیکن اگر انکل یا آنٹی انہیں کل نہ آنے دیں، کسی اور دن کا کہہ دیں تو پھر۔''

''اس پھر کا مجھے نہیں معلوم، دوست ہو، کبھی کبھار کی شاگرد ہو، کزن ہو، چھوٹی بہنوں جیسی ہو۔''

''نو ایموشنل بلیک میلنگ۔'' وہ تپ گئی۔

''اوکے پھر چیز پڑے پر جو میری جیب ڈھیلی ہونی ہے ان پیسوں کو ہی خود پر حلال کرلو۔''

''اگر میں انہیں گھر بلاؤں تو لازماً کوئی نہ کوئی ساتھ ہوگا۔ دوسری صورت میں کوئی تیر بہ ہدف بہانہ گھڑ کر انہیں خود جا کر اپنے ساتھ لانا پڑے گا لیکن یہ آخری مرتبہ ہوگا اس کے بعد میں آپ کے ہاتھوں استعمال اور خوار نہیں ہوں گی۔'' اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے اس معاملے سے اپنی مستقبل کی دست برداری کا اعلان کیا۔

''بالکل میری پیاری گڑیا! یہ آخری دفعہ ہوگا، اس کے بعد میں شادی کروالوں گا۔ محض پانچ منٹ کی ملاقات کا سوال ہے صرف برتھ ڈے وش کرنی ہے۔'' اور یہ عہد وہ دونوں بیسیوں مرتبہ دہرا چکے تھے۔

''ویسے اس میں اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے، کارڈ اور گفٹ مجھے دے دیں، پہنچادوں گی۔'' وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

''حد ادب لڑکی! تمہیں ہر حال میں ہمارے دربار دل کے اصول و ضوابط اور قوانین کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔''

''عالی جاہ! اس دربار میں ہونے والی سازشوں کی خبر اگر کہیں اڑ اڑ کر مخالف سمت پہنچ گئی تو اس سلطنت کو تہ و بالا ہونا ناگزیر ہے۔'' ہادی کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

''دربار برخاست کیا جاتا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔



زرش کے چہرے پر وہ شفق چھائی ہوئی تھی جو رات کے مسافر کو سحر کی آمد کا پیغام دیتی ہے، جو بتاتی ہے دیکھو نکھری ستھری روشن صبحیں اپنے دامن میں بے پایاں مسرتیں سمیٹے تمہاری منتظر ہیں۔ اس کے گلنار چہرے پر نظر نہیں ٹکتی تھی، ان چند ساعتوں میں کیا طلسم پنہاں تھا، ہادی آیا تو گڑیا، زرش کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔ اس نے چائے بنانے کے لیے جھٹ سے کچن کی طرف دوڑ لگادی، وہ اسی کی کرسی گھسیٹ کر زرش کے روبرو بیٹھ گیا۔ چائے بنانے میں ایسے سات، آٹھ منٹ لگے تھے وہ لوٹ کر آئی تو وہ جا بھی چکا تھا۔ زرش مبہوت سی اسی کرسی کو دیکھے جارہی تھی جس پر وہ چند لمحے پہلے بیٹھا تھا۔

''یہ کیا بھئی' اتنا شور مچا رکھا تھا آپ نے ملاقات کے لیے۔ جذباتی مکالمے بول بول کر میرے دماغ کی دہی کردی، اب ان کی ملاقات کا

دورانیہ ایک چائے کے کپ سے بھی کم نکلا۔ حد کرتے ہیں ہادی بھائی بھی۔ اللہ زرش آپی! کتنے پیارے پھول ہیں۔'' اس کی نظر سامنے پڑے سرخ گلابوں کے بوکے پر پڑی تو بے تاب ہوکر بول پڑی۔ ''دو چار گلاب میں رکھ لوں؟'' گڑیا بچوں کے سے ندیدے پن سے بولی۔

''ہاں رکھ لینا مگر ایک شرط پر؟''

''جلدی بولیں کہیں یہ مرجھا نہ جائیں، میں اپنے والے پھولوں کو گلدان میں سجا کر فریج میں رکھوں گی۔'' زرش بے ساختہ کھلکھلا اٹھی۔

''پاگل، پھولوں کو گلدان میں سجا کر فریج میں کون رکھتا ہے؟''

''اچھا بتائیں بھی ناں، مجھے کیا کرنا ہوگا۔'' وہ اپنی پونی ٹیل کو جھلاتی ہوئی بولی۔

''تمہیں مجھے بتانا ہوگا کہ انہوں نے مجھ سے ملنے کے لیے کون کون سے بہانے گھڑے، کیا کیا باتیں بنائیں میرے سامنے تو گھنے میسنے بنے رہے تھے، بتاؤ انتظار کے وقت کو کیسے کاٹا؟ مجھے دیکھنے کی آرزو کس طرح دامن گیر ہوئی، ان کا مضطرب دل کیسے بے کل رہا؟'' اس کی آواز بہت پست تھی جیسے خود سے مخاطب ہو۔ کھلکھلاہٹ نے سمٹ کر ایک حسین، چھیل چھبیلی مسکان کا روپ دھار لیا تھا جو بڑی خاموشی سے اس کے ہونٹوں اور آنکھوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ خیالوں کی شہزادی محسوس ہوتی تھی، وہ شہزادی جس سے سفید روشنی ٹکرا کر دھنک رنگوں میں بٹ جائے اور پھر رنگ اسے چھو کر اٹھکیلیاں کرتے پھریں۔ محبت ایسی ہی تو ہوتی ہے جسے چھو جائے اسے چھو چھو کر دیکھنے کو دل کرتا ہے، گڑیا بے چاری تو اس کیفیت کی زبان و بیان کی باریکیوں سے ناواقف تھی کیا خاک سمجھ پاتی۔ البتہ مفہوم سے کچھ کچھ آگاہی ہوگئی تھی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اب ہادی بھائی کی تقریروں کے بیان میں زرش آپی کے والد محترم کا ذکر شر بدرجہ اتم موجود ہوتا تھا تو وہ کیا بات کرے اور کسے حذف کرے۔

اس کی شکل کے تاثرات ایسے ہوگئے جیسے زبان پر کسی نے کونین کی کڑوی گولی رکھ دی ہو۔

''او کے، مجھے یہ شرط منظور ہے مگر......'' اس نے اچانک بوکے کے نیچے دبے برتھ ڈے کارڈ کو جھپٹ۔ ''پہلے میں یہ پڑھوں گی۔''

''گڑیا کی بچی، میں نہیں پڑھنے دوں گی۔'' زرش نے کارڈ لینے کی کوشش کی تو گڑیا نے دوڑ لگادی۔ زرش اس کے پیچھے بھاگنے لگی مگر اسے نہ ہاتھ آنا تھا نہ آئی، وہ دو چار چکروں میں ہی ہانپ کر بیٹھ گئی تو گڑیا نے دور کھڑے ہوکر کارڈ کھولا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو ڈیئرسٹ زرش!''

تیری نگاہ محبت کی اک جھلک کے لیے
اٹھانے پڑتے ہیں احساں نظر نظر کے مجھے

''لو جی، یہاں بھی وہی حرکت، صرف ایک شعر۔ یعنی کہ محض ایک شعر۔'' وہ چلائی۔ ''یار کوئی خدا کا بندہ مجھے میٹھا شربت پلائے، کچھ انرجی بحال ہو۔ تو کیا اس شعر کو پڑھنے کے لیے میں نے اتنے چکر لگائے ہیں؟ اف خدایا! ہادی بھائی پڑے کے ساتھ کوک بھی پڑے گی آپ کو۔'' اس نے دانت کچکچائے۔ ''اس سب میں آپ کی تو صرف زبان استعمال ہوئی ہے جبکہ میری عملی مشقت زیادہ ہے۔''

☆❁☆

''بھائی صاحب جب میں نے آپ کو اپنی بیٹی سونپنے کا ارادہ کیا تھا تو آپ کو بتادیا تھا کہ جب تک شادی نہیں ہوجاتی آپ کا بیٹا میرے گھر کی دہلیز پار نہیں کرے گا۔ عید بقر عید کو بھی ہمارے گھر نہیں آئے گا۔ اس کا کوئی حیلہ بہانہ قابل قبول نہیں ہوگا۔''

''ہاں تو جیسا تم نے چاہا اور کہا تھا ویسے ہی تو ہو رہا ہے احسان میاں!''

''خاک ویسا ہو رہا ہے بھائی صاحب! اس گدھے سے پوچھیں۔''

''اب میں نے کیا کردیا ہے چچا جان؟'' ہادی غصے کی شدت سے ہونٹ کاٹتا بولا جبکہ انعام صاحب

غصے سے لال پیلے ہوتے، اچھل اچھل کر بولتے اپنے بھائی کو دیکھ کر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''کیوں تجھے نہیں پتا تُو نے کیا، کیا ہے؟'' وہ اپنی لال انگارہ سی آنکھیں ہادی کی آنکھوں میں ڈال کر چبا چبا کر بولے۔ ایک پل کے لیے وہ ڈگمگا گیا، ضرور ان کے پاس مجھ پر چڑھائی کرنے کی اتنی ہی بڑی وجہ ضرور ہوگی جتنی امریکا کے پاس مسلم ممالک پر حملہ کرنے کی ہوتی ہے۔ کہیں وہ برتھ ڈے والی بات تو ان کے علم میں نہیں آگئی؟ گڑیا غداری صرف تم ہی کرسکتی ہو، میر جعفر کی جانشیں میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ ہادی کی نگاہوں نے ایک لمحے کی پسپائی اختیار کی اور چچا نے چڑھائی کردی۔

''احسان اس نے کیا کردیا ہے کچھ بھاپ تو نکالو منہ سے۔ بھئی بتاؤ گے تو پتا چلے گا ناں۔''

اپنے بیٹے پر انعام صاحب کو حد درجہ بھروسا تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا، جس سے اس کے باپ کا سر اپنے بھائی کے سامنے جھک جائے۔

ان کے تین بیٹے تھے ہادی سب سے بڑا تھا، اللہ نے انہیں بیٹی جیسی نعمت سے محروم رکھا تھا جس کا انہیں چند سالوں تک قلق رہا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو وہ اولاد کی طرح چاہتے تھے، والدین کی وفات کے بعد احسان کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کے سر پر سے والدین کا سایہ شفقت اٹھ چکا ہے۔ انعام صاحب کی اسی محبت اور لاڈ کا فائدہ احسان بڑھاپے تک بھی الٹی سیدھی باتیں کرکے اٹھالیتے تھے، انعام ان کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے جو منہ میں آتا کہہ دیتے جو چاہتا منوا لیتے۔ ہادی کی پیدائش سے لے کر اب تک انہیں اس سے کچھ خاص قسم کی پرخاش تھی۔ نجانے ان کے اندر کون سی چنگاری دبی ہوئی تھی جسے ہادی کی معمولی سے معمولی شرارت یا بات بھی ہوا دے دیتی حالانکہ تین بیٹوں کی اوپر تلے پیدائش سے بھی انعام صاحب کے محبت بھرے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انہوں نے بہت چاؤ سے ان کی شادی کی، اس وقت ہادی چار سال کا تھا۔ ایک سال بعد اللہ نے احسان کو ایک معصوم پری جیسی بیٹی عطا کی، جسے گود میں لے کر انعام صاحب کا سارا دکھ جاتا رہا۔ ہادی ابھی ساتویں کلاس میں تھا جب انہوں نے اس کے لیے جھولی پھیلادی۔ احسان کیسے انکار کرسکتے تھے۔ پر عجیب و غریب سی پابندیاں اور فرمائشیں کردیں جو انہوں نے ہنس کر قبول کرلیں مگر ہادی ان کی نرالی منطقوں پر بہت کڑھتا تھا۔ اسے بھی جہاں موقع میسر آتا انہیں چڑانے سے باز نہ آتا لیکن صرف باتوں کی حد تک۔

اسی طرح آج بھی ان سے تڑک تڑک چنگاریاں اڑ رہی تھیں، جس سے اندر ہی اندر ہادی کی کسی کمینی حس کو تسکین پہنچ رہی تھی۔ البتہ وہ ابا کے سامنے کسی صورت بھی شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا اور دوسری جانب اسے اس بات کا بھی پورا دھیان تھا کہ چچا احسان زرش کے بارے میں کوئی شک اپنے دل میں نہ لے آئیں۔

''اس نامعقول سے پوچھیں اس نے ایسا کیوں کیا؟'' ابا کی سوالیہ نگاہیں اس پر آٹکیں۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا چچا جان، نجانے کس بات کا غبار مجھ پر نکال رہے ہیں۔''

''دیکھیں، ذرا اس کی زبان درازی دیکھیں۔'' وہ یوں بھڑکے جیسے جلتی آگ پر پیٹرول پھینک دیا گیا ہو۔

''ابا جان! میں تو واقعی نہیں جانتا کہ میں نے ان کی وضع کردہ قانون کی کون سی شق کو نقصان پہنچایا ہے، یہ بہتر بتاسکتے ہیں۔''

''احسان یار! اب بتادو بات کو زیادہ بڑھاؤ نہیں۔'' انعام صاحب اکتاہٹ سے بولے۔ ہادی دم سادھے بیٹھا رہا، دل کو یقین ہوچلا تھا کہ چوری پکڑی گئی ہے۔ چچا احسان کے بلبلانے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہادی کا پاؤں ان کی دم پر پڑا ہے۔ اف اللہ

ان کے بوسیدہ دماغ کا گند کیسے دور کروں، لگتا ہی نہیں کہ اس انسان اور میرے باپ کی رگوں میں ایک ہی ماں باپ کا خون دوڑتا ہے۔

''اگر آپ سنیں گے تو ناں بھائی صاحب کہ اس واہیات انسان نے کیا اوباشوں والی حرکت کی ہے تو آپ بھی میری طرح ہی سیخ پا ہو جائیں گے۔''

''دونوں میں سے کوئی ایک منہ سے پھوٹے گا تو معلوم ہوگا، مٹی کی ہانڈی کی طرح بس ابالے ہی کھاتے جا رہے ہو۔'' ابا کی تیوری چڑھ گئی، ہادی الرٹ ہوگیا اسے اپنے دل کی دھڑکن کا ارتعاش کانوں میں محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ کل......'' وہ چند ثانیے رکے جبکہ ابا کی سوالیہ نگاہیں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہادی تو نظر ہی نہ اٹھا سکا۔ ''یہ کل اپنی بائیک پر ہمارے گھر کی پچھلی گلی سے گزرا تھا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔

''ہوں پھر۔'' ابا نے پہلو بدلا۔

''پھر کا کیا مطلب ہے بھائی صاحب!'' چچا پر گویا حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ''جب میں نے منع کیا ہے کہ شادی سے پہلے یہ میرے گھر کے آس پاس نظر نہ آئے تو پچھلی گلی سے گزرنے کا مطلب؟ اسے گزرنے کے لیے وہی گلی ملی تھی؟ باقی سب راستوں کو آگ لگ گئی تھی۔ منع کرنے کے باوجود اس اوچھی حرکت کا کیا جواز ہے؟'' اب حیرت کے پہاڑ کا رخ تبدیل ہوگیا تھا۔ اب سنگ باری ہادی اور انعام صاحب کے سر پر ہو رہی تھی۔ پہلے وہ دونوں ہونقوں کی طرح انہیں دیکھتے رہے پھر یک لخت انعام صاحب کے قہقہے ابل پڑے۔

''مطلب اتنا خون تم نے اس لیے جلایا کہ یہ کل تمہارے گھر کی پچھلی گلی سے گزرا تھا؟ ہاہاہا......''

ہادی کے دل کی ڈھارس ذرا کی ذرا بندھی کہ صد شکر برتھ ڈے والی بات پردے میں ہے مگر وہ وجہ جس کے لیے اسے اوباش اور اوچھا انسان ہونے کی گالی دی گئی تھی صرف اتنی تھی کہ وہ کل صبح چچا احسان کے گھر کی پچھلی گلی سے گزرا تھا۔ یہ سن کر وہ تو بے چارہ صدماتی کیفیت سے دوچار ہوگیا تھا۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ کل وہ آفس سے لیٹ ہو رہا تھا تو جلدی پہنچنے کے لیے اس نے شارٹ کٹ راستہ چنا، شومئی قسمت کہ وہ راستہ چچا کے گھر کی پچھلی طرف سے گزرتا تھا یقیناً انہوں نے کھڑکی یا چھت سے اسے گزرتا دیکھ لیا تھا۔ اس عظیم اور تباہ کن راز کے بار کو نجانے تینتیس، چونتیس گھنٹے کیسے وہ پیٹ میں اٹھائے پھرتے رہے ہوں گے کیونکہ یہ اگلے دن کی شام کا وقت تھا، اس لمبی تاخیر کی ضرور کوئی بڑی وجہ ہوگی ورنہ وہ کوئی مہربان تھے جو آتے آتے دیر کر دیتے؟

عناد اور کینہ پروری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، گیلی لکڑی کی طرح ہادی کے اندر سے دھواں اٹھ رہا تھا حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش وہ سلگنے کے بجائے جل کر راکھ ہو جائے۔ ایک ہی بار میں ساری تکلیف سہہ جائے۔ اوپر سے ابا کے قہقہے اس کے زخموں پر ریفائنڈ سالٹ چھڑک رہے تھے (وہ عام نمک سے زیادہ تیز ہوتا ہے)۔

''کیا آپ کے فرد جرم کی لمبائی، چوڑائی اتنی ہی ہے؟'' وہ چچا احسان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے برخوردار!''

''مطلب اس کو بتایا جاتا ہے جسے سمجھ میں آجاتا ہو۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''اور ہاں آپ ہنسنے کے بجائے صحت جرم پر غور کریں تو بہتر ہے۔'' وہ باپ سے کہتا وہاں سے اٹھ گیا، اور چچا کی ''دیکھ لیں بھائی صاحب'' اس کا پیچھا کرتی رہ گئی۔

شکر ہے ان کے دونوں بیٹے شریف النفس ہیں شاید چچی پر گئے ہیں ورنہ تو تیسری عالمی جنگ ان ہی کی وجہ سے چھڑنی تھی۔ ایک دفعہ بیٹی بیاہ لاؤں پھر دیکھنا کیسے گن گن کر بدلے لیتا ہوں۔ قسم خدا کا مجھے کیسا رقیب نصیب ہوا ہے کسی کو بتا بھی نہیں سکتا۔ وہ بستر پر گر کر جلتا کڑھتا نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔



وہ بیڈ پر اس سکون سے لیٹا تھا جیسے بدھا نے نروان حاصل کر لیا ہو مگر یہ سکون عارضی اور دواؤں کا بخشا ہوا تھا۔ وہ آتش دان کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی تھی، باہر شدید سرد ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ یہ بندہ کم از کم مجھ سے تو زیادہ خوش نصیب ہے، کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن ہوش و خرد سے بیگانہ تو ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے گرد شال کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ ہوش مندی تو پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے، یہ رگوں میں دوڑتے خون کو جما دینے والی ہوائیں میری سوچ کو منجمد کیوں نہیں کر دیتیں تاکہ میری اذیت کے تمام در بند ہو سکیں۔ اچانک اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا، اسے یہ بند کمرہ ایک قبر کی طرح محسوس ہوا جس میں دو مردے ایک دوسرے پر گزرنے والے عذابوں سے بے پروا پڑے ہوں، پر اپنی اپنی جگہ دونوں کی روحیں کڑے احتساب کی زد میں ہوں۔ اس نے سردی اور مریض کی پروا نہ کرتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ ہوا تیز تھی اس کی شدت کی برچھیاں اس کی آنکھوں میں کھبتی چلی گئیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں اور باہر کی دنیا میں ایک نم دار پردہ حائل ہوگیا۔ اس نے آنکھیں صاف کیں اور گردن گھما کر بیڈ کی جانب دیکھا مگر وہاں لیٹے شخص کو شاید کمرے کے درجہ حرارت اور باہر کے طوفانوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، اسے اس پر بہت ترس آیا۔ دو گھنٹے پہلے اس نے خون کی قے کی تھی اور یوں کہ مریم کو لگا جیسے فرش پر کسی نے بکرا حلال کر دیا ہو، وہ حلق کے بل چلانے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر انکل کے دوست اور ان کی پوری فیملی جن کے گھر وہ بطور مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، اکٹھی ہوگئی۔ انہوں نے ڈاکٹر کو کال کی تھی، اس نے مریم کی ہذیانی کیفیت دیکھی تو نقاہت زدہ لہجے میں بہ مشکل بولا۔

''یوں چلا چلا کر مجھے ڈسٹرب نہ کرو، جب مجھے مرنا چاہیے تھا تب نہیں مرا تو اب کیا خاک موت آئے گی۔'' وہ فوراً سے پیشتر خاموش ہوگئی، چند منٹ بعد پھر اس نے ویسے ہی روتے ہوئے انکل کو کال کی اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی یہ سن کر سکتے میں چلے گئے تھے لیکن کیا کیجیے کہ مرد تھے، خود سنبھالا کیا اور پہلی دستیاب فلائٹ سے یہاں پہنچنے کا وعدہ کیا۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ پیشنٹ کو ہاسپٹلائز کرنا پڑے گا پر مریض نے سختی سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر کے گھر سے جاتے ہی موسم خراب ہونا شروع ہوگیا تھا اور اب یہ طوفان نجانے کیا گل کھلائے گا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر دیکھ رہی تھی، اب تیز بارش شروع ہوگئی تھی، وہ کچھ دیر اور کھڑی رہی پھر تھکن سے نڈھال احساس کے زیر اثر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ جیسے صدیوں سے موسم کی اس سختی کو جھیلتے جھیلتے تھک کر چور ہوگئی ہو۔ اس نے بستر کے قریب آتے ہوئے اس نیم مردہ وجود کو دیکھا صرف نبض اس کے زندہ ہونے کا ثبوت دیتی تھی اس بستر پر پڑی لاش سے اس کا رشتہ کتنا گہرا ہے وہ اس کا کزن بھی تھا اور شوہر بھی۔ نکاح کا بندھن جوان دونوں کی مرضی جانے بوجھے بغیر مجبوری حالات اور چند جذباتی بولوں کی بنیاد پر باندھ دیا گیا تھا۔



محبت کے پر بھی کیا طلسماتی تاثیر رکھتے ہیں، ان پروں سے انسان کن کن آسمانوں پر پروازیں کرتا پھرتا ہے، وہ بھی تو اڑ رہا تھا آج، یہ اڑان سرشاری اور بوکھلاہٹ کی متضاد کیفیات سے مزین تھی۔ وہ خوش تھا، مسرور تھا اور اتنا کہ خوش نصیبی اسے اپنے در کی لونڈی نظر آ رہی تھی، وہ لونڈی جو اپنی ریشمی پلکیں سر راہ بچھائے اس کے نازاں قدموں کی منتظر تھی۔ آج وہ مبارک دن آ پہنچا تھا جب خوابوں کو تعبیر کی سند دی جاتی ہے۔ محبت آرزوئے محبوب کا نام ہے، اس آرزو کی تکمیل کو اپنے سامنے دیکھ کر

بڑے صاحب ہوش، کام سے جاتے ہیں۔ ہادی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، جب وہ دولہا بن کر سب کے سامنے آیا تو اس کی شہزادوں جیسی آن بان نے چند لمحوں کے لیے دیکھنے والی ہر آنکھ کو مبہوت کر دیا۔ گڑیا اس وقت تک تھرڈ ائیر میں پہنچ چکی تھی، وہ آنکھیں مل مل کر ہادی کو دیکھ رہی تھی بالآخر نے اس کے بازو کو چھو کر خود کو یقین دلایا کہ یہ ہادی بھائی ہی ہیں، ہادی جھینپ گیا۔

"لڑکی تم بھی بہت پیاری لگ رہی ہو، بس ذرا تمہاری رنگت......" وہ تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیتا ہوا بولا۔ یک لخت جانے کیوں گڑیا کی نمکین رنگت پھیکی پڑ گئی۔ "بھئی اگر مجھ جیسے کسی باذوق انسان کی شادی تم سے ہو گئی تو سمجھو کہ نباہ ناممکن ہے۔"

"منہ دھو رکھو اپنا، میری بیٹی کالی نہیں سانولی ہے۔ تیکھے نقوش کے ساتھ اس سانولی رنگت کا مقابلہ پورے خاندان کی لڑکیوں سے کر لو۔ کسی میں ایسی کشش نہیں ہو گی، جو میری گڑیا میں ہے۔"

"بالکل درست، نیوٹن تو ایویں ہی برسوں کشش ثقل کے قانون میں الجھا رہا، اصل میں تو سیب ان ہی کی کشش کی وجہ سے زمین پر گرا تھا۔" پاس سے گزرتے عماد نے بے ساختہ لقمہ دیا تو ہادی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اور یہ اتنا بھی کوئی شہزادہ گلفام نہیں لگ رہا کہ تم اسے چھو کر دیکھنے کے لیے رک گئی ہو۔" ہادی کی امی اور گڑیا کی خالہ نے فوراً ہی ہادی کو آسمان سے اتارا اور زمین کی سیر کروائی۔ ماں نے نظر لگ جانے کے خوف سے سامنے کھڑے بیٹے کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مورال کچھ بہتر ہوا تو اسے زبان چڑاتی گڑیا، خالہ جان کے ساتھ ہو لی اور انعام صاحب نے شور مچا مچا کر پورا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ قسمت کا پھیر دیکھیں چچا احسان کو آج نہ صرف بھتیجے کو خوش آمدید کہنا پڑا تھا بلکہ چار و ناچار پیار کی نظروں سے بھی دیکھنا پڑا۔



"ہادی انعام کیا آپ کو زرش احسان تیس لاکھ حق مہر سکہ رائج الوقت قبول ہے؟" مولوی صاحب کی آواز تھی کہ خطرے کا الارم لحظہ بھر میں ایک انجانا خوف ہادی کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گیا۔ اسے پھریری سی آ گئی، اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ابا کو دیکھا، وہ خود مجسم حیرت تھے۔

"مولانا صاحب آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، بچی میری بھتیجی ہے اور یہ میرے بھائی کا گھر ہے۔ ایسی کوئی بے اعتباری والی بات نہیں اور پھر میرا بیٹا اتنا حق مہر افورڈ نہیں کر سکتا، ابھی حال ہی میں تو اس کی جاب اسٹارٹ ہوئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب! زندگی پڑی ہے ہم شرائط میں غیر مؤجل لکھ دیتے ہیں، جب مرضی ادا کر دے۔"

"جو بھی ہے مولانا صاحب! ہمارا گھرانہ مڈل کلاس گھرانہ ہے، ہم سفید پوش لوگ ہیں، لاکھ دو لاکھ کی بات الگ ہے۔ چلیں ایسا کریں آپ پانچ لاکھ لکھ دیں۔" ابا نے ہادی کا ہاتھ دباتے ہوئے گویا بات ختم کرنے کا عندیہ دے دیا جبکہ ہادی کے اکاؤنٹ میں بچت کے نام پر محض ایک لاکھ چالیس ہزار روپے تھے۔ مہر کی ادائیگی کے لیے پیسے بھلا وہ ابا سے کیسے مانگتا تھا اور یہ بھی تھا کہ ادائیگی میں جتنی دیر ہوتی اس کے ضمیر پر اتنا ہی بوجھ بڑھتا جاتا مگر ابا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا چنانچہ وہ طوعاً کرہاً چپ بیٹھا رہا۔ مولوی صاحب نے جواب طلب نظروں سے احسان چچا کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجیے گا بھائی صاحب! حق مہر تو تیس لاکھ ہی ہو گا، اپنی اکلوتی بیٹی، اپنے جگر کا ٹکڑا آپ کے بیٹے کو سونپ رہا ہوں، کچھ تو سیکیورٹی ہونی چاہیے۔" انعام صاحب کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"احسان! وہ تمہاری ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے، بیٹھے بٹھائے ایسے کون سے خدشات تمہیں لاحق ہو گئے ہیں کہ رشتوں کو پیسے کے ترازو میں

تولنے چل پڑے ہو۔"

"اس میں ایسی برا ماننے والی کیا بات ہے بھائی صاحب! یہ حق تو مذہب دیتا ہے میں نے کوئی انہونی بات تو نہیں کر دی۔" سب رشتہ داروں کو تو گویا سانپ سونگھ گیا تھا اور پھر جلدی سے بھلا کوئی اس غیر متوقع صورت حال میں حصہ بھی کیسے لیتا کہ انعام اور احسان دونوں سگے بھائی تھے۔

"میری ایسی مجال کہاں کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے انحراف کر سکوں۔ میری ناقص عقل کے مطابق تو مرد کی جیب پر مہر کا اتنا ہی بوجھ ڈالنے کی تاکید کی گئی ہے جتنا وہ اٹھا سکے۔ بے شک زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے مگر حیثیت تو دیکھنی پڑتی ہے۔ خود سوچو کہ ایک سال نوکری کر کے اس کی سیونگ شاید ایک ڈیڑھ لاکھ ہے۔ زرش اس کی بیوی بن گئی تو ظاہر ہے اس کا خرچ بڑھ جائے گا۔ مجھے بتاؤ کہ تیس لاکھ جمع کرتے ہوئے اس کی عمر کے کتنے سال جائیں گے، زندگی موت انسان کے ساتھ ہے خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ جائے، ادائیگی کی مہلت نہ ملے تو وہ یہ طوق گلے میں ڈالے کیسے خدا کے سامنے جائے گا؟ تو بہتر نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے آسانی پیدا کریں۔ چلو یہ سب ایک طرف، اگر تمہارا اس قسم کا کوئی ارادہ تھا تو تم پہلے مجھے بتا دیتے تاکہ میں اپنی جمع پونجی کا کچھ حساب کتاب لگا کر، بیٹھ کر تم سے بات کر سکتا۔ یوں بھری محفل میں بات بحث و تکرار تک تو نہ جاتی۔" وہ حد درجہ سنجیدہ نظر آ رہے تھے، لہجہ تھکن کی چادر اوڑھے ہوئے تھا، جیسے احسان کے حوالے سے ان کا خلوص، ان کے جذبات، ان کی محبت سب رائیگاں ہو گیا ہو۔ ہادی کے دل کو کسی نے جیسے چٹکی میں لے کر مسل دیا۔

"ابا جی! آپ یا میرے گھر والے اپنی جمع پونجیوں کا حساب میرے نکاح کے حق مہر کی ادائیگی کے لیے کیوں لگاتے پھریں، شادی میں کر رہا ہوں ناں تو میری جمع پونجی کا حساب ہونا چاہیے۔ ساری عمر آپ نے رزق حلال کمایا اور سب کچھ ہمارے مستقبل پر خرچ کر دیا۔ آج میرے پاس ایم ایس سی کی ڈگری ہے، یہ میں ہاتھ میں لے کر تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ چچا جان میرے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپے ہیں اور میں ان ہی کے عوض نکاح کر سکتا ہوں اس کے علاوہ میری نیت اور میرے اللہ کی ضمانت کے بغیر میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"دیکھا چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے، تمہاری نیت کی سچائی کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے ناں؟ اگر مستقبل میں تمہارا میری بیٹی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو لکھ دو جتنا میں کہہ رہا ہوں۔" اب چچا احسان لحاظ کی رہی سہی چادر اتارے، اپنے ازلی تیکھے چتون کے ساتھ سب کے سامنے تھے۔

"آپ زیادتی کر رہے ہیں چچا جان!"

"دیکھا بھائی صاحب! آپ کے بیٹے کے تیور؟ مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے مگر اس پر نہیں۔ اسے نکاح میری شرائط پر ہی کرنا ہو گا۔" انعام صاحب کیا بولتے گنگ رہ گئے، اپنے بیٹوں جیسے بھائی کا یہ روپ اور وہ بھی تمام رشتہ داروں کے سامنے، انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ انہوں نے وہاں موجود لوگوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور اسی میں بہت کچھ واضح ہو گیا۔ کسی نظر میں ترس، کسی نگاہ میں تضحیک اور کسی آنکھ میں زہر میں بجھا دلاسا۔ زندگی میں کسی موڑ پر انہوں نے خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا، ہادی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"چچا جان! میری نیک نیتی کو آپ نے روپوں کے ساتھ مشروط کر دیا ہے، میری ظاہری معذوری سے آپ میری نیت جانچ رہے ہیں؟ تو آپ اپنی نیک نیتی کا ثبوت کیسے دیں گے۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تو میں آپ پر کیسے کر سکتا ہوں؟ میرے ساتھ آپ کا سابقہ رویہ آپ کی سوچ کا گواہ ہے۔ میں تیس لاکھ حق مہر لکھ دیتا ہوں مگر آپ کی

ضمانت کون دے گا کہ آپ مجھے اور میرے خاندان کو محض تنگ کرنے کے لیے یا تیس لاکھ کی وصولی کے لیے بیٹی کو طلاق دلوا کر گھر نہ بٹھا لیں گے؟" ابا نے تڑپ کہ بیٹے کو دیکھا، یہ کیا بات کردی تھی اس نے؟ خجالت سے چچا احسان کی رنگت سرخ پڑ گئی۔ وہ چند لمحے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتے رہے، پھر بڑے کروفر اور تکبر سے کھڑے ہوئے۔

"دکھادی نا اپنی اوقات...... شکر ہے نکاح سے پہلے ہی تمہاری اصلیت کھل کر سب کے سامنے آ گئی۔ بھائی صاحب اس بے غیرت بیٹے کو ساتھ لیں اور یہاں سے نکل جائیں۔ میں بیٹی والا ضرور ہوں لیکن اتنا مجبور نہیں جتنا تم لوگ سمجھ رہے ہو۔"

"میں بھی مرا نہیں جا رہا آپ کی بیٹی سے نکاح کرنے کے لیے۔" ہادی کی طرف سے فوری ردعمل آیا تھا۔ انعام صاحب نے آگے بڑھ کر بھرے مجمع میں ہادی کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔

"تم بیٹھو احسان اور مولوی صاحب سے کہو نکاح شروع کروائیں، جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ میں اپنی بھتیجی کو بیاہ کرلے جاؤں گا چاہے اس کے لیے مجھے خود اپنی اور اپنے خاندان کی بولی ہی کیوں ناں لگوانی پڑے۔" چہ میگوئیوں آوازیں یک لخت رک گئی تھیں۔ جیسے اسٹیج پر ہونے والے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے جا رہا ہو۔

"لیکن میں کسی کی گھٹیا سوچ، گری ہوئی ذہنیت کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکوں گا۔ اگر نہیں ہم پر اعتبار نہیں تو نہ سہی۔" ہادی نے گلے میں پڑی پھولوں کی مالا طیش سے میز پر پھینک دی۔ بہت سے لوگ دونوں کو سمجھانے، بجھانے کے لیے آگے بڑھے، عورتوں تک بھی خبر پہنچ گئی۔ اس ناقابل یقین صورت حال نے اپنی اپنی جگہ ہر انسان کو حیران و پریشان کردیا تھا۔ کچھ لوگ نیک نیتی سے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کررہے تھے، ہادی اور احسان چچا کو خاندان کے بڑے بوڑھوں نے الگ الگ لے جا کر سمجھایا مگر وہ دونوں اپنے اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف نینوں میں پی کی سنگت کے خواب سجائے، سجی سنوری زرش کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ حالت نزع میں ہو۔ انعام صاحب نے بھائی اور بیٹے دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑے پر سب بے سود۔ یوں سرعام تماشا بن جانے سے ہادی کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہوگئی تھیں۔

"تمہاری اکڑ کی تو ایسی کی تیسی۔ تم دیکھو میں تمہارے غبارے سے کیسے ہوا نکالتا ہوں۔ میری بیٹی آج، ابھی اسی وقت باپ کے گھر سے رخصت ہوکر جائے گی۔ اپنے باپ کی اولاد ہو تو ادھر ہی کھڑے ہو کر دیکھو۔" احسان چچا ہانپتے کانپتے چچی جان کو ساتھ لیے ہال کے ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ چچی جان مسلسل آنسو بہائے جا رہی تھیں، دو چار لوگوں سے اور مشورہ کیا گیا اور پھر سب کے سامنے زرش کا نکاح ہاؤس جاب کرتے اس کے ماموں زاد ڈاکٹر ولید کے ساتھ کردیا گیا اور یہ نکاح ڈیڑھ لاکھ کے عوض کیا گیا تھا، جھٹ پٹ میں وہ زرش کو لے کر رخصت ہوگئے۔

"بدھو صاحب! اب اپنے ان ٹٹ پونجیوں کو لیے لوٹ کر گھر جائیں۔" زہر خند لہجے میں بولتے ہوئے احسان چچا نے اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر حقارت بھری نظر ڈالی۔ ہادی کا حال تو یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"احسان بھائی! یہ ٹٹ پونجیے بھی بیٹے کو بیاہ کر ہی گھر میں قدم رکھیں گے۔" خدیجہ بیگم نے اپنے سر سے چادر اتار کر بہنوئی کے قدموں میں رکھ دی اور آس بھری نظریں ان کے چہرے پر جمادیں۔ انہوں نے جلدی سے چادر اٹھا کر خدیجہ کے سر پر ڈالی۔ چند لمحے سر جھکائے شرمندہ سے کھڑے رہے اور پھر آگے بڑھ کر گڑیا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹا! اگر اولاد چاہے تو والدین کا سر فخر سے بلند کردے اور اگر چاہے تو سر اٹھانے کے قابل بھی نہ چھوڑے۔ میرا رب تم سے راضی ہوگا۔" اور

وہ...... وہ تو آنکھیں پھاڑے خاموش تماشائی کا کردار ادا کررہی تھی۔ اس سارے ڈرامے میں اگر اسے کسی چیز کی پروا تھی تو وہ تھے ہادی بھائی کے جذبات۔ زرش کے لیے ان کی خالص محبت۔ یہ بھلا اس سے کس بات کا تقاضا کیا جا رہا تھا؟ بابا جان کا رب گڑیا سے کیوں راضی ہوگا؟ وہ ہونقوں کی طرح باپ کو دیکھنے لگی۔

"بیٹا! ہادی ایک نیک دل انسان کا باکردار بیٹا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کی نیت میں فتور نہیں تھا تو وہ کیوں خالی جھولی لیے گھر لوٹے؟" بات سمجھ میں آجانے پر وہ باپ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"آپ کو جو مناسب لگے بابا جان!"

"میں نے تمہیں اللہ کے سپرد کردیا۔" انہوں نے مریم کا ہاتھ خدیجہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسرا نکاح بھی وہیں، سب کی موجودگی میں پانچ لاکھ حق مہر کے عوض پڑھایا گیا اور یہ مہر طے کرنے والا گڑیا کا باپ نہیں انعام صاحب تھے۔ ہادی اپنے حواس میں نہیں تھا اس نے نکاح تو کرلیا لیکن رخصتی کے لیے والدین سے کچھ مہلت مانگ لی اور یہ شاید سب کے لیے مناسب ترین بات تھی۔ ان دونوں کو اس نئے رشتے کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے اپنی اپنی جگہ وقت درکار تھا۔ ہادی کی انا، اس کا پندار محض گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے تک سلامت رہا، وہ دہلیز پار نہیں کرپایا تھا کہ اس کا نروس سسٹم بریک ڈاؤن ہوگیا۔ انعام صاحب کا اونچا لمبا بیٹا کسی کٹے شہتیر کی طرح زمین پر جا پڑا تھا۔

خزاں نے تو فقط ملبوس چھینے تھے درختوں سے
صلیبیں بھی تراشے گی بہاراں، ہم نہ کہتے تھے
جیسا میلہ لگا ہے ناصحوں کا غم گساروں کا
وہی ہے کوچۂ بے اعتباراں ہم نہ کہتے تھے
پس زنداں کوئی ہوگا سر مقتل کوئی ہوگا
بنے گی اس طرح تصویر یاراں، ہم نہ کہتے تھے

☆☆☆

"کیا تمہیں پتا ہے اسے کیا تکلیف ہے؟" وہ ہادی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ہاں جانتی ہوں سب جانتی ہوں۔" آواز تھی یا فقط سسکی۔

"مگر میری اذیت کو کون سمجھتا ہے، کسے معلوم کہ پل پل مرنا کیا ہوتا ہے؟ کیا میں نے کہا تھا کہ یوں، اس طرح زبردستی مجھے اس کے گلے میں باندھ دیا جائے۔ میں انسان نہیں تھی؟ میرے جذبات، میرے احساسات کو کیسے سب نے کچل دیا۔" دو جلتے ابلتے آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔ مقابل کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں میں اپنی چبھتی نظریں گاڑے بولا تھا۔

"اچھا، واقعی......؟" کیسی تیر برساتی نگاہ تھی، مریم کا کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ "سنو! میرے سامنے یہ مظلومیت کا ڈرامہ رچا کر اور میں، میں کا ڈھول پیٹ کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش مت کیا کرو۔" لہجے سے ٹپ ٹپ زہر ٹپک رہا تھا۔

"یوں تو اسے جاننے اور سمجھنے کا بڑا دعوا کرتی ہو تو پھر احساس کیوں نہیں ہوتا کہ یہ کس طرح ہر گزرتے دن کے ساتھ موت کے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔"

"ہاں تو کیا کروں میں؟" وہ پھٹ پڑی۔ "جو بن پڑ رہا ہے وہ کر تو رہی ہوں۔ بھوک، پیاس، نیند، عزت نفس سب کچھ تو تیاگ دیا ہے اور کیا کروں؟ کیسے بچاؤں اسے؟ کیسے ساتھ دوں؟ انسان ہوں خدا تو نہیں ہوں۔" وہ زخم خوردہ تھی۔

"میں کب کہہ رہا ہوں، تم خدا ہو۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا اپنی ناکامیوں میں خدا کو کیسے کھینچ کر لے آتے ہو۔ تم سب مظلوم ہو اور تمہیں اس قدر تکلیف دینے میں خدا کا سب سے بڑا ہاتھ ہے...... ہے ناں؟"

"بالکل اس سے کون انکار کرسکتا ہے، کیا یہ تقدیر نہیں تھی؟ اور تقدیر لکھنے پر کون قادر ہے؟ اگر وہ

چاہتا تو یہ سب نہ ہوتا۔"

"ہاہاہا......" وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"تم جلدی سے بات یہ تو کہہ لیتے ہو، ہم انسان ہیں خدا نہیں۔ تقدیر خدا لکھتا ہے، بتاؤ تو ذرا تقدیر پر چھوڑتے کیا ہو؟ مقدر کو مانتے ہو؟ قسمت کی وجہ سے احسان صاحب کی بھری برادری میں بے عزتی ہوئی، بولو کیا خدا نے اسے کہا تا کہ ناجائز مطالبات کرو، کسی کے کندھوں پر اتنا بوجھ ڈالنے کی کوشش کرو جسے وہ اٹھا نہ سکے پھینک دے؟ کیا خدا نے "اسے" یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ بیٹی نہیں دیتے تو نہ دو میں اپنی خاندان پر بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ اب یہ کیا کررہا ہے؟ اس سے زندہ تو رہا نہیں جارہا اور کیا کرے گا اور وہ زرش...... وہ بھی سب سے زیادہ الزام خدا پر دھرتی ہوگی۔ سب جانتے ہیں کہ بات مہر کی نہیں اس تعصب کی تھی جو احسان صاحب ہادی سے برتتے آئے ہیں۔ لمحے میں قیامت آتی دیکھ کر کیا وہ باپ سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ آپ نرمی دکھائیں، میں ہادی کے علاوہ کسی کو قبول نہیں کروں گی۔ اس کا باپ ولی بھی تھا وکیل بھی، اس میں کوئی شک نہیں لیکن اگر وہ اپنے حق مہر کا فیصلہ کرنا چاہتی تو اسے کون سا قانون روک سکتا تھا۔ کیا وہ خود ہادی کی محبت سے آگاہ نہیں تھی؟ اور تم مریم...... معصومیت کے ریکارڈ توڑنے والی۔ کیوں چند جذباتی بولوں کو خود پر حاوی کر کے نکاح پڑھنے پر رضا مند ہوئیں؟ اب روتی ہو کہ میری پروا نہیں کسی کو۔ کیا تم نے خود اپنی پروا کی؟ اپنے جن احساسات کی تم بات کرتی ہو وہ کیا ہیں۔ میری آنکھوں میں دیکھو، تمہیں اپنا باطن بہت صاف اور شفاف دکھائی دے گا، دیکھو اس آئینے کی طرف اور بتاؤ کیا تمہارے دل میں ہادی کے لیے صرف ہمدردی، غم خواری اور دوستی کے جذبات تھے؟ اگر ایسا ہے تو پھر "خود" پر پاؤں کیوں نہیں رکھا جارہا۔" مریم نے سٹپٹا کر نظر جھکالی۔

"تم تو اس کی رگ رگ سے واقف ہو، جانتی ہو کہ اسے کون سا مرض لاحق ہے پھر وہ کون سی وجہ ہے جو تمہیں آگے بڑھ کر اس مرتے ہوئے انسان کی زندگی بچانے سے روک رہی ہے؟ دیکھو اس کی زرد رنگت اس کے دل کو احسان جونک بن کر چمٹ گیا ہے۔ اسے دیکھو، غور کرو، سوچو یہ نیم مردہ انسان تم سے کیا کہہ رہا ہے؟ اس کی ذات کی اونچی فصیلوں سے ٹکراتی صداؤں پر کان لگاؤ۔ کیا فائدہ اسے دوائیں پلانے اور ساری رات اس کے سرہانے بیٹھے رہنے کا، یہ تو کوئی پروفیشنل انسان بھی کرسکتا ہے۔ کمائی پیسوں سے خریدی ہوئی نرس، کوئی جذبات سے عاری ڈاکٹر...... تمہارے ہاتھوں تو کوئی کمال نہیں ہورہا۔ ایک مریض تمہاری سپرداری میں دیا گیا ہے تو ثابت کرو کہ تم دست ہنر نہیں دست شفاء رکھتی ہو۔"

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

(اے ناداں طبیب! میرے سرہانے سے اٹھ جا کیونکہ عشق کے بیمار کا علاج محبوب کے دیدار کے سوا کچھ نہیں) وہ گنگنا کر پھر مسکرادیا۔

"اور مائی ڈیئر! تم اپنے غم کو واقعی اپنا مقدر سمجھتی ہو تو پھر اسے خاموشی سے تسلیم کرلو۔ یہ واویلا کس سلسلے میں؟" وہ برف کی سل کی طرح منجمد بیٹھی تھی لیکن اندر کہیں قطرہ قطرہ پگھل بھی رہی تھی۔ وہ یوں ہی اس کے سامنے آتا تھا، بالکل ایسے کہ اس کے وہم و گمان کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی، وہ جتنا اس کے سامنے تعمیر ہونا چاہتی وہ اتنا مسمار کردیتا۔ وہ اس کے ساتھ زندگی سے کہیں دور، خوابوں کی وادیوں میں سفر کرنا چاہتی مگر وہ تلخ حقائق کی گتھیاں سلجھانے بیٹھ جاتا۔ وہ اسے صرف اپنا دیکھنا چاہتی تھی' وہ پل دو پل کے لیے اس کا بنتا پھر جھٹ سے اپنائیت کی قید و بند سے آزاد دور کھڑا اسے چیلنج کرتا ہمت ہے تو یہاں تک آؤ، وہ لڑکھڑاتی، اٹھتی، گرتی، دوبارہ چل پڑتی اور یہ اس کی جانب مریم کا سفر شاید مریم کی محبت تھا۔



ہادی کو کچھ دنوں کے لیے ہسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا تھا اس کے بعد انعام صاحب دونوں کو واپس لے آئے تھے۔ اس پرفضا پہاڑی مقام کی آب و ہوا نے ہادی کے دل و دماغ پر رتی بھر بھی خوش گوار اثر نہیں ڈالا تھا، الٹا معاملہ پہلے سے زیادہ بگڑ گیا تھا۔ نکاح والے دن ڈپریشن کے شدید حملے سے نکلنے پر وہ اس نے خود کو بہتر کرنے کی کچھ شعوری کوشش کی تھی لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹتی تھی۔ دو ماہ بعد انعام صاحب مریم کو سادگی سے رخصت کروا کر گھر لے آئے۔ مریم زرش نہیں تھی' زرش کی خالی جگہ کو پُر کرنے آئی تھی۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا، کوئی کیسے سمجھ سکتا کہ زرش کی خالی جگہ کوئی نہیں پر سکتا۔ وہ سوچتا تو اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو ہوجاتیں۔ اس کے روئیں روئیں نے تو بس اس ایک انسان کے سامنے دست چاہت دراز کیا تھا۔ کوئی آس کے دیے جلائے کسی در پر سوالی بنا رہے اور پھر یوں نامراد ٹھہرے، ایسے دھتکار دیا جائے۔ کیا آس کی جوت جگائے رکھنا اتنا آسان ہوتا ہے۔ ان چراغوں کو آندھیوں، طوفانوں سے بچائے رکھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہوتی؟ اور پھر سوالی ہونا...... آہ کیا خواری ہے یہ بھی۔ ہادی کے کاسۂ دل کا نصیب کیا ٹھہرا تھا فقط ایک نظر۔ اس کے قلب سے روح کھینچ لینے والی ایک نظر، کیا کیا نہیں تھا اس ایک نظر میں جب وہ ولید کے ساتھ رخصت ہورہی تھی۔ وہ سر تا پا ہادی کے نام پر سنواری گئی تھی' اس کے ہاتھوں کی مہندی اس کے روپ سنگار میں ہادی کی گزشتہ تمام عمر کے بے ریا جذبوں کا رنگ کھلا تھا، وقت کے چند لمحوں کی بے اعتنائی و بے وفائی سے ولید حق دار بن بیٹھا تھا۔ اتنی آسانی سے ایسا کیسے ممکن ہوگیا؟

قدرت کو ہم دونوں ترس کیوں نہیں آیا؟

گھڑی دو گھڑی کے لیے جب غصہ اس کے رگ و ریشے میں دوڑنے لگتا تو اس وقت اس کی چاہت ہوتی کہ وہ چچا احسان جیسے متکبر انسان کو نارمل شخص کی طرح زندہ رہ کر یہ دکھائے مگر یہ سب بہت تھوڑے وقت کے لیے ہوتا۔ اس سانحے نے ہادی کا دل مردہ کردیا تھا اور زرش کی وہ آخری نگاہ گدھ بن گئی تھی جو اس کے دل کا ماس دن رات نوچ نوچ کر کھاتی تو پھر وہ کیسے زندہ رہتا، وہ تو زندگی اور موت کے درمیان پنڈولم بنا جھول رہا تھا۔ مریم کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ خالی نظروں سے اسے دیکھتا، آنکھوں میں ذرہ برابر شناسائی کی رمق نہ ابھری۔ مریم کا خالہ زاد ہونا، اس کی ہمدردی، دوستی سب ہادی کی اجنبی نظروں کی دبیز تہوں تلے دم توڑ گئی تھی۔ اپنا مقام وہ کھو چکی تھی اور زرش کی جگہ اسے مل نہیں سکتی تھی۔ وہ دونوں خالی دامن، خالی ہاتھ تھے کاش ساحل پر ڈوبنے والوں کے درد کو ناپنے کا دنیا میں کوئی پیمانہ ہوتا، کوئی کسوٹی جس پر ان کی وحشت کو پرکھا جاتا تو شاید ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے چراغاں کیا جاتا ان کے نام کو چوم کر آنکھوں سے لگایا جاتا۔

ابا جان جوان بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر مٹی ہوجاتے۔ ماں کا کلیجہ پھٹتا رو رو کر ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ اٹھتے بیٹھتے دیور کو جھولی بھر بھر بددعائیں دیتیں۔ چھوٹے دونوں ہادی کو بھرپور کمپنی دینے کی کوشش کرتے، ہنسی مذاق، ان ڈورز آؤٹ ڈورز گیمز میں کھینچ کھانچ کر اپنے ساتھ لگالیتے، مگر بے سود۔ اس کے ڈپریشن کے دوروں کا وقفہ بڑھنے کے بجائے کم ہوتا جارہا تھا۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا زندگی سے، رشتوں سے غم اور خوشی کے ہر احساس سے لیکن کیا کیجیے کہ جب تک سانس کی ڈور وجود سے بندھی رہتی ہے، راہ فرار ناممکن ہے۔ کاش وہ منحوس گھڑی نہ آئی ہوتی جب وہ چچا احسان کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا تھا۔ کاش وہ اپنی باقی ساری زندگی کی طرح اس وقت بھی ان کی شرائط پر سر جھکا دیتا، گم گشتہ آوازیں اسے کچوکے لگاتیں۔ اس کا گھائل وجود زرش کو ملنے، اسے دیکھنے کے لیے فریادیں کرتا کیونکہ یہ درد اس اکیلے کا نہیں تھا یہ سانجھ کی ڈور سے بندھا ہوا تھا۔ اس درد کا ایک سرا ہادی اور دوسرا زرش کے دل کے ساتھ جڑا ہوا تھا تو

دل اس درد کے ساتھی اس رفیق کے لیے فریاد کناں تھا کہ شاید تکلیف کچھ قابل برداشت ہو۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوگی ہادی کتنا بزدل نکلا، پیسوں کے خوف سے اس سے دستبردار ہوگیا۔ وہ لوگوں کو بتاتی ہوگی دیکھو مجھ سے محبت کا دعوا کرنے والے کے ترازو میں پیسے کا پلڑا بھاری نکلا۔ کیسی ناقدری کی میری، کیسی کمینگی دکھائی۔ ہاں تو پھر اس جیسے کے ساتھ یہی ہونا چاہیے، نا بیچ چورا ہے اس کا تماشا لگنا چاہیے لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کر دیکھیں اور تنہائیوں میں روتی ہوگی، میرا ماتم کرتی ہوگی۔ مرد ہو کہ میرا یہ حال ہے تو وہ عورت ہو کہ کس مصیبت میں ہوگی۔ کاش زرش ایک بار سامنے آجائے تو وہ اس کے پیروں پر سر رکھ دے گا، وہ دل اور ضمیر دونوں کے بوجھ تلے دبا پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا مگر نجانے کیسا قحط پڑا تھا اس کے اندر کہ اس کی جلتی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ گرتا۔

☆❁☆

وہ اسے گرا ہوا دیکھ کر سامنے آجاتا تھا، اپنی موجودگی کا اظہار کرتا تھا۔ اسے کہتا اٹھو، ہمت کرو اور چلو۔ تھکن سے چور ہو کر، ٹھوکر کھا کر گر پڑنا انسان کی کمزوری ہے، بندہ بشر جو ہوا، مگر گرے نہ رہو، پھر رخت سفر باندھو، چلو یہ مالک کی رضا ہے اور خوش بختوں کی خوش بختی مگر وہ سہارا دینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا۔ دیا ہاتھ پر رکھ دیتا راستہ نہیں بتاتا تھا، وہ ہمدردی بٹورنے والی، عاجزانہ نظروں سے اسے دیکھتی۔ چلا چلا کر اسے بتانا چاہتی کہ میں کمزور جذباتی لڑکی ہوں، میرا دل گلاب کی پتیوں کی طرح نرم ہے، مگر اس کی ایک تیکھی ہنسی، کڑے تیور سب سوالوں کے جواب بن جاتے۔ جیسے کہہ رہا ہوں، اتنی کمزور نہیں ہو جتنا خود کو ثابت کرنے میں تلی بیٹھی ہو۔ زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہیں، کبھی کوئی گلاب زندگی کی جھلستی ہوا کے تھپیڑوں سے بچ پایا ہے؟ وہ روہانسی ہوجاتی۔

"کتنے کٹھور ہو تم، کتنے سنگ دل ہو۔"

"چھوڑو تم کیا جانو سنگ دلی کیا ہوتی ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ اس پر کوئی مرہم کارگر ثابت نہیں ہو رہا؟"

"ہاں کیونکہ وہ آپی زرش سے بہت محبت کرتے تھے۔"

"نہیں، کیونکہ اس کے زخموں کے منہ اس کے گھاؤ کھلے ہوئے ہیں۔" تشویش بھری آواز ابھری۔

"تمہیں صرف مرہم نہیں لگانا، تمہیں جراحی بھی کرنی پڑے گی۔ پہلے جراحت پھر مرہم۔ ایک بار تو اسے بہت درد ہوگا، اس سے کہیں زیادہ جتنا وہ اب برداشت کر رہا ہے، نجانے سہہ پائے گا یا نہیں لیکن اگر سہہ گیا تو جی جائے گا۔ خطرہ تو مول لینا پڑے گا نا۔" وہ خوف سے پیلی پڑ گئی، آنکھیں ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح برسنے لگیں، گود میں دھری بند مٹھیوں پر آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، وہ منتظر سا اسے دیکھتا رہا۔

"کیا جراحی کرنے والے ہاتھوں کے لیے یہ کام اتنا آسان ہوتا ہے، جتنا تم کہہ رہے ہو؟" وہ کافی دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

"جس اذیت سے انہیں گزرنا پڑتا ہے اس کا حساب کون دے گا اور پھر تب جب سامنے وہ شخص اور بتاؤ میں ہی کیوں، تمہیں صرف میں ہی نظر کیوں آتی ہوں۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔"

"سب اس کے خون کے رشتے ہیں اور سب اپنی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ گڑیا زخم کو وہی بھر سکتا ہے جو اس کی نوعیت سے واقفیت رکھتا ہے، گہرائی سے آگاہی رکھتا ہے۔"

☆❁☆

چند دنوں سے ہادی کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی تھی، وہ بازو سینے پر لپیٹے، بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے کھلی کھڑکی سے باہر خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے جانے کیا تلاشنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ فورتھ اسٹینڈرڈ میں تھا جب زرش کا ایڈمیشن اسی کے

اسکول میں میں کروایا گیا۔ یونیفارم کے پھولے فراک اور گلاب گالوں والی روئی، بسورتی گڑیا سی زرش، جو سارا دن اس کے پاس اپنے کلاس میٹس اور ٹیچرز کی شکایتیں لے کر آئی رہتی اور وہ سارا دن اس کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی میں لگا رہتا۔ وہ روز صبح اسکول جاتے وقت ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ چچی جانے اس سے وعدہ کرتیں کہ "بس وہ آج کے دن اسکول چلی جائے، کل سے اس کے اسکول کا نام بھی نہیں لیا جائے گا" اسکول میں جب بھی اسے اپنی کلاس سے بھاگنے کا موقع ملتا تو وہ ہادی کی کلاس میں گھس جاتی اور پھر سارا دن وقفے وقفے ہادی کے بازو سے لگی وعدے کی تصدیق چاہتی رہتی اور وہ یقین دلاتا رہتا، ویک اینڈ کی دو چھٹیاں چچی اور ہادی کی بدعہدی کا کچھ بھرم رکھ لیتیں۔ ایفائے عہد کے اسی مظاہرے کو یاد دلوا دلوا کر اگلا سارا ہفتہ معصوم زرش کے ساتھ وہی روٹین دہرائی جاتی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا جیسے خلا میں بھٹکتی اس کی نگاہوں کو ٹھہرنے کی کوئی وجہ مل گئی۔

"واہ بھئی اکیلے اکیلے مسکرایا جا رہا ہے ہم سے بھی شیئر کریں۔ سنا ہے خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔" زندگی سے بھرپور اجنبی مردانہ آواز پر ہادی نے سر گھما کر دیکھا، چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ دماغ بھی تو دواؤں کے زیر اثر تھا، مگر اس اجنبی کے عقب میں جو نظر پڑی تو وقت جیسے تھم گیا۔ اس چہرے کی تاثیر پر کوئی دوا اثر انداز نہیں ہو پائی تھی۔ درد کی بوندیں عین دل سے ٹپ ٹپ ٹپکنے لگیں جیسے جاڑے کی رات میں چھما چھم بارش ہو اور کسی مفلس کی چھت ٹپکنے لگے۔ یہ تو زرش تھی، سرخ ساڑھی، گولڈن کی لائٹ سی جیولری اور ہلکا میک اپ۔ وہ موسم بہار کا کھلا ہوا گلاب لگ رہی تھی، ایسا گلاب جس کو صرف بہار رت کے جوبن، اپنی مستی اور بے خودی سے سروکار ہوتا ہے جسے بس مہکتی فضاؤں، چھیڑ خانی کرتی ہواؤں میں جھومنے سے مطلب ہوتا ہے۔ وہ جس ٹہنی کے سر پر تاج کی طرح ناز آفریں سجا، پرشوق نگاہوں کا رزق بٹور رہا ہوتا ہے اس کی مشقتوں سے ناواقف اور بے نیاز ہوتا ہے، کیونکہ اس کا رخ آسمان کی طرف ہوتا ہے، اسے جھک کر اپنی حقیقت کو دیکھنا ہی نہیں آتا۔ زرش کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ اور آنکھوں میں تضحیک ہلکورے لے رہی تھی۔

"نہیں...... یہ زرش نہیں ہے۔" اس نے ڈوبتے دل کو تنکے کا سہارا دینا چاہا لیکن نہیں دل تو پاتال میں اترا جا رہا تھا۔

"آئیں، ولید بھائی بیٹھیں۔" مریم جلدی سے آگے بڑھی، ولید بے تکلفی سے بیڈ پر ہادی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"بھئی آپ کی صحت کافی گر گئی ہے، خیر تو ہے؟" ہادی خاموش رہا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں، دراصل ہم پہاڑی علاقے کی سیر کو نکلے ہوئے تھے تو وہاں کی سردی انہیں راس نہیں آئی۔ ٹائیفائڈ ہوگیا تھا۔"

"اوہو، وری سیڈ۔ نبض دکھائیں۔" اس نے آگے بڑھ کر ہادی کی کلائی پکڑلی۔ "ان کا بی پی کافی لو لگ رہا ہے۔ مجھے خبر ہوتی تو میں اپنا......"

"ارے نہیں ولید بھائی! اس کی ضرورت نہیں، آپ کو مریض چیک کرنے نہیں کھانے پر بلایا ہے۔ انہوں نے اب کافی ریکور کرلیا ہے۔ ڈاکٹر کے ساتھ آج کی اپائنٹمنٹ بھی ہے۔"

"اوکے، ویسے ہادی صاحب! آپ کی مسز بہت پرخلوص انسان ہیں۔ جو ہوا سو ہوا، جس کی جو قسمت میں تھا مل گیا۔ ایمان داری سے بتاؤں تو میں اپنے نصیب پر بہت خوش ہوں، کیوں مسز آپ کا کیا خیال ہے؟" اس کی پرشوق نگاہیں زرش کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ زرش کی تنی ہوئی گردن کچھ اور اکڑ گئی، اس نے اک ادائے بے نیازی سے ہادی کو دیکھا۔

"بالکل، اللہ نے مجھ پر بھی بڑا کرم کیا ہے۔ وہ بہتر سمجھتا ہے کہ کس کی جگہ کون سی ہے۔" لفظ آیا تھے

اور لہجہ کیا، کاٹ دار تفاخر بھرا۔ نیزے کی انی کی طرح دل میں گڑتا ہوا۔

"مریم! موصوف کی طبع نازک پر سیر کا بھاری بوجھ ڈال دیا تم نے۔ لگ تو یوں رہا ہے جیسے جان کے لالے پڑ گئے ہیں، ویسے پہاڑی علاقوں کی سردی کو وہاں کے رہنے والے ہی بھگت سکتے ہیں۔ ہم جیسے میدانی باشندوں کے بس کی بات نہیں، کیوں ہادی صاحب؟" ولید نے مسکراتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ہادی کے پپڑی زدہ ہونٹ پل بھر کو بے ڈھنگے انداز میں پھیلے۔ کھنچاؤ سے نچلا ہونٹ پھٹا اور خون کی ایک ننھی سی بوند نمودار ہوگئی۔ کیا اس کی آنکھوں کے سامنے جو یہ سارا منظر تھا، حقیقت تھا؟ اگر یہ حقیقت تھی تو کتنی جان سوز حقیقت تھی اور اگر یہ خواب تھا تو وہ باقی ساری عمر حالت بے داری میں رہنا چاہے گا۔

"ہم سوات کا ایک چکر تو شادی کے فوراً بعد ہی لگا آئے تھے اور لگتا ہے ہماری نصف بہتر کو وہ دن بھلائے نہیں بھول رہے، اب پھر بضد ہیں۔ تو جناب سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔" زرش کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

"اچھا بس زیادہ چڑھائیں نہ مجھے، آتے ہوئے آئس کریم تو کھلائی نہیں، کتنی دفعہ کہا میں نے۔"

"لیں مریم بھابھی! سنیں ذرا، میں آسمان پر جانے کے لیے کوئی سواری ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تاکہ تاروں کی کوئی منت سماجت کر سکوں کہ دیکھو یار اتنا بڑا آسمان اور تم لوگ ان گنت، کوئی سو پچاس ہی میرے ساتھ زمین پر چلنے کو تیار ہو جاؤ کیونکہ یہاں چمکنے سے زیادہ خوشی تمہیں میری منز کی ہتھیلی پر چمک کر ہوگی۔" مریم ہونق بنی کبھی ولید کے عالم شوق کو دیکھتی اور کبھی شاداں و فرحاں زرش کو۔

"اسے دیکھیں یہ ابھی تک آئس کریم میں پھنسی بیٹھی ہے۔" مریم نے ہادی کو دیکھا تو جیسے سننے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری کوئی مجسمہ ہو، اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"زرش آپی! کھانا تیار ہے، خالہ ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ عباد اور عماد نے "اب کھول بھی دیں کھانا" کا شور مچا مچا کر ان کی ناک میں دم کر دینا ہے۔ آپ پلیز آئیں، بقیہ باتیں کھانے کی میز پر۔"

"بھوک تو مجھے بھی بہت لگ رہی ہے۔ چلیں پھر میں بھی ان کے سُر کے ساتھ سُر ملاتا ہوں۔" ولید سب سے پہلے دروازے کی جانب بڑھا اس کے بعد مریم اور سب سے آخر میں زرش، پر وہ کمرے سے نکلنے کے بجائے الٹے قدموں مڑ گئی۔

"سنو! یہ ڈھونگ کیوں رچائے بیٹھے ہو؟ کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ اس وقت تو چند روپوں کے لیے میرے باپ کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ولید کو دیکھو، تم جیسا مرد ہی ہے مگر مجھ پر اپنی کمائی لٹاتے ہوئے ایک لمحہ بھی نہیں سوچتا۔ سچ یہ ہے کہ تم میرے قابل ہی نہیں تھے۔" یہ لفظ نہیں تھے، انہیں الفاظ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ زہریلے ناگ تھے جو وہ ہادی پر پھینک چکی تھی، مریم جانتی تھی کہ زرش کمرے سے باہر نہیں آئی لیکن وہ اسے بلانے واپس نہیں مڑی۔ کیسے مڑتی اسی نے تو ہر قسم کے نتائج سے بے خوف ہو کر اس "ملاقات" کا انتظام کیا تھا۔

یہ وہ چہرہ تھا جو ہادی کی نظر میں سمایا تھا تو اس کی کائنات بدل گئی تھی، اس کے ظاہر و باطن کا جہان بدل گیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا، یہ زرش نہیں ہو سکتی۔ وہ کتنا تڑپتا تھا اسے محض ایک بار جی بھر کے دیکھ لینے کے لیے۔ وہ اب بھی تڑپ رہا تھا ماہی بے آب کی طرح، یہ جو اس کے سامنے تھا یہ تو حقارت کے باعث مسخ شدہ چہرہ تھا۔ کیسا ستم تھا وہ اس کے سامنے بھی تھی، وہ پھر بھی اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ اذیت اس تکلیف سے کئی گنا زیادہ تھی جو وہ پچھلے ایک سال سے بھگت رہا تھا، وہ تو بہت خوب صورت تھی، یہ کوئی اور ہے غالباً یہ اس کی سیاہ بختی ہے جو زرش کا روپ دھارے کھڑی ہے۔ ہادی کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے، سب کچھ گڈمڈ ہو رہا

تھا۔ کچھ ڈوب ابھر رہا تھا، کچھ لوگ دل میں بستے ہیں تو انسان گل و گلزار ہو جاتا ہے مگر وہ اس کے دل میں اتر کر اس کا لہو زہر کر گئی تھی۔ محبت بھی شاید کوئی شطرنج کی بازی ہے جو بساط جاں پر کھیلی جاتی ہے۔

زرش کے کھانے کی میز پر پہنچتے پر مریم واپس بھاگی، وہ ہنوز اسی حالت میں تھا جیسے کوئی حنوط شدہ لاش مگر آنکھیں...... اُف...... اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وحشت زدہ خون رنگ آنکھیں، مریم کے پیر جکڑے گئے، وہ چند ثانیے خاموش کھڑی رہی۔

"آ...... آ...... آپ بھی کھانے کے لیے آ جائیں۔" ہادی کی حالت نے اسے ہکلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے یک لخت جھپٹ کر مریم کی کلائی تھام لی۔ اس کی اس اچانک حرکت پر مریم کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔

"مریم! تم بتاؤ ذرا...... تم تو میری گڑیا ہو نا، تم میرا ساتھ دیتی تھیں نا؟ تم میری محرم راز تھیں۔" مریم نے اثبات میں سر ہلا دیا، دل کو ایک خوش کن احساس نے گھیرے میں لیا تھا۔ دو گھڑی کے لیے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی خود فراموش کی نگاہوں میں کوئی شناسائی کا رنگ ابھرے۔ مریم کی آنسو اک تواتر سے اس کے گالوں پر لڑھکنے لگے۔

"تم تو سب جانتی ہوگی، مجھے صحیح بتاؤ...... یہ زرش نہیں تھی نا؟" مریم کا دل پھٹنے لگا۔ وہ اس سے یہ نہیں پوچھ رہا کہ یہ زرش ہی تھی نا۔ وہ تو اس سے یہ تصدیق چاہ رہا تھا کہ یہ زرش نہیں، یعنی کہ وہ اس کے زرش ہونے کے امکان کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ کیسا شکستہ لہجہ، التجا کرتی بھیک مانگتی نگاہیں تھیں۔ وہ اس کے سامنے جھولی پھیلائے منتظر تھا کہ اس کے پھیلے دامن میں مریم اس خوش فہمی کی بھیک ڈال دے کہ جو تماشا ہادی کی نظروں نے دیکھا وہ فریب تھا۔ کیا کیجیے کہ اس کم بخت محبت اور خوش فہمی کا چولی دامن کا ساتھ جو ہوا اور وہ جسے جراحت دل کا کام سونپا گیا تھا۔ ہادی کے زانوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی، ایک درد سے تڑپتے نیم جاں انسان کو وہ اور کچوکے کیسے لگائے۔ وہ تو دہری اذیت میں گرفتار تھی، پیر بھی شل تھے اور سفر پر بھی مجبور تھی۔

اٹھو ہمت پکڑو...... یہ ایک پل پل مرتے ہوئے انسان کی زندگی کا سوال ہے۔ اس کے اندر کوئی بولا تھا، تو کیا وہ اس تلخ حقیقت سے آشنائی کے بعد جی پائے گا؟ جواب میں پھر وہی بھید کے پردوں میں لپٹی ہنسی۔

"زندگی بڑی عجیب شے ہے ڈیئر! اس کا ادراک ہم جیسے معمولی، دنیا دار لوگوں کو نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے یہ مر جائے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کے دل پر اپنا کرم نازل کرے اور یہ سنبھل جائے۔ دونوں صورتوں میں سے جو بھی ہو یہ بے چارہ اس جان کنی کی حالت سے تو نجات پائے گا۔ اسے اس ابہام، اس دھند لگے سے تو باہر نکالو۔ سچ تو روز روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے، تم کب تک چھپا سکتی ہو۔" وہ بلک بلک کر روتی گئی، دل و دماغ کے صفحات پر جیسے کوئی اندوہ ناک مرثیہ لکھا جاتا رہا۔ کچھ دیر بعد مریم نے سر اٹھایا، اپنی آنسو ہتھیلی کی پشت سے بے دردی سے رگڑ کر صاف کیے۔ وہ خاموش، منتظر اور حیرت زدہ اسے دیکھے جا رہا تھا، آنکھوں میں وہی تحریر چھپی ہوئی تھی۔

"کیا آپ کو مجھ پر اعتبار ہے؟" وہ سراپا سوال بن گئی۔

"ہاں مجھے تم پر اعتبار ہے۔" وہ بے صبری سے بولا، جیسے جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہو۔ وہ بوجھل پلکوں کا بار اٹھائے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"تو پھر مان لیں کہ وہ آپی زرش ہی ہیں۔ کوئی خواب یا نظر کا دھوکا نہیں، مان لیں کہ آپ کی زندگی، خوشی یا غم سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ محبت کو نہیں جانتیں، جس جذبے کو زندگی دینے کے لیے آپ اپنی سانس گروی رکھ کر بیٹھے ہیں وہ اس سے ناواقف ہیں۔ انہوں نے شاید محسوس ہی نہیں کیا تو قدر کیا

کرتیں۔ لگتا تو یوں ہے جیسے انہیں محبت کی نہیں صرف خودستائشی کی ضرورت تھی۔ وہ آپ کی محبت کرتی یا ولید کی۔ تسلیم کرلیں کہ آپ اس پر پیچ راہ کے تنہا مسافر تھے، جو شخص اس خوش گمانی میں چلتا رہتا ہے کہ اس کا ساتھی اس کے ساتھ ہے اور ساتھی یوں ہوجاتا ہے جیسے کسی کو دعوت سفر دے کر کڑکتی دھوپ میں شجر آنکھیں چرا جائیں۔ سنا ہے محبت کرنے والے جدائی کے علاوہ کسی اور قیامت کے قائل نہیں ہوتے اور اس قیامت کے آثار صرف آپ کی ذات پر نظر آتے ہیں زرش پر نہیں۔ آپ جس آگ میں جل کر راکھ ہورہے ہیں وہ اس کی تپش تک سے بے بہرہ ہیں، الٹا ان کا تو یہ حال ہے کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ ان کے چہرے پر شکست وریخت کا کوئی نشان نہیں۔'' وہ بولنا شروع ہوئی تو پھر بولتی چلی گئی۔ ہادی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مخبوط الحواس شخص سراسیمگی کے عالم میں بیٹھا ہو۔

''سنو گڑیا...... کیا ہم روز محشر میں ہیں۔'' اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ گڑیا نے چونک کر دیکھا، یہ کیسا عجیب وغریب سوال تھا۔ ہادی نے اس کی آنکھیں پڑھ لیں۔

''ہم نے سن رکھا ہے نا کہ حشر میں کوئی کسی کا نہیں ہوگا سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔'' مریم کا دل چاہا وہ بھاگ جائے، کہیں جا کر چھپ جائے، جہاں کوئی زندگی کے امتحان کا سوال نامہ اس کے ہاتھوں میں نہ پکڑا سکے۔ یک لخت اسے شدید غصہ آنے لگا۔

''یہ حشر صرف آپ کے اندر برپا ہے، آپ کو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے اور نہ سجھائی۔ آپ کو یوں ٹوٹی بکھری حالت میں دیکھ کر آپ کے والدین کا دل کیسے خون ہوتا ہے، آپ کے بھائی کیا محسوس کرتے ہیں؟ ہم میں سے ہر انسان کیسے سولی پر ٹنگا ہوا ہے آپ کو رتی بھر احساس نہیں۔ سچ ہے کہ روز محشر کوئی کسی کا نہیں ہوگا سب کو اپنی پڑی ہوگی تو معاف کیجیے گا آپ کو تو اپنی بھی نہیں، میں آپ کا کھانا یہیں لے آتی ہوں۔'' وہ کمرے سے نکلنے لگی تو ہادی نے پھر آواز دے لی۔

''وہ کہاں ہے؟''

''کھانے کی میز پر چھوڑ کر آئی تھی۔''

''مجھے وہاں جانا ہے۔ مجھے ساتھ لے چلو، بلکہ یوں کرو مجھ سے دو قدم پیچھے رہو۔ میں لڑکھڑا جاؤں یا گرنے لگوں تو تھام لینا۔'' وہ ڈر گئی، کہیں کوئی تماشا کھڑا نہ ہوجائے۔ پہلے ہی زرش کو گھر بلانے کے لیے اسے کئی پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ منت سماجت کے بعد انکل انعام نے اجازت تو دے دی تھی لیکن خود وہ اس وقت دوست کی عیادت کا بہانہ بنا کر گھر سے باہر تھے۔ نامعلوم نتائج کیا ہوں گے، یہاں تو ساری بساط ہی الٹ گئی تھی۔ مریم کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ''خوف زدہ مت ہو کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ اس ٹوٹی بکھری حالت میں بھی اس کا خدشہ بھانپ گیا۔ جوش سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے اچانک اس میں خود اذیتی کی ہوس جاگ اٹھی تھی۔

☆❁☆

ہادی ایک بار پھر ہسپتال پہنچ گیا تھا، مریم کی حالت دگرگوں تھی جبکہ وہ مسلسل مسکرائے اور گنگنائے جارہا تھا۔ آج اس کی ہنسی بڑی خالص تھی اس میں کوئی طنز کوئی نشتر نہیں تھا۔ جیسے کسی کی روح کی شب فراق کٹ گئی ہو۔ وہ میٹھی آنچ دیتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، کیا تم پہلے سے جانتی تھی کہ زرش ولید کے ساتھ بہت خوش ہے۔ مریم کے تلووں لگی سر پہ بجھی۔ اس نے شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو ''بس یہی کسر رہ گئی تھی۔''

''آج کوئی اشارے کنائے نہیں، آج سیدھی کھری دوٹوک بات ہوگی۔''

''میں نہ جانتی تھی اور نہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کس حال میں ہے، وہ انسان جس سے آپ کے دل کی ڈور بندھ گئی ہو اسے اپنی ذات کے ویرانوں میں سے کھوج نکالنا کتنا آسان ہوتا ہے؟ اسے اس سرائے میں تلاش کرنا جہاں رکنا اس نے کبھی پسند ہی نہیں کیا۔ بس آیا تسخیر کیا اور چلا گیا، کسی انجانے راستے پر، کسی من چاہی منزل کی جانب اور میری بت پرستی کا معیار دیکھو مجھے در و دیوار پر محض اس کے سائے کے نشان میسر آئے۔ میں اپنے کورے جذبوں کے تھال سجائے، دل ونظر کو دار چڑھائے وہیں بیٹھ رہی۔ عورت محبت کا قلعہ تعمیر کرکے اس میں محصور ہوکر بیٹھ جانا چاہتی ہے شاید اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ وہ باہر کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، سب فراموش کردیتی ہے اور آخر کار اسی قلعے کی غلام گردشوں میں خود کو ختم کردیتی ہے یا اس کے ملبے تلے دب کر جان دے دیتی ہے جو بھی ہو اس عمارت کی بنیاد محبت کا دعوا کرنے والا مرد ہی فراہم کرتا ہے اور شاید تعمیر میں اس کا اتنا ہی حصہ ہوتا ہے اس کے بعد وہ حکومت کرتا ہے یا پھر منہدم کرتا ہے۔ میں وہ بد نصیب ہوں جسے اپنی محبت کی قلعے کے لیے بنیاد نہیں صرف نشاں میسر آئے۔ کسی اور کے لیے رکھی جانے والی بنیاد کے نشاں۔ ہادی کی بنیاد کے ساتھ زرش نے کیا کیا! یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے تو اپنے حصے کی حفاظت کرنی تھی، ہاں یہ سچ ہے کہ میں چاہتی تھی میرے حصے پر زرش کی نظر تو کیا اس کا سایہ بھی نہ پڑے۔'' مضمحل چہرہ، حد درجہ کمزور لہجہ، وہ مبہوت سا یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

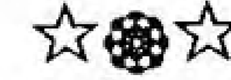
''وہ ہادی تک پہنچ کر تمہارا سراغ پالیتی اور پھر تمہیں بھی مجھ سے چھین لیتی تو پھر بتاؤ میں کیا کرتی...... تم میرے دل کی کل متاع ہو۔'' اشک پلکوں کی باڑیں توڑے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

''تمہارے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور تم ہی نے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا۔ مجھے اپنے دعوا محبت سے پیچھے ہٹنا قبول نہیں تھا اور مجھے لگتا ہے مجھے اس کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔ اسے کچھ ہوگیا تو ہوسکتا ہے تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ اور میں اپنے ضمیر کی عدالت میں کیا منہ لے کر جاؤں گی کہ میں ایک بیمار انسان کو تسلی دینے کے بجائے اور گھاؤ لگاگئی۔ میں ہرگز نہیں جانتی تھی کہ زرش کو

ہادی کی رتی بھر پروا نہیں ہوگی۔ میں تو خود کو ان دونوں کے راستے سے ہٹانے کا سوچ بیٹھی تھی، شاید اس سے بھی کہیں زیادہ۔ وہ خاندان میں جس جس گھر ملنے ملانے جاتی رہی، میں ڈرتی، ''ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی'' مریم کی سانولی رنگت اور اترے چہرے پر اسے ڈھیروں پیار آیا۔ کیا اس سے زیادہ خوب صورت چہرہ دنیا میں کوئی اور ہوگا۔ کیا کوئی اور کشش یوں جکڑ لینے کی صلاحیت رکھتی ہوگی؟ ''میں تم سے کیا شکوہ کروں، تم تو وہ ستم گر ہو جس نے مجھ سے میرے ہی قتل نامے پر دستخط کروائے ہیں۔''

''اتنی آزردہ کیوں ہو؟ جس سائے کی تم بات کررہی ہو تمہارے اخلاص نے ہی اسے متحرک کیا ہے، تمہارے جذبے کی سچائی نے تمہارے احساس کو تمہارے لیے آئینہ بنا دیا۔ محبت بھی تو وہی آئینہ ہے جس میں انسان اپنی اصلی شکل دیکھتا ہے، مجھے دیکھو میں محض سایہ نہیں، تمہاری نکھری ستھری محبت ہوں جو تم اس سے کرتی ہو۔ نشان صرف نشان نہیں ہوتے۔ نشان ہی تو رہنمائی کرتے ہیں، ان ہی سے تو حقیقت تک پہنچا جاتا ہے، ان ہی پر دھیان لگانے سے ہی تو اصلیت کے نہاں راز عیاں ہوتے ہیں۔ کیا نشان کا مل جانا بھی خوش قسمتی نہیں ہے؟ اور پھر اس پر جم کر بیٹھ جانا قسمت تراشوں کا شیوہ، کہ یہ خود بول کر منزل تک پہنچنے کا رستہ بتائیں۔'' ہادی کی محبت روز روشن کی طرح عیاں تھی مگر چمگادڑ کو روشنی سے کیا مطلب؟ دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ یہ تاثیر سخن، مگر آج سب رائگاں تھا۔ آج تو وہ اس مسکراہٹ کی دل فریبی سے بھی گریزاں تھے، جیسے کوئی بچہ اپنے کھلونے سے روٹھ کر بیٹھا ہو۔

وہ جو مریم کے روبرو تھا، مریم کا محرم راز۔ ہادی کا عکس، اس کا پرتو اس کا ہم راز۔ اس کا وہ روپ جس سے مریم نے محبت کی تھی اور نجانے کب سے کی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ پودا کب اور کیسے اس کے دل کی سرزمین میں پھوٹ پڑا اور جڑ پکڑتا گیا۔ گڑیا کی محبت تو اس وقت سن شعور کو پہنچی تھی جب اس سے نکاح کے بول پڑھوائے جارہے تھے۔



وہ ستون سے ٹیک لگائی آسمان کی وسعتوں میں کھوئی ہوئی تھی، زرد رتوں میں کھلے ہوئے پھول کی طرح اداس، تھکی ہاری خود سے لاتعلق جیسے کوئی ضبط اور انتظار کے حصار میں مدتوں بھٹک بھٹک کر تھک چکا ہو۔ ہادی نے دیکھا تو حیران رہ گیا، اس کی کیا حالت ہو رہی تھی، یہ تو وہ گڑیا تھی ہی نہیں جسے وہ جانتا تھا۔ اس کی ذات کا شوخ اور چلبلا پن کڑکتی دھوپ میں خشک ہوتے کپڑے کی طرح بدرنگ ہو رہا تھا۔ وہ پہلے کیوں نہیں دیکھ پایا؟ مگر دیکھتا کیسے، اس پر تو جیسے نظر بندی کا عمل ہوا، ہوا تھا۔ ٹوٹا تو کچھ دکھائی دیتا، مریم کو دیکھ کر ہادی کو ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا جیسے خود پر نظر پڑ گئی ہو۔ اس کا دل گہرے درد اور ناقابل فہم اذیت سے پُر ہوگیا۔ وہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر زرش اور مریم کا موازنہ کرنے لگا۔ ملمع شدہ زرش اور ظاہر و باطن میں اجلی مریم، یہ قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ وہ اپنے انمول جذبے ایک پیتل کے دل، جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا، پر بے دریغ لٹا گیا تھا۔ وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کیسے کرتا، محبت تو ہوتی ہی کھری ہے اور کھوٹ سے وہ واقف نہیں تھا۔ وہ گڑیا کے اترے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ ولید کی ہم سفری میں مہکتی زرش اور ہادی کے زیر سایہ مرجھائی مریم۔ وہ شرمسار ہوگیا، کوئی کیسے فیصلہ کرے گا کہ اس دن کون بد نصیب ٹھہرا اور کون خوش قسمت، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گڑیا کے قریب آ گیا۔

''آسمان پر کیا کھوج رہی ہو؟ آسمان والا تو خود سچے دلوں کی تلاش کے لیے زمین کی طرف دیکھتا ہے۔'' گڑیا نے چونک کر ہادی کو دیکھا، وہ مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ تو...... اس کے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔

''باہر ٹھنڈ بڑھ گئی ہے اور اوس بھی پڑنے لگی ہے، چلو اندر چلیں۔'' ہادی نے اپنا بازو مریم کے شانوں پر پھیلا دیا۔



نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھی، وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اس قدر تیز وطرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔

حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں، ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

ساتویں قسط



ناشتے سے فارغ ہوتے ہی خزینہ اور شہرینہ معمول کے کاموں میں لگ گئیں۔ کیونکہ آج انہیں شاپنگ پر جانا تھا۔ رات خزینہ نے پوری لسٹ بنالی تھی۔ جو کہ چند فینسی سوٹ اور باقی روزمرہ کے پہننے والے سوٹ اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء پر مشتمل تھی۔ وہ چاہتی تھی آج کی تاریخ میں یہ کام نمٹالے...... کیونکہ اب چند دن ہی رہ گئے تھے۔ شہرینہ کچن میں مصروف تھی۔ وہ جھاڑ پونچھ میں لگ گئی۔ اس کے بعد اپنے ساتھ شہرینہ کا سوٹ بھی پریس کردیا۔ پھر نہاکر نکلی تو شہرینہ کمرے میں آتے ہوئے بولی۔

"کھانا تیار ہے۔"

"چلو میں کھانا لگاتی ہوں تم جلدی سے نہالو۔" اس نے شہرینہ کا پریس کیا ہوا سوٹ اٹھا کر اسے تھمایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"ارے تم نے میرا بھی سوٹ استری کردیا۔"

"یہ احسان ساری زندگی یاد رکھنا۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل آئی اور حمیدہ بیگم کے کمرے میں دستر خوان لگادیا۔

"شہرینہ کہاں ہے؟" حمیدہ بیگم نے پوچھا تو وہ پلیٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"آرہی ہے امی! آپ شروع کریں۔"

"اتنی جلدی تم نے کھانا لگادیا۔ ابھی بھوک بھی نہیں ہے۔" حمیدہ بیگم سالن کی ڈش کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے سالن نکالیں نہ نکالیں۔

"شاپنگ میں دیر ہوجائے گی اس لیے میں نے سوچا کھانا کھاکر ہی نکلیں۔ آپ کو کچھ منگوانا ہو تو بتادیں۔"

"نہیں تم بس اپنی تیاری کرلو اور دیکھو احتیاط سے جانا آنا حالات کا تمہیں پتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں حمزہ کو ساتھ لے لو۔ سر پر سائبان نہ رہے تو عورت ایسے ہی خائف ہوجاتی ہے۔" یہ وہی حمیدہ بیگم تھیں جو دنیا کو ٹھوکر پہ رکھتی تھیں۔

"حمزہ اس وقت کہاں ملے گا امی۔ ہاں البتہ واپسی میں دیر ہوئی تو میں اسے فون کردوں گی وہ آفس سے وہیں آجائے گا۔" اس نے کہا تو شہرینہ سنتی ہوئی آگئی۔

"کون آجائے گا؟"

"کوئی نہیں، چلو جلدی کھانا کھاؤ۔" وہ کہہ کر خود بھی کھانے میں مصروف ہوگئی۔

پھر حمیدہ بیگم کی ڈھیروں ہدایات سنتے ہوئے دونوں گھر سے نکلی تھیں۔ وسط مئی کی گرم ترین دوپہر میں رکشا ٹیکسی کے لیے کھڑے ہونا عذاب تھا۔

"کیسی پاگل ہو تم! غزنی بھائی سے کہتی گاڑی بھیج دیتے۔" شہرینہ نے جھلا کر کہا۔ وہ ان سنی کرکے دور سے آتے رکشا کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی اور جیسے ہی رکشا قریب آکر رکا وہ فوراً شہرینہ کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی اور رکشا والے کو جس شاپنگ مال چلنے کو کہا شہرینہ حیرت سے آواز دبا کر بولی۔

"اتنا مہنگا مال ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ اب میں افورڈ کرسکتی ہوں۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر مسکرائی تھی۔

"او...... میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم غزنی انٹرپرائز کے اونر کی مسز بننے جارہی ہو۔" شہرینہ نے اس کی حیثیت کو گردن اکڑا کر جتایا تو اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

پھر شاپنگ کے دوران شہرینہ مسلسل بولتی رہی۔ کبھی اسے ٹوکتی کبھی اکساتی لیکن اس کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے خریداری کی۔ اتنے بڑے مال میں چل چل کر ٹانگیں شل ہوگئی تھیں مزید بھاری شاپنگ بیگز سے بازوؤں اور کندھوں میں درد ہونے لگا تھا۔ پیر گھسیٹ کر چلتے ہوئے شہرینہ فوڈ کارنر کی چیئر پر ڈھے گئی تھی۔

"اف خزی اب ہم گھر کیسے جائیں گی۔ ایسا کرتے ہیں ایمبولینس بلوا لیتے ہیں۔" شہرینہ نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی پھر پرس میں سے موبائل نکال کر نمبر پش کرنے لگی۔

"کیا سچ مچ ایمبولینس کال کررہی ہو؟" اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ شہرینہ اچھل کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک دم خاموش ہوگئی کیونکہ وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں حمزہ تم کہاں ہو؟"

"اصل میں، میں اور شہرینہ یہاں شاپنگ پر آئے تھے۔ اگر تم آفس سے نکل رہے ہو تو یہاں آجاؤ۔"

"ٹھیک ہے کتنی دیر میں پہنچو گے۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ سیل آف کرکے شہرینہ کو دیکھنے لگی تو وہ فوراً بولی۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔"

"اب تم بھی ایک کام کرو۔ وہاں سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک آرڈر کر آؤ۔" اس نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرکے کہا تو شہرینہ جاکر آرڈر کر آئی پھر اتنے شاپرز دیکھ کر کہنے لگی۔

"خزی یہ اتنا سامان بائیک پر تو نہیں آئے گا۔"

"بائیک پر کون جارہا ہے؟" خزینہ نے ناسمجھی کے عالم میں پوچھا۔

"تم نے حمزہ کو جو بلایا ہے۔"

"حمزہ کو میں نے سامان ڈھونے کے لیے نہیں بلایا۔ ہم کیب کرلیں گے۔ حمزہ کی بائیک کیب کے ساتھ ہوگی تو ہمیں پریشانی نہیں ہوگی۔ آئی سمجھ۔" خزینہ نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے بتایا تو شہرینہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ جبکہ چہرے پر ناگواری ظاہر ہونے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" خزینہ نے اس کی ناگواری محسوس کرکے پوچھا۔

"حمزہ ہمارا نوکر نہیں ہے جو ہر کام کے لیے اسے بلالیا جاتا ہے۔" شہرینہ چیخ کر بولی تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں کیونکہ یہاں بحث نہیں کرسکتی تھی پھر شاید کچھ سوچنے بھی لگی تھی۔

☆☆☆

تیمور غزنی قصداً گھر سے لیٹ نکلا تھا پھر آفس جانے کے بجائے سونیا کے گھر آگیا۔ گوکہ اس نے سوچا تھا کہ وہ شادی کرنے کے بعد ہی سونیا کو بتائے گا لیکن اب اس کی ضرورت آن پڑی تھی جب ہی اسے آنا پڑا۔

"خیریت تم اس وقت کیسے؟" سونیا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیوں آپ نے کیا میرے آنے کے اوقات مقرر کررکھے ہیں۔" اس نے جواباً ٹوکا تو سونیا کندھے اچکا کر کہنے لگی۔

"نہیں جب چاہو آؤ اور اب آئے ہو تو بیٹھ بھی جاؤ۔ ساتھ یہ بھی بتادو چائے پیو گے یا کافی۔"

"کچھ نہیں آپ بس میرے پاس بیٹھ جائیں۔" اس نے سونیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا تو وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ایسے مت دیکھیں آپی میں نے آپ کی بات پر ہی عمل کیا ہے۔" اس نے جھنجلا کر کہا تو سونیا اچھل پڑی۔

"یعنی تم نے شادی کرلی؟"

"وہی کرنے جارہا ہوں۔"

"ابھی......!" سونیا پھر فوراً بولی تھی۔

''نہیں ......ایک ہفتے بعد اور اب پلیز آپ پہلے میری پوری بات سنیں ......'' اس نے زچ ہو کر کہا تو سونیا آرام دہ انداز میں سیدھی ہو بیٹھی۔

''ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے آپی کہ میں کبھی اکیلا ایک رات کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں رہا۔ بزنس کے سلسلے میں لاہور، اسلام آباد جانا ہو تو سارا میرے ساتھ ہوتی ہے اور اب جبکہ میں شادی کر رہا ہوں تو مجھے کم از کم تین چار دن تو اس لڑکی کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

''بالکل رہنا چاہیے۔'' سونیا اب توجہ سے سن رہی تھی اور سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تو اس کے لیے آپ ایسا کریں کہ مری سوات وغیرہ کا آناً فاناً پروگرام بنائیں اور سارہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ آپ کو ضرور کرنا ہے آپی! میں نہ نہیں سنوں گا۔'' اس نے پروگرام بتانے کے ساتھ وارننگ بھی دے دی جب ہی سونیا فوراً کچھ نہیں بولی تھی۔

''اتنا تو آپ کر سکتی ہیں آپی۔ مجھے دیکھیں میں نے سب کچھ اکیلے ہی کیا ہے۔ آگے بھی جانے کب تک مجھے کیا کچھ کرنا پڑے گا اور یہ میں آپ کو بتا دوں۔ میں شادی کر رہا ہوں مذاق نہیں کر رہا۔ نہ ہی اس میں کوئی فراڈ ہے۔ وہ لڑکی جس سے میں اس امید پر شادی کر رہا ہوں کہ وہ میرے بچے کی ماں بنے گی اس کے لیے میرے دل میں جگہ ہو نہ ہو میرے گھر میں ہمیشہ رہے گی سن رہی ہیں آپ۔'' وہ اتنے ٹھوس لہجے میں بول رہا تھا کہ سونیا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔

''تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''تھینک یو آپی!'' اس نے سانس کھینچ کر خود کو ریلیکس کیا۔

''ویلکم ڈیئر برادر......اب یہ بتاؤ شادی کب ہے......؟''

''جمعہ کو......''

''ہیں جمعہ تو کل ہے۔''

''اس سے اگلا جمعہ......'' وہ اب اطمینان سے تھا۔

''اگلا جمعہ یعنی آٹھ دن ہیں۔ نو پرابلم میں کل ہی جا کر سارہ کے ساتھ پروگرام بناتی ہوں۔ مری کاغان وغیرہ جانے کا۔'' پھر ایک دم اسے دیکھ کر کہنے لگی ''۔لیکن تیمی! سارہ تو تمہیں بھی ساتھ چلنے کو کہے گی بلکہ ضد کرے گی۔''

''وہ میں سنبھال لوں گا۔ بس آپ اسے تیار کریں۔'' وہ غالباً ہر بات پہلے ہی سوچ چکا تھا۔

''ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ لڑکی کیسی ہے......؟'' وہی بہنوں کا شوق۔ وہ ان سنی کر کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''بتاؤ ناں تیمی۔ چلو اس کی تصویر دکھاؤ۔'' سونیا نے اس کا بازو کھینچ کر کہا تو وہ پھر جھنجلا گیا۔

''تصویر کہاں سے دکھاؤں۔ پتا تو ہے اتنی راز داری سے سب ہو رہا ہے پھر میں اس کی تصویر کیسے رکھ سکتا ہوں۔''

''اچھا ناراض تو مت ہو۔ میں تمہارے لیے اچھی سی چائے خود بنا کر لاتی ہوں۔'' سونیا کہتے ہوئے اٹھی تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں آپی! چائے رہنے دیں۔ مجھے اب آفس جانا ہے پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔''

''بس دو منٹ کی بات ہے۔''

''پھر سہی آپی......اوکے۔'' وہ سونیا کا سر چوم کر عجلت سے باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

جیسا کہ حسان صاحب نے مسعود شیروانی سے کہا تھا کہ ان کے بیٹے حسن شیروانی کی آمد پر وہ کوئی چھوٹی موٹی پارٹی رکھ لیں گے تاکہ حسن اور ربیکا ایک دوسرے کو دیکھ اور سمجھ سکیں تو آج اسی سلسلے میں ثمرہ بے حد مصروف تھیں۔ انہوں نے شہیلا کو بھی بلا لیا تھا لیکن پارٹی کا مقصد نہیں بتایا تھا کیونکہ حسان صاحب نے سختی سے منع کیا تھا۔ اسی طرح ربیکا بھی انجان تھی۔ وہ اسے بزنس پارٹی سمجھ رہی تھی۔ جب ہی نیا پروجیکٹ جس کا حسان صاحب نے حسن شیروانی کے ساتھ ایگریمنٹ کیا تھا اسے ذہن میں رکھ کر ہی پارٹی میں آئی تھی جو کہ پی سی کے وسیع ہال میں ارینج کی گئی تھی۔ بہرحال ربیکا حسان اپنے مغرور انداز میں ہال میں داخل ہوئی تھی اور حسن شیروانی جسے اس کے والدین خاص طور سے ربیکا کے بارے میں بتا چکے تھے، وہ اسے دیکھتے ہی مبہوت ہو گیا تھا۔

''کیوں بیٹا! کیسا ہے میرا انتخاب۔'' قریب کھڑی مسز شیروانی نے پوچھا تو وہ چونک کر بولا تھا۔

''لاجواب ماما!''

''تو جاؤ اس سے ملو بات کرو۔'' انہوں نے کہا تو وہ اپنی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

''میں......میرا مطلب ہے ماما! میرا تو اس سے تعارف بھی نہیں ہے پہلے آپ ہمارا تعارف تو کرائیں۔''

''نہیں یہ کام تم خود کرو۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ حسن شیروانی کشمکش و پیچ میں ربیکا کو دیکھنے لگا جو سب سے ہیلو ہائے کرتی اس طرف آ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ اس تک آتی وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''خاکسار کو حسن شیروانی کہتے ہیں۔''

''حسن شیروانی!'' ربیکا کے چہرے پر ایک لحظہ کو سوچ کا عکس لہرایا تھا پھر محتاط انداز میں بولی۔ ''جی ڈیڈی نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔''

''ک......کیا بتایا تھا؟'' وہ بے تاب ہوا۔

''یہی کہ ان کا نیا کانٹریکٹ آپ کے ساتھ ہے۔''

''اور......؟'' وہ جو سننا چاہتا تھا اگر ربیکا کے علم میں ہوتا تو شاید اس کے تعارف کو بھی خاطر میں نہ لاتی۔

''اور بس'' ہلکے سے کندھے اچکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اور وہ اپنے آپ میں خجل سا ہو کر پوچھنے لگا۔

''حسان انکل بزنس کے میٹر آپ کے ساتھ ڈسکس کرتے ہیں؟''

''میں ان کے ساتھ ہوتی ہوں۔'' ربیکا نے بتایا تو وہ خوش گوار حیرت میں گھر کر بولا۔

''گڈ پھر تو آپ سے اکثر ملاقات رہے گی۔''

''شیور......''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' حسن شیروانی نے دوستانہ انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

''می ٹو......'' ربیکا اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرائی تو جیسے ہر سمت جگنو چمک اٹھے اور وہ یوں کھویا کہ اس کا ہاتھ چھوڑنا بھول گیا۔ ربیکا کے لیے یہ صورت حال نئی نہیں تھی اس لیے سہولت سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر آگے بڑھتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح مسکرائی نہیں بلکہ آزردگی میں گھر گئی تھی۔

''ایک حمزہ ہی ہوش نہیں کھوتا۔''

اس ستمگر کا خیال کیا آیا کہ ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ ایک الگ تھلگ میز پر آن بیٹھی اور اس کی سوچوں میں یوں کھوئی کہ گرد و پیش کا ہوش ہی نہ رہا۔

''رابی یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' ثمرہ نے جھلائے انداز میں ٹوکا تو وہ چونک کر بولی۔

"کیوں کیا ہوا مما!"

"بیٹا ہم یہاں مہمان نہیں میزبان ہیں۔ تمہیں مہمانوں کو دیکھنا چاہیے۔" ثمرہ نے کہا تو وہ اکتائے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ دیکھ لیں مما میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"گھر......" وہ کہہ کر رکی نہیں تیز قدموں سے وہاں سے نکل آئی اور حسن شیروانی جس کی نظریں مسلسل اسی پر تھیں اسے جاتے دیکھ کر بے اختیار اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" روش پر تیزی سے بڑھتے ربیکا کے قدم رک گئے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" حسن شیروانی نے پوچھا تو اس کی خوب صورت پیشانی پر شکن پڑ گئی۔

"گھر......"

"کیوں! آئی مین ابھی تو مہمان موجود ہیں اور میرا خیال ہے مزید مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری ہے پھر آپ کیوں جا رہی ہیں۔" حسن شیروانی غالباً اس سے بات کرتے رہنا چاہتا تھا۔

"سوری یہ میرا پرسنل میٹر ہے اور میں اپنے پرسنل میٹر میں کسی کا انٹرفیر ہونا پسند نہیں کرتی۔" وہ کہہ کر جانے لگی لیکن حسن شیروانی نے فوراً بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"اچھی بات ہے۔ لیکن یوں کسی کے دل پر پاؤں رکھ کر گزر جانا تو ٹھیک نہیں ہے۔"

ربیکا کی آنکھوں میں الجھن آمیز سوالیہ نشان ابھرا تھا۔

"اوکے سی یو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا پھر اس کے راستے سے ہٹ گیا تو ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ آگے بڑھتے بڑھتے ربیکا نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

☆☆☆

سبینہ کی آمد پر اس کا ٹھٹکنا فطری تھا۔ کیونکہ ایسی سڑی گرمی میں تو وہ کبھی نہیں آتی تھی۔ اس لیے برملا پوچھ بھی گئی۔

"خیریت آپا۔ آپ اس وقت کیسے آ گئیں۔"

"پہلے ٹھنڈا پانی لاؤ اور پنکھا بھی تیز کر دو۔" سبینہ نے ہانپتے ہوئے کہا اور وہیں بیٹھنے لگی تھی کہ وہ بول پڑی۔

"امی کے کمرے میں چلی جائیں آپا۔ وہ کمرہ ذرا ٹھنڈا ہے۔"

"ہاں، یہ پنکھا تو مر مر کر چل رہا ہے۔" سبینہ آگے بڑھ گئی۔ تو اس نے جلدی سے فریج میں سے ٹھنڈی بوتل نکالی اور گلاس لے کر حمیدہ بیگم کے کمرے میں آ گئی۔

"روح افزا بنا لیتیں۔" حمیدہ بیگم نے اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر کہا۔

"وہ بھی بنا دوں گی۔ سانس تو لے لیں آپا...... لیجیے آپا۔" اس نے گلاس بھر کر سبینہ کو تھما دیا جیسے وہ ایک ہی سانس میں پی کر کہنے لگی۔

"میں نے سوچا دیکھ آؤں جمعہ کو نکاح ہے کوئی تیاری ویاری بھی کی ہے کہ نہیں۔" حمیدہ بیگم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"بچوں کو کیوں نہیں لائیں آپا؟"

"بچوں کو ان کی دادی نے روک لیا کہہ رہی تھیں گرمی میں پریشان ہوں گے۔ اچھا ہے میں بھی آرام سے

بیٹھ سکوں گی۔" سبینہ نے دوپٹا کھینچ کر ایک طرف ڈالا پھر پوچھنے لگی۔

"شہرینہ کہاں ہے؟"

"کالج۔"

"ہائیں ابھی تک آئی نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے آپا۔ ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔ دو ڈھائی بجے تک آتی ہے وہ۔" اس کے ٹوکنے پر سبینہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہاں میری تو مت ماری گئی ہے۔ خیر تم بتاؤ کتنی تیاری ہوئی؟"

"ارے بیٹا! کوئی لمبا چوڑا جہیز تو تیار کرنا نہیں تھا۔" اس سے پہلے حمیدہ بیگم شروع ہو گئی تھیں۔ "بس خزینہ نے اپنے لیے جو لینا تھا لے لیا۔ جاؤ خزینہ سوٹ کیس یہیں لے آؤ، دکھاؤ بہن کو۔"

"جی......" وہ اپنے کمرے سے بھاری سوٹ کیس پہیوں پر کھینچتے ہوئے لے آئی تو سبینہ نے اٹھ کر اس کی مدد سے سوٹ کیس اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیا۔ پھر ایک ایک سوٹ دیکھتے ہوئے سبینہ کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں سارے سوٹ دیکھنے کے بعد پوچھنے لگی۔

"اور کیا لائی ہو؟"

"اور بس میچنگ سینڈلز ہیں اور ایک بیوٹی بکس۔"

"اور کراکری وغیرہ؟" سبینہ نے پوچھتے ہوئے حمیدہ بیگم کو دیکھا۔

"نہیں باقی سب چیزوں کے لیے غزنی نے منع کر دیا تھا۔" حمیدہ بیگم نے کہا تو سبینہ چمک کر بولی۔

"منع تو سب کرتے ہیں امی لیکن دینا پڑتا ہے نہیں تو بعد میں طعنے ملتے ہیں۔"

"بے فکر رہیں آپا یہاں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں کیا پتا، تمہیں تو ابھی سب ہرا ہی ہرا سوجھ رہا ہے۔" سبینہ اس سے کہہ کر حمیدہ بیگم سے مخاطب ہو گئی۔ "امی آپ کو تو سوچنا چاہیے۔ ایک تو آپ اتنی راز داری سے اس کا نکاح کر کے غلطی کر رہی ہیں۔ پتا ہے طارق کیا کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے ایسا کیا گل کھلایا ہے تمہاری بہن نے جو یوں چپ چپاتے رخصت کیا جا رہا ہے۔"

"آپا......" مارے صدمے کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ حمیدہ بیگم نے پریشان ہو کر اسے دیکھا تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔

"طارق بھائی اتنی گھٹیا ذہنیت کے مالک ہوں گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہم نے ہمیشہ انہیں بھائی کا درجہ دیا ان کی عزت کی لیکن اب میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں ایسے گندے آدمی کو میرے نکاح میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"خزینہ......!" حمیدہ بیگم نے ٹوکنا چاہا لیکن وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہوئی اور تکیہ منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ بات اس کے کردار تک آ جائے گی تو وہ اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتی۔ اب بس رو ہی سکتی تھی اور وہ ٹوٹ کے روئی۔ یہاں تک کہ آنسو خشک ہو گئے۔ حلق میں بھی کانٹے چبھنے لگے تھے۔ اس نے بے بسی سے بند دروازے کو دیکھا تب ہی اس کے موبائل کی ٹون بجنے لگی۔ اس نے موبائل اٹھا کر نظروں کے سامنے کیا، تیمور غزنی کی کال تھی۔ اس نے ریسور کا بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہیلو خزینہ......!" تیمور غزنی کی ہلکی سی پکار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔ اس کے حلق سے

ایک لفظ جی تک نہ نکل سکا۔

''خزینہ......''تیمور غزنی نے دوبارہ پکارا تو بے اختیار اس کے ہونٹوں سے سسکی برآمد ہوئی تھی۔

''کیا ہوا خزینہ تم رو رہی ہو؟''تیمور غزنی کے لہجے میں تشویش در آئی تھی۔ادھر آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی۔

''بولو خزینہ......کیا میں تمہارے پاس آ جاؤں ابھی۔''وہ پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔تکیے پر دائیں بائیں سر پٹختے ہوئے وہ بمشکل کہہ سکی۔

''نہیں......''

''پھر بتاؤ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں......کچھ نہیں غزنی۔بس وہ ابو یاد آ رہے تھے۔''وہ ہچکیوں کے درمیان رک رک کر بولی تو چند لمحوں کے لیے وہ بالکل خاموش ہو گیا پھر کہنے لگا۔

''بس خزینہ ایک اسی بات پر ہمارا اختیار نہیں ہے کہ ہم جانے والے کو روک سکتے ہیں نہ واپس لا سکتے ہیں۔ میں تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ایسے وقت میں تم یقیناً ان کی کمی محسوس کر رہی ہوں گی۔لیکن دیکھو پلیز رومت۔ان کے لیے دعا کرو۔دل کو سکون ملے گا۔سن رہی ہو ناں۔''

''جی......''

''چلو منہ ہاتھ دھو۔میں پھر شام میں چکر لگاؤں گا۔ٹھیک۔''

''جی......''اس نے اللہ حافظ سن کر موبائل رکھ دیا اور دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں ڈھانپ لیں۔

☆☆☆

شام ابھی اتری نہیں تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔دروازہ بند ہونے کے باعث کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا تھا۔جب ہی وہ سمجھ نہیں پائی کہ یہ کون سا پہر ہے۔فوری طور پر اور بھی کچھ یاد نہیں آیا کیونکہ ذہن ابھی پوری طرح بے دار نہیں ہوا تھا۔ٹائم دیکھنے کے لیے اس نے موبائل اٹھایا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک کے ساتھ شہرینہ پکار کر بولی تھی۔

''خزی دروازہ کھولو......''

''دروازہ......اس نے ناسمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا پھر اٹھ کر دروازہ کھولا تو شہرینہ کے ساتھ حمیدہ بیگم کو کھڑے دیکھ کر یکلخت اس کا ذہن یوں بے دار ہوا کہ ایک ایک بات یاد آ گئی۔فوراً پلٹ کر بیڈ پر جا بیٹھی۔

''بیٹا......!''حمیدہ بیگم تیزی سے اس کے پاس آئی تھیں۔''تمہیں سینہ کا پتا تو ہے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔میں نے بہت ڈانٹا اسے روتی ہوئی گئی ہے یہاں سے۔تم اس کی باتوں کو دل پر مت لو......میں پھر سمجھاؤں گی اسے۔''

''کوئی فائدہ نہیں ویسے بھی میں آئندہ ان سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔''اس کے اندر پھر غصہ بھرنے لگا تھا۔

''بری بات بیٹا!بڑی بہن ہے تمہاری پھر خون کے رشتے ٹوٹنے والے نہیں ہوتے۔''حمیدہ بیگم ابھی مزید کچھ کہتیں کہ ڈوربیل بج اٹھی۔

''شہرینہ دیکھو کون ہے۔''شہرینہ جو صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی بادل ناخواستہ بھاگ گئی تھی۔

''بس امی ابھی آپ مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش نہ کریں۔میں خواہ مخواہ پھر کچھ الٹا سیدھا بول دوں گی۔''وہ اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی تب ہی شہرینہ آ گئی۔

''امی غزنی بھائی آئے ہیں۔''

''غزنی......''اسے یاد آیا تیمور غزنی نے شام میں آنے کو کہا تھا۔

''ارے تو بٹھاؤ اسے۔''حمیدہ بیگم بوکھلا کر اٹھی تھیں۔

''بٹھا آئی ہوں۔''شہرینہ نے کہہ کر اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو تم اس حلیے میں مت ان کے سامنے چلی جانا۔

''اچھا......تم چائے بناؤ اور خزینہ تم......''جو بات شہرینہ نے نظروں سے کہی تھی وہ بات حمیدہ بیگم ادھوری چھوڑ کر چلی گئیں تو وہ جلدی سے اپنا سوٹ نکال کر واش روم میں بند ہو گئی اور دس منٹ میں ہی شاور لے کر نکل آئی۔پھر جلدی جلدی بالوں میں برش کرتے ہوئے اس کی نظر آئینے پر پڑی۔شدت گریہ کے باعث آنکھیں بھاری اور سرخ ہو رہی تھیں۔وہ برش رکھ کر انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں سہلانے لگی۔

''خزی!اس سے پہلے کہ غزنی بھائی امی کی باتوں سے بور ہو کر بھاگ جائیں اپنا دیدار کروا دو نہیں۔'' شہرینہ نے آ کر کہا تو وہ مسکرا بھی نہیں سکی۔دوپٹا اٹھا کر سلیقے سے جماتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی تو تیمور غزنی اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''اس کا ستا چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ بے اختیار پوچھ گیا تھا۔

''جی۔''اس نے جھکی نظروں سے حمیدہ بیگم کو دیکھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''تم لوگ بیٹھو بیٹا۔میں چائے بھجواتی ہوں۔''

''نہیں آنٹی۔''تیمور غزنی فوراً ان سے مخاطب ہو گیا۔''میں اس لیے آیا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں خزینہ کو ان کا گھر دکھا دوں......آپ بھی چلیں۔''

''نہیں بیٹا!میں تو ابھی باہر نہیں جا سکتی۔ہاں شہرینہ کو ساتھ لے جاؤ''حمیدہ بیگم کی بات معقول تھی۔وہ خزینہ کو دیکھ کر بولا۔

''آپ بلائیں شہرینہ کو۔''

''بیٹا چائے تو پی لو۔''

''چائے پھر پی لوں گا۔اصل میں،میں چاہ رہا تھا خزینہ اپنے گھر کی سیٹنگ دیکھ لیں اگر نہیں چینج کروانی ہو گی تو میں ایک دو دن میں کروا دوں گا۔''اسے کوئی اور بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

''میں بھیجتی ہوں اس کو۔''حمیدہ بیگم کہہ کر کمرے سے نکلیں تو وہ بھی باہر نکل آیا تھا۔

سمن آباد سے بیس پچیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔پھر وسیع رقبے پر بنے خوب صورت اپارٹمنٹس تھے۔تیمور غزنی نے پارکنگ ایریا کے بجائے کمپاؤنڈ میں اپنے بلاک کے سامنے گاڑی روک دی۔پھر ان دونوں کے ساتھ سیکنڈ فلور پر اپارٹمنٹ کے سامنے رک کر جیب سے چابی نکالی اور خزینہ کی طرف بڑھا دی۔وہ اگر سینہ کی باتوں کے زیر اثر نہ ہوتی تو شاید اس لمحے خود پر رشک کرتی۔لیکن وہ ابھی بھی پژمردہ تھی۔خاموشی سے چابی لے کر کی ہول میں گھمائی پھر دروازہ کھول دیا۔تو تیمور غزنی نے ہاتھ سے پہلے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

خزینہ نے کسی معمول کی طرح قدم آگے بڑھائے تھے۔اس کے پیچھے شہرینہ محض اس کی وجہ سے خود پر قابو پائے ہوئے تھی ورنہ وہ بے حد مشتاق تھی۔چار کمروں پر مشتمل کشادہ اپارٹمنٹ ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔خزینہ نے لاؤنج میں رک کر طائرانہ نظر سارے میں ڈالی پھر وہیں بیٹھ گئی لیکن شہرینہ سے اب برداشت نہیں ہوا۔''بہت خوب صورت''کہہ کر آگے بڑھ گئی۔یوں بھی ان دونوں کے درمیان وہ خود کو عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔

تیمور غزنی نے شہرینہ کو کمرے میں جاتے دیکھا پھر فریج میں سے ایپل جوس نکال لایا اور گلاس میں ڈال کر خزینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ پی لیں اچھا فیل کریں گی۔"

"تھینک یو۔" خزینہ نے گلاس تھام لیا تو وہ سائڈ میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ کوشش ضرور کروں گا کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ تم پلیز ریلیکس ہو جاؤ۔"

"میں ٹھیک ہوں غزنی۔" اسے احساس ہوا کہ اسے اس شخص پر زیادہ کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ جب ہی ہلکے سے مسکرا کر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر واقعی ایپل جوس نے اس کے دل کو خاصی تقویت پہنچائی تھی۔ خالی گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی بات دہرا گئی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے اس وقت اس کی ضرورت تھی۔" جواباً تیمور غزنی اسی کے انداز میں کندھے اچکا کر مسکرا دیا۔

"یہ شہرینہ کہاں چلی گئی؟" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"چلو تم بھی دیکھ لو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کے ساتھ سارے میں گھوم پھر کر واپس لاؤنج میں آئی تو فقط ایک لفظ بولی تھی۔

"پرفیکٹ۔"

"تھینک گاڈ تمہیں پسند آیا۔"

"چلیں شہرینہ کو پکاریں وہ تو ٹیرس پر چپک ہی گئی ہے۔" اس نے کہنے کے ساتھ بے اختیار شہرینہ کو پکار بھی لیا۔ پھر ٹیبل پر رکھا ایپل جوس کا پیکٹ اور گلاس اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جوس کا پیکٹ فریج میں رکھا اور گلاس دھو کر اسٹینڈ پر۔

تیمور غزنی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ آفس کے کام سے آؤٹ ڈور پر نکلا ہوا تھا۔ خصوصاً انکم ٹیکس کے گوشوارے جمع کرانے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس کے بعد وہ واپس آفس جا رہا تھا کہ اسٹاپ پر شہرینہ کو کھڑے دیکھ کر بائیک اس کے قریب روک دی۔

"اف بہت گرمی ہے۔" شہرینہ اس کے کہنے سے پہلے ہی اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"تمہارے کالج کب بند ہو رہے ہیں۔" اس نے بائیک آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اگلے ہفتے۔ تم ابھی کہاں جا رہے ہو؟" شہرینہ نے بتا کر پوچھا۔

"آفس کے کام سے نکلا تھا اور اب آفس ہی جاؤں گا۔"

"تو مجھے یہیں اتار دو۔ یہاں سے وین مل جائے گی۔"

"ہاں لیکن اب تو لنچ ٹائم ہو گیا ہے پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے اسپیڈ بڑھا دی اور جو پہلا ریسٹورنٹ نظر آیا وہیں رک گیا۔

"کیا کھاؤ گی؟" حمزہ نے بیٹھتے ہی مینو کارڈ اٹھا کر اس کی طرف بڑھانا چاہا لیکن وہ فوراً بولی تھی۔

"کچھ بھی......" حمزہ نے خود ہی کھانا آرڈر کر دیا پھر اسے دیکھنے لگا۔

"میں کل سے کالج نہیں جاؤں گی۔" شہرینہ ٹشو پیپر سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں......؟"

"کیونکہ دو دن بعد خزینہ کی شادی مطلب نکاح اور رخصتی ہے تو کچھ تیاری تو کرنی ہو گی۔ خاص کر گھر کی صفائی ستھرائی۔ اف اب تو میں اکیلی ہوں گی۔ کیسے کروں گی سب......"

"فکر مت کرو...... میں آ جاؤں گا۔" اس نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"تم کیا کرو گے۔"

"تمہیں دیکھوں گا۔ ماسی بن کر کیسی لگتی ہو۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ شہرینہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ویٹر کے آنے پر دانت پیسنے لگی۔

"ماسی بن کر بالکل تمہاری ساس لگوں گی۔" ویٹر کے جاتے ہی جیسے وہ بے ساختہ بولی ویسا ہی بے ساختہ حمزہ کا قہقہہ تھا۔ پھر سٹپٹا بھی گیا۔ کہ ادھر ادھر کے لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔

"اف......" وہ جلدی سے اپنی پلیٹ میں چاول نکال کر اس پر جھکتے ہوئے بولی۔ "جلدی کھا کر نکلو ورنہ دھکے دے کر نکالے جائیں گے۔"

"ہنسنا منع نہیں ہے۔" وہ ابھی بھی ہنس رہا تھا۔ پھر اسے خائف دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔

"اچھا سنو، میں شام میں آؤں گا۔ تائی جان سے کھانے وغیرہ کا پوچھنا ہے۔ تمہارے خیال میں کتنے لوگ ہوں گے۔"

"پتا نہیں۔ امی ہی ٹھیک بتائیں گی۔" اس نے خود سے قیاس کرنے سے گریز کیا۔ تو قدرے رک کر وہ پوچھنے لگا۔

"خزینہ خوش ہے۔"

"خوش کیوں نہیں ہو گی۔ سب کچھ مل رہا ہے اسے۔" وہ یکدم پرجوش ہو کر بتانے لگی۔ "پتا ہے کل غزنی بھائی مجھے اور خزی کو وہ اپارٹمنٹ دکھانے لے گئے تھے جو انہوں نے خزی کے نام کیا ہے۔ سچ حمزہ میں تو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اتنا کشادہ اتنا خوب صورت اپارٹمنٹ پھر اس کی ڈیکوریشن کیا بتاؤں۔ اتنا اعلا فرنیچر کچن میں بھی ہر شے موجود تھی۔ الیکٹرونک آئٹم تو مجھے لگ رہا تھا باہر سے آئے ہیں۔ میں تو کسی چیز کو چھوتے ہوئے ڈر رہی تھی......اور ٹیرس پر سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے تو مجھے لگا جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہوں۔" وہ جتنے شوق سے بتا رہی تھی حمزہ اسی قدر خائف ہو کر سوچ رہا تھا۔

"یہ اس کی آنکھوں میں کیسے خواب سج رہے ہیں۔"

"بہت خوش قسمت ہے خزینہ۔ مجھے اس پر رشک آ رہا ہے۔"

"اچھا۔ جلدی کھاؤ۔ مجھے آفس پہنچنا ہے۔" وہ گھبرا کر بول اٹھا۔

"بس میں کھا چکی۔" وہ ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔ حمزہ نے ویٹر کو بلا کر بل پے کیا پھر اس کے ساتھ باہر نکلا تو پہلے اسے وین میں سوار کیا پھر آفس کی راہ لی۔ لیکن اب وہ کوئی کام نہیں کر پا رہا تھا۔ شہرینہ کے اشتیاق اور انداز نے اسے الجھا دیا تھا۔

"بہت خوش قسمت ہے خزینہ۔ مجھے اس پر رشک آ رہا ہے۔" اس کی آنکھوں میں رشک کے ساتھ شاید حسرت بھی تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ ساعتوں میں ربیکا کی آواز گونجنے لگی۔

"تم خوش فہم ہی نہیں خود غرض بھی ہو حمزہ۔ اپنی محبت کو تپتی دھوپ میں جھلسانا چاہتے ہو۔ تم اسے کچھ نہیں دے سکتے۔"

"اسے کسی چیز کی حاجت بھی نہیں ہے۔" اس نے یقین سے ربیکا پر جتایا تھا اور اب اس کا اپنا یقین ٹوٹ رہا

تھا۔

”نہیں۔“ وہ پریشان ہوگیا۔ ”شہرینہ بہت سادہ بہت معصوم ہے۔ اسے ابھی اتنی سمجھ نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ خوش قسمتی مادیت سے مشروط نہیں ہے۔“

وہ اپنی ڈھارس بندھاتا رہا پھر آفس کے بعد سیدھا شہرینہ کی طرف آیا تو آگے فاخرہ، بیلا کے ساتھ موجود تھیں۔ خزینہ کے لیے جو انہوں نے سوٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں نکالی تھیں وہی دینے آئی تھیں۔

”اچھا ہوا تم ادھر ہی آگئے۔“ فاخرہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

”جی مجھے تائی جان سے بات کرنی تھی۔ کیٹرنگ اور ڈیکوریشن کے سلسلے میں۔“ وہ بتاتے ہوئے حمیدہ بیگم کو دیکھنے لگا۔

”ہاں بیٹا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ تم بتاؤ کیا کرنا ہے؟“ حمیدہ بیگم الٹا اس سے پوچھنے لگیں۔

”آپ بس مجھے مہمانوں کی تعداد بتا دیں۔ باقی سب میں کرلوں گا۔“ اس نے کہا تو حمیدہ بیگم سوچتے ہوئے بولیں۔

”مہمان تو کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔ خیر تم آرام سے بیٹھو۔ میں حساب لگا کر بتاتی ہوں۔“ پھر شہرینہ کو پکار کر چائے لانے کو کہا تو وہ بھی جوتے موزے اتار کر آرام سے بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

شام کا سلونا پن رخصت ہو رہا تھا۔ جانے کیوں دو وقت گلے ملتے ہوئے سارے میں اداسی پھیلا دیتے ہیں۔ وہ کتنی دیر سے ٹیرس پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے پہلے کبھی ایسی اداسی محسوس نہیں کی تھی۔ جو اس وقت ماحول کے ساتھ اسے بھی گرفت میں لے رہی تھی۔ اس نے ریلنگ پر آگے کو جھک کر نیچے دیکھا۔ حسان صاحب کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ ابھی آفس سے آئے نہیں تھے یا آکر کہیں گئے تھے۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر نیچے ثمرہ کے پاس آکر پوچھنے لگی۔

”ڈیڈی ابھی آفس سے نہیں آئے مما......؟“

”نہیں، فون آیا تھا کہہ رہے تھے کسی پارٹی کے ساتھ ڈنر کر کے آئیں گے۔“ ثمرہ نے بتایا تو اس نے یونہی سر ہلا دیا پھر ان کے پاس بیٹھ کر کہنے لگی۔

”آپ کو پتا ہوگا مما کہ ڈیڈی نے حمزہ کو اپنے آفس واپس بلا لیا ہے اور ایسا انہوں نے یقیناً میرے لیے کیا ہے۔ ہے ناں......؟“

”پتا نہیں بیٹا۔ مجھے تو تمہارے ڈیڈی نے کچھ نہیں بتایا......“ ثمرہ اندر ہی اندر پریشان ہوئی تھیں۔

”چلیں اب تو آپ کو پتا چل گیا اور اب آپ ڈیڈی سے کہیں کہ حمزہ کو اتنا اسٹیبلش کر دیں کہ ہم اسے اپنی کلاس میں متعارف کرا سکیں۔“ وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ چٹکی بجاتے سب ہو جائے گا۔ ثمرہ اسے دیکھے گئیں۔ کچھ کہنے سے قصداً گریز کیا تھا۔

”میرا خیال ہے بلکہ یقیناً ڈیڈی کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہوگا۔“ اس نے مزید کہا تو ثمرہ بمشکل اپنی کھولن چھپا کر کہنے لگیں۔

”ہاں ظاہر ہے ہمارا کون سا کوئی بیٹا ہے جو یہ سب سنبھالے گا۔ ابھی جو کچھ ہے تم دونوں بہنوں کا ہی ہے۔“

”پھر آپ جلدی ڈیڈی سے بات کریں۔ کیونکہ مجھے حمزہ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس دن میں صرف اس لیے پارٹی چھوڑ کر آگئی تھی کہ وہاں حمزہ نہیں تھا۔“ اس کی صاف گوئی ثمرہ کو زہر لگی۔ صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا

پھر اچانک کچھ سوچ کر پوچھنے لگیں۔

”حمزہ کی کیا پلاننگ ہے۔ آئی مین مڈل کلاس سے اپر کلاس میں آنے کے لیے اس نے بھی تو کچھ سوچا ہوگا؟“

”ہوسکتا ہے سوچا ہو، میری اس سلسلے میں اس سے بات نہیں ہوئی۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں ڈیڈی اسے بہتر گائیڈ کرسکیں گے۔“ وہ بہت آرام سے اور یقین سے بات کر رہی تھی۔ ثمرہ مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلو بیٹا کھانا کھالیں۔“

”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔“ اس نے کہہ کر ریموٹ کنٹرول اٹھالیا اور کچھ دیر چینل سرچ کرتی رہی پھر اکتا کر اپنے کمرے میں آتے ہی حمزہ کو کال ملائی تھی۔

”یس میم۔“ ادھر حمزہ نے کال ریسیو کرتے ہی کہا تو وہ جھنجلا کر بولی۔

”میں آفس سے کال نہیں کر رہی حمزہ۔“

”او، سوری، کیسی ہو اور اس وقت میرا خیال کیسے آیا؟“ وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔

”کیا تم یہ سننا چاہتے ہو کہ مجھے ہر پل تمہارا خیال رہتا ہے۔“ اس نے پورا دھیان اس کی طرف منتقل کر کے پوچھا تھا۔

”میری بات چھوڑو۔ کیونکہ میں اپنی مرضی تمہیں دان کر چکا ہوں۔“ وہ حمزہ کی بات سمجھ کر بھی پوچھنے لگی۔

”مرضی دان کرنے کا مطلب؟“

”مطلب جو تم چاہو گی۔ تم دن کو رات کہو گی تو میں رات ہی مانوں گا۔“ اس کی وضاحت پر وہ چڑ گئی۔

”شٹ اپ۔“

ادھر حمزہ ایک دم خاموش ہوگیا گویا اپنی بات کا عملی مظاہرہ کر رہا تھا۔ کچھ انتظار کے بعد ربیکا کو پکارنا پڑا۔

”حمزہ......“

”ہوں......“ بند ہونٹوں سے جواب آیا تھا۔

”کیا تم مذاق کے موڈ میں ہو۔“ اس نے ٹوکا تو فوراً بولا۔

”بالکل نہیں۔“

ربیکا نے موبائل کان سے ہٹالیا لیکن لائن منقطع نہیں کی۔ جانے کیوں اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی...... اور سمجھنے کی کوشش میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ ساتھ موبائل کو دوسری ہتھیلی پر مار رہی تھی۔ کتنی دیر بعد احساس ہوا تو موبائل کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

”یس......“ ادھر حمزہ موجود تھا۔ لیکن اسے خوشی نہیں ہوئی کیونکہ حمزہ کے لہجے میں وہ بے قراری نہیں تھی جو انتظار کی صلیب پر کھڑے شخص کے لہجے سے چھلکتی ہے۔

”ٹھیک ہے حمزہ پھر بات ہوگی۔“ اس نے کہہ کر موبائل آف کر دیا تھا۔

☆☆☆

آج جمعہ تھا اور حمیدہ بیگم کے گھر میں صبح سے ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کیونکہ مہمانوں میں چند قریبی عزیز تھے۔ اس لیے ان کی بیٹھک کا انتظام حمزہ گھر میں ہی کروا رہا تھا۔ لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں ایکسٹرا چیئرز لگوا دیں اور کھانے کی ٹیبلز برآمدے میں لگوا دیں۔ ان کاموں کے دوران آتے جاتے اس کی اور شہرینہ کی دلچسپ نوک جھوک جاری رہی۔ خزینہ البتہ اپنے کمرے تک محدود تھی۔

پھر دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی شہرینہ، خزینہ سے پارلر چلنے پر اصرار کرنے لگی۔ لیکن وہ پہلے ہی منع کر چکی تھی اور ابھی بھی اس کی ایک ناتھی۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ جیسے شرارہ نہ لینے کی قسم کھائی تھی اس طرح پارلر بھی نہیں گئی۔ جس سے شہرینہ روٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے پھر ہمیں بھی تیار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی ٹھیک ہیں۔'' وہ منہ پھلائے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ حمزہ جو ستانے بیٹھا تھا اس کی بڑبڑاہٹ تو سمجھ میں نہیں آئی پھلا منہ دیکھ کر کہنے لگا۔

''مت رو۔ میں تائی جان سے کہتا ہوں۔ خزینہ کے ساتھ ساتھ تمہاری شادی بھی کر دیں۔''

''جی نہیں میں ایسے شادی نہیں کروں گی۔'' وہ اچھل کر بولی۔ تو حمزہ بظاہر سنجیدہ اور معصوم شکل بنا کر پوچھنے لگا۔

''پھر کیسے کرو گی۔''

''بہت دھوم دھام سے۔'' وہ اس کی شرارت سمجھی نہیں۔

''اچھا۔'' حد تھی معصومیت کی۔

''اور کیا سارے فنکشن ہوں گے میری شادی میں۔''

''مثلاً......؟''

''پہلے مایوں......''

''پھر......؟''

''مہندی......''

''پھر......؟''

''بارات......''

''ویری گڈ پھر تو واقعی بہت مزا آئے گا۔'' حمزہ اب کسی طرح اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا سکا تو وہ۔

''اور کیا......'' کہتے کہتے ایک دم بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایک منٹ یہ تو بتاؤ ولیمہ کب ہوگا۔'' حمزہ نے اب باقاعدہ چھیڑا تو اس نے کشن کھینچ کر اس کے منہ پر دے مارا پھر سرپٹ بھاگی تھی۔

عصر سے گھنٹہ بھر پہلے سب مہمان آ گئے۔ خزینہ نے اپنا کمرہ بند کر لیا تھا۔ وہ خود ہی تیار ہو رہی تھی۔ حمیدہ بیگم مہمانوں کے درمیان اپنے شوہر حیدر علی کا ذکر چھیڑے بیٹھی تھیں کہ اگر وہ ہوتے تو بیٹی کو اتنی سادگی سے رخصت نہ کرتے۔ اس کے برعکس اس وقت یہاں شادیانے بج رہے ہوتے۔ وہ آبدیدہ تھیں۔ سب لوگ ان کی مجبوری اور دکھ محسوس کر رہے تھے۔

نکاح مسجد میں تھا۔ عصر سے کچھ پہلے تیمور غزنی ایک وکیل اور دو گواہوں کے ساتھ آیا تو مرد حضرات انہیں لے کر مسجد چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر آئے تو خزینہ سے رضامندی لی گئی۔ اس کے بعد کھانا شروع کیا گیا۔ سادہ تقریب تھی بخیر و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچی۔ بس شہرینہ نے ہی اپنے موبائل میں دلہا دلہن کی کچھ تصویریں کھینچی تھیں۔ اور پھر اس وقت جب تیمور غزنی خزینہ کا ہاتھ تھامے چل رہا تھا تب وہ تھوڑی مووی بنا سکی تھی۔

بہرحال خزینہ نے جس کی تمنا کی اس کے ساتھ رخصت ہو گئی تو باقی مہمان بھی جانے لگے۔ حمیدہ بیگم نے خاص طور سے فاخرہ کو رات ادھر ہی رکنے کا کہا تو وہ منع نہیں کر سکیں۔ پھر پہلے شہرینہ بیلا اور حمزہ نے مل کر پھیلاوا سمیٹا اس کے بعد دسترخوان لگا دیا تو کھانے کے دوران حمیدہ بیگم اور فاخرہ یہ طے کرنے لگیں کہ صبح دولہا دلہن کو ناشتے میں کیا بھیجنا چاہیے اور جب یہ بات آئی کہ ناشتا کون لے کر جائے گا تو شہرینہ فوراً بولی تھی۔

''میں جاؤں گی۔'' پھر جیسے اپنی بات سنبھالنے لگی۔ ''میرا مطلب ہے امی ہم ہی لوگ جائیں گے ناں۔''

''ہاں اور میرا خیال ہے فاخرہ بچوں کے ساتھ تم بھی چلی جانا۔ کیونکہ وہاں کوئی عورت تو ہے نہیں۔ اکیلے گھر میں گئی ہے لڑکی۔ تم ذرا اپنی تسلی کر آنا۔'' حمیدہ بیگم کتنی مطمئن سہی پھر بھی شاید اندر کہیں کوئی خوف موجود تھا۔

''ٹھیک ہے بھابھی۔ میں چلی جاؤں گی۔'' فاخرہ حامی بھر کر بچوں سے کہنے لگیں۔ تم لوگ جلدی سونا۔ صبح جلدی اٹھنا ہوگا۔''

''نیند تو جلدی نہیں آئے گی لیکن آپ فکر نہ کریں اٹھ جلدی جائیں گے۔'' شہرینہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جا رہی ہو۔'' حمزہ کے لیے ڈرائنگ روم میں بستر لگا دو۔'' حمیدہ بیگم نے کہا تو حمزہ منع کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں تائی جان بستر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔''

''توڑ نہ دینا ہمارا صوفہ۔'' اس نے حمزہ کو چھیڑا اور حمیدہ بیگم کے گھورنے پر فوراً پوچھنے لگی۔ ''امی آپ چائے پییں گی۔''

''نہیں فاخرہ سے پوچھ لو۔''

''نہیں میں رات میں چائے نہیں پیتی۔''

''لیکن میں ضرور پیتا ہوں۔'' حمزہ فوراً بولا تو وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اللہ کو یہی منظور تھا جب ہی اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور سارے مرحلے بخیر و خوبی سے طے ہو گئے تھے۔ وہ خزینہ کو بیڈ روم میں چھوڑ کر ٹیرس پر نکل آیا کیونکہ راستے میں اس کے سیل فون پر سارہ کی کال آ رہی تھی جو ظاہر ہے وہ ریسو نہیں کر سکتا تھا اور اب اطمینان سے ہو کر اسے کال بیک کر رہا تھا۔

''کہاں ہو تمہی ماما نے بتایا ہے تم گھر پر نہیں ہو۔'' ادھر سارہ نے کال ریسو کرتے ہی ٹوکا تھا۔

''ماما نے یہ نہیں بتایا کہ میں کہاں ہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''بتا تو رہی تھیں ماما لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایکچوئلی یہاں سگنل پرابلم ہے، خیر تم بتاؤ کہاں ہو؟''

''میں ایک فارم ہاؤس میں ہوں۔ میں نے بتایا تھا ناں جرمنی سے ایک پارٹی آ رہی ہے تو انہیں ہوٹل میں ٹھہرانے کی بجائے میں نے فارم ہاؤس بک کر لیا۔ یہ تین دن میں ان ہی لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔'' وہ نارمل انداز میں بتاتے ہوئے اچانک اموشنل ہوا تھا۔

''یوں بھی سارہ مجھے اپنے کمرے میں تمہارے بنا تو نیند نہیں آئے گی۔''

''تو یہاں آ جاؤ ناں۔ مجھے بھی تمہارے بنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔'' سارہ نے کہا تو وہ خود پر قابو پا کر بولا۔

''آ جاؤں گا۔ بس ڈیلی گیشن کو رخصت کرتے ہی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ اوکے اپنا خیال رکھنا۔'' وہ سیل آف کر کے کچھ دیر مزید وہیں کھڑا رہا پھر قدرے سست روی سے اندر آیا تو وہ جو ریلیکس انداز میں بیٹھی تھی اسے دیکھ کر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''السلام علیکم۔'' وہ سلام کرتے ہوئے خزینہ کے سامنے بیٹھ گیا اس کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے تو اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

☆☆

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

شبانہ شوکت

دردِ آشنا

"عنایہ ابراہیم" سر طاہر نے رول کال دی۔

"پریزنٹ سر" پھولی ہوئی سانسوں کو قابو کرتے ہوئے جیسے اس نے جواب دیا یہ وہی جانتی تھی۔ اتنی تیزی سے وہ کلاس میں آئی تھی کہ ابھی تک سانس بحال نہیں ہو پائی تھی۔

سر طاہر نے رجسٹر سے اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تو آج بھی لیٹ ہوتے ہوتے رہ گئیں۔"

"ہوئی تو نہیں ناسر" وہ اب اطمینان سے سانس لیتی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

"یہ آج کل کے بچے نہیں سدھریں گے۔"

ایک تو نیند پوری نہیں ہوئی۔ اس پر فارماسیٹکس کی کلاس اس کے بعد اورگینک کیمسٹری اف دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ بارہ بجے جب بریک ہوا تو کیفے میں سب سے پہلے پہنچنے والی عنایہ تھی۔

"سوسیڈ اینڈ ویری بیڈ عنایہ، ہمارا ویٹ ہی نہیں کیا اور یہاں آ پہنچیں۔ شیم آن یو۔"

عشا، شاندانہ اور رومیصہ نے پہنچتے ہی لتاڑا تھا۔

"سوری یار، میں نے سوچا تم لوگوں کے آنے تک آرڈر کردوں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک کیا تم نے" شاندانہ نے ویٹر کو ٹیبل پر لوازمات رکھتے دیکھا تو ٹھنڈی ہوگئی۔

"تم روز کیوں لیٹ ہو جاتی ہو، عین رول کال ٹائم پر آتی ہو۔ بلکہ ابسینٹ لکھواتے لکھواتے رہ جاتی ہو۔"

"بس یار، نہیں اٹھا جاتا مجھ سے صبح ہی صبح، اب آنکھ کھلتے ہی فٹافٹ تیار ہوتی، ناشتا بھی نہیں کرتی اور آجاتی ہوں پھر بھی دیر ہو جاتی ہے۔" اس نے مظلومیت سے منہ لٹکایا۔

اور عنایہ وہ کسی کو کیا بتاتی۔ پہلے بشریٰ سے چیٹنگ کرتی پھر اپنی اسٹڈیز کو وقت دیا کہ ہنیزہ اس کی سکینڈ کزن کی امریکہ سے ویڈیو کال آگئی تو وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا اس کے ساتھ اکثر ایسا کچھ ہو ہی جاتا تھا کہ سوتے سوتے رات کے دو تو بج ہی جاتے تھے۔ نتیجہ پھر یہی ہوتا کہ صبح آنکھ بھی دیر سے کھلتی اور وہ ہر کام سے لیٹ ہو جاتی۔

☆☆☆

وہ گاڑی کلب کے اندر لے آئی تھی۔ سورج اپنی کرنیں تیزی سے سمیٹ رہا تھا۔ شام اپنی چھاؤں سمیت آن وارد ہو رہی تھی پر سورج کے گولے نے اتنی تپش دن بھر برسائی تھی کہ فضا میں گرمی سی تھی۔ ٹھنڈی شام نہیں تھی۔ وہ گاڑی پارک کر کے تیزی سے اسکواش کورٹ کی طرف آئی تھی۔ جہاں سے وہ آج بھی فاتح بن کر نکلا تھا۔ سفید شارٹس، آسمانی رنگ کی ہاف سلیوز شرٹ میں ملبوس، شہد رنگ آنکھوں میں فاتحانہ چمک، ہونٹوں پر جگمگاتی مسکراہٹ، تیز سانسیں، بہتا پسینا مگر فتح کی سرشاری نے اس کی وجاہت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ تولیے سے پسینا پونچھتا اس کے قریب آیا تھا۔

"مبارک ہو، ویسے تو یہ کہنا بھی بے معنی سا لگتا ہے۔ معمول ہی ہو گیا ہے یہ" وہ بھی مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں کہہ سکتی ہو مگر یاد رکھو کہ معمول یونہی نہیں بنا کرتے۔ اسپیشلی جیتنے کا معمول۔ بہت ہارڈ ورک کرنا پڑتا ہے اس کے لیے۔ تب ہی آپ جیت سکتے ہیں اور مسلسل جیتنے کے لیے مسلسل اسٹرگل چاہیے۔ ایسے تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ نہ کامیابی نہ محبت۔" آخر میں اس کے لہجے سے شرارت جھلکی تھی۔ وہ اب جوس پی رہا تھا۔ انرجی ڈرنک۔

نہیں خیر محبت تو تمہیں یونہی مل گئی بغیر کسی اسٹرگل کے۔"

"ابھی ملی کہاں ہے" اشعر نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ "ابھی تو بس......"

"کیا بس؟" اس کے تیور کڑے ہوئے۔

اشعر نے سہم جانے کی اداکاری کی۔ "یار کیا ہو گیا۔ کھاؤ گی کیا؟"

"تم نے مجھ سے پرامس کیا ہے کہ عائشہ کی شادی تک ویٹ کرو گے اور اب ایسی باتیں"؟

"ہاں پرامس تو کیا ہے پر دل تو دل ہے



نا پھسل ہی جاتا ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا، ذونائشہ نے آگے ہو کر مکا۔ اس کے بازو پر دے مارا تھا۔

☆☆☆

''اللہ، ذوبی یہ تم ہو نا، زبیدہ ابراہیم؟''

زبیدہ ہاسپٹل میں لمبی لائن میں لگی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی اپنے نمبر کے پکارے جانے کے انتظار میں تھیں کہ ان کے سامنے کھڑی ان ہی کی ہم عمر خاتون نے انہیں مخاطب کیا تھا۔ زبیدہ نے اپنی یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے انہیں بغور دیکھا۔ ''آ......آسیہ تم، تم یہاں''؟

بالآخر وہ بھی انہیں پہچان ہی گئیں اور اٹھ کر بے تابی سے ان کے گلے لگ گئیں۔

''شکر ہے تم نے پہچانا تو، مجھے تو لگ رہا تھا میں یہاں کھڑے کھڑے جم جاؤں گی پر تمہاری یادداشت کام نہیں کرے گی۔'' آسیہ نے سچ مچ شکر کا سانس لیا تھا اور زبیدہ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

''کتنی دوستی تھی ہماری اور دور پرے شادی ہو جانے سے ملنا، ملانا ہی ختم ہو گیا۔'' آسیہ نے تاسف کے اظہار کے لیے منہ سے چچ چچ کی آواز بھی نکالی تھی۔

''اس کے باوجود کہ ہمیں ملے ہوئے تیس سال سے زیادہ ہو گئے تم نے مجھے پہچان لیا۔'' زبیدہ اسی بات پر حیران تھیں۔

''ہاں بالکل، مگر تم تبدیل بھی تو نہیں ہوئیں نا، ویسی کی ویسی ہو تو پھر کیسے نہیں پہچانتی۔'' وہ محبت سے مسکرائیں۔

''اور سناؤ کیسی ہو، کتنے بچے ہیں اور شوہر کیا کرتے ہیں تمہارے؟'' زبیدہ کو ذہن پر زور دینے کے باوجود ان کے شوہر کا نام یاد نہیں آیا تھا۔

''ان کا تو انتقال ہو گیا۔ دو بیٹے ہیں۔ جوان ہیں ماشاء اللہ، ایک بزنس سنبھال رہا ہے اور دوسرا پڑھ رہا ہے اور تمہارے بچے وغیرہ؟''

''ایک ہی بیٹی ہے۔ بس ہم دونوں کے دل کی ٹھنڈک،'' زبیدہ کی آنکھیں بیٹی کے ذکر پر قندیلوں کی طرح جل اٹھی تھیں۔

''ماشاء اللہ کتنی بڑی ہے اور کیا کرتی ہے، نام کیا ہے؟''

آسیہ نے تابڑ توڑ سوال کیے تھے۔ زبیدہ باری باری ان کے جواب دے رہی تھیں۔ دونوں کو باتوں میں ہوش ہی نہیں رہا کہ دو بار زبیدہ کا نام پکارا جا چکا تھا۔ دونوں کے درمیان باتوں کے علاوہ فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہوا۔ ایک دوسرے کے ایڈریس لیے گئے۔ آسیہ کو لینے ڈرائیور آ گیا تو زبیدہ کو بھی اپنا ہوش آیا۔

☆☆☆

عنایہ کی پہلی بار بشر سے ملاقات ایک بڑے اور نامور ہاسپٹل میں ہوئی تھی وہ سب اپنے ہفتہ وار وزٹ کے لیے ہاسپٹل گئے تھے۔ بشر سینئر فارماسسٹ سر نافع کریم کے پاس موجود تھا اور دونوں کی بے تکلفی بتا رہی تھی کہ شناسائی پرانی ہے۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود دونوں کی بہت اچھی دوستی تھی۔ عنایہ کھانسی کی دوائی کا فارمولا سر نافع سے ڈسکس کرنے ان کے پاس آئی تو بشر نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ مسکرائی تو بائیں گال میں گڑھا پڑ گیا اور بشر کا دل اس میں ہی کہیں پھنس گیا تھا۔ وہ قدرت کی صناعی کا وہ شاہکار تھی کہ جس کی جتنی تعریف کی جاتی وہ کم ہی ہوتی پر اس کی تعریف کی کیسے جاتی اور کہاں کی جاتی وہ تو اپنی یونی میں ہوتی۔ پتا نہیں پھر کب دکھائی دیتی۔

''کوئی ترکیب سوچنی پڑے گی۔'' وہ کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا مگر جلد ہی سوچوں سے باہر آنا پڑا۔ کہیں سوچوں میں ہی رہ گیا تو وہ چلی نہ جائے۔ اس نے دیکھا وہ سر نافع کے ساتھ کچھ اور لڑکے لڑکیوں سمیت ڈسکشن کرتے ہوئے سر کو ہلاتی، ہاتھوں کو حرکت دیتی۔ آنکھوں اور ابرو کو ہلکی ہلکی جنبش دیتی۔ باتیں کرتی کتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اس نے بے اختیار دعا کی کہ وہ کچھ دیر کے

لیے اس کے قریب بھی آئے۔ اس سے بھی یوں باتیں کرے، کچھ دیر وہ انہیں دیکھتا رہا پھر اونچی آواز میں آفر کی۔

''ہے گائز، اگر آپ لوگوں کو تھکن محسوس ہو رہی ہو تو کافی چلے گی''؟

''واؤ، یس سر'! سب خوشی سے چہک اٹھے تھے۔ سر نافع نے البتہ بڑی حیرت سے بشر کو دیکھا تھا۔ (بشر اور کافی کی آفر؟)

''میرے پاس کافی میکر اور کافی کا سارا سامان موجود ہے اور میں بہت اچھی کافی تیار کر لیتا ہوں، سو آپ انتظار کریں۔ میں اپنے آفس میں کافی تیار کر کے سب کو وہیں بلا لوں گا۔'' وہ باہر کی طرف بڑھا کہ رومیصہ نے پکارا۔

'ایکسکیوز می سر! آپ زحمت نہ کریں۔ عنایہ بہت اچھی کافی بناتی ہے۔ آپ ہمیں اپنے آفس لے چلیں اور سامان دے دیں۔'' اس نے عنایہ کا ہاتھ پکڑا اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ ''عنایہ'' تو اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ بشر کی تو ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھی اسے لگ رہا تھا آج ساری دعاؤں کی قبولیت کا دن ہے۔ سو اس نے وقت ضائع نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ سے عنایہ کو مانگ لیا تھا۔

''چلیں سر''؟ رومیصہ کی آواز پر وہ چونکا اور ان کی رہنمائی کے لیے آگے آگے چلنے لگا۔

واپسی پر لڑکیوں نے عنایہ کو اس کے حوالے سے جی بھر کر چھیڑا تھا۔ وہ آگے سے ہنستی رہی تھی۔ وہ تھا ہی اتنا ڈیشنگ کہ اس کے حوالے سے کی جانے والی چھیڑ چھاڑ بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ پھر اس کی حرکتیں بھی ایسی تھیں کہ کسی عقل کے اندھے کو بھی سمجھ میں آ جائیں۔

ان کا دوسرا چکر اس ہاسپٹل میں دو ماہ بعد لگا تھا وہ ان کی آمد کے کچھ ہی دیر بعد بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا تھا۔ سب کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ عنایہ البتہ پورے اعتماد سے کھڑی تھی۔ عدیل کو شرارت سوجھی۔

''سر آج آپ کافی نہیں پلائیں گے۔ آج تو ٹھنڈ بھی بہت ہے۔''

''یس آف کورس'' وہ اٹھ گیا۔ ''آپ بنائیں گی؟'' براہ راست عنایہ سے پوچھا تھا۔

''یس شیور''

''رومی آؤ'' اس نے رومیصہ کو بلایا۔

''تم چلو، میں بس آئی۔'' وہ ہاتھ سے واش روم کا اشارہ کرتی دوسری طرف چلی گئی، وہ بشر کے ساتھ باہر چلی آئی۔ ''یور گڈ نیم پلیز''

''عنایہ ابراہیم''!

''بہت خوب صورت''۔ برملا تعریف۔/بے ساختہ عنایہ نے اسے دیکھا۔

''آپ بھی اور آپ کا نام بھی'' وہ بڑے دل موہ لینے والے انداز میں مسکرایا تھا۔

''تھینکس فار کامپلیمنٹ'' اس نے مسکراہٹ دبائی۔

''آپ کا سیل نمبر چاہیے''۔ وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ عنایہ نے سوالیہ ابرو اٹھایا۔ ''یونہی رابطہ کرنے کے لیے''

''اب میں آپ کو اتنی اچھی طرح بھی نہیں جانتی کہ نمبر ہی دے دوں'' وہ بے نیازی سے چلتی رہی۔ وہ تڑپ ہی تو گیا۔

''میں بشر ظہیر، تازہ تازہ ڈاکٹر بنا ہوں اور آگے اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ڈیفنس میں گھر ہے اپنا ذاتی، میرا مطلب ہے میرے پاپا کا گھر ہم دو بھائی ہیں۔ دونوں ہی بہت نیک اور شریف اور آپ کو مزید کچھ معلومات کرنی ہیں تو سر نافع سے پوچھ لیں۔'' اس کے اس طرح تعارف کروانے پر عنایہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ بشر کو لگا اس کے اردگرد پھول ہی پھول کھل گئے ہوں۔ سو صورت حال یہ تھی کہ جب رومیصہ وہاں آئی تو دونوں مسکرا مسکرا کر کافی تیار کرتے ہوئے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے پتا نہیں کتنے پرانے دوست ہوں۔ بس پھر دونوں کی دوستی کی ابتدا ہو گئی۔ فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہوا اور کبھی

کبھار ملنے کا وعدہ بھی۔

دونوں کی بات چیت پہلے دوستی میں ڈھلی اور پھر محبت میں تبدیل ہوگئی۔ ہر کام سے زیادہ ضروری ایک دوسرے سے بات کرنا ہوگیا تھا۔ سارا دن وقفے وقفے سے ایک دوسرے کو ٹیکسٹ کیے جاتے۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو کال بھی کرلیتے تھے۔ بڑے اچھے دن گزر رہے تھے۔ ہنستے مسکراتے، غم، فکر اور ہر دکھ سے آزاد، کاش، ساری زندگی یونہی گزر جائے۔

☆☆☆

''اشعر!'' وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا تھا مگر پیچھے سے آتی مام کی آواز پر ٹھٹک گیا۔

''جی مام!''

''یہاں آؤ، میرے پاس۔'' وہ بڑی فرصت سے کاؤچ پر فروکش تھیں اور اسی کی جانب پوری طرح متوجہ بھی، وہ مسکراتا ہوا ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ رائل بلو تو پیس سوٹ میں وہ اتنا خوب صورت لگ رہا تھا کہ بے اختیار انہوں نے نظر بد سے بچنے کی دعا پڑھ کر اس پر پھونکی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور وسیع ہوئی۔

''تم 29 سال کے ہوچکے ہو ماشاء اللہ سے'' میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہاری شادی کردینی چاہیے کچھ لیٹ ہوگئے ہیں ہم۔''

اشعر کے حواس چوکنے ہوئے۔ آنکھیں تھوڑی اور کھل گئیں۔ ''نہیں ماما کچھ ایسے بھی لیٹ نہیں ہوئے ہم۔ ویسے صبح صبح یہ نیک خیال کیسے آیا آپ کو؟''

''خیال تو خیر بہت دنوں سے تھا لفظوں میں آج ڈھالا ہے۔''

''واہ، واہ مام کیا شعر کہا ہے کہ آپ نے واہ'' وہ جھوم گیا۔

''دیکھو اشعر میری بات کو مذاق میں مت لو، میں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں کہ تمہاری کوئی مرضی ہے تو مجھے بتادو۔ ورنہ میں کہیں اور بات چلاؤں بلکہ سچ کہوں تو مجھے زبیدہ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے ایک پل دیر نہ کروں اور اسے گھر لے آؤں مگر اس سے پہلے تمہاری رضامندی لینا ضروری ہے۔''

انہوں نے پے در پے اشعر کے اعصاب پر دھماکے کیے تھے۔ وہ اچھل پڑا۔ ''کون زبیدہ اور کون ہے ان کی بیٹی؟''

''کون ہے نہیں یہ پوچھو کیسی ہے ان کی بیٹی۔ اتنی خوب صورت اتنی پیاری کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو۔ میرا تو دل خوش ہوگیا اسے دیکھ کر اس سے مل کر، بس فوراً زبیدہ سے پوچھ لیا کہ کہیں منگنی تو نہیں کی ہے۔ پر شکر ہے ایسا کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے زبیدہ سے بات کرنے سے پہلے احتیاطاً تم سے پوچھنا ضروری سمجھا، کبھی میں اس سے بات کردوں اور تم کوئی اور کہانی سنانے بیٹھ جاؤ۔ ویسے میری پرانی دوست ہے زبیدہ، بہت عرصے کے بعد ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اس دن ہاسپٹل میں اور پھر میں اس سے ملنے اس کے گھر گئی تھی تو اس کی وہ پریوں جیسی حسین بیٹی بھی دیکھ لی۔'' اشعر سے تھوک نگلنا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ ہچکچا کر بولا۔

''امی اتنی جلدی، مم میرا مطلب ہے ابھی کچھ ٹائم یہ سب رہنے دیں۔ یہ کوئی اتنی جلدی کرنے والے معاملات تھوڑی ناہیں آرام سے کچھ عرصہ گزر جانے دیں۔'' وہ کچھ دیر بغور اسے دیکھتی رہیں پھر بڑا زور دے کر پوچھا۔ ''مثلاً کتنا عرصہ''؟

اشعر نے کھنکار کر پہلے گلا صاف کیا۔ ''یہی کوئی دو تین سال اور پھر......؟''

''دو، تین سال؟'' ان کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ ارادہ کیا ہے تمہارا۔ دو تین سال کا وقت لینے کی کوئی وجہ تو ہوگی نا، پسند کرتے ہو کسی کو؟''

تو ثابت یہ ہوا کہ ماں ماں ہی ہوتی ہے۔ بچہ کتنا بڑا اور کتنا ہی قابل کیوں نہ ہوجائے۔ ماں اس کی باتوں سے، اس کے کنایوں سے اور اس کی آنکھوں سے اس کے دل کے احوال سے باخبر

ہوجاتی ہے۔ اب تھا تو یہ ایک بہترین موقع کہ اشعر ماں کو ذونائشہ کے متعلق اپنی پسندیدگی سے آگاہ کردیتا اور ذونائشہ کا غائبانہ تعارف بھی کروا دیتا پر یہی تو اصل مسئلہ تھا کہ وہ ابھی یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا۔ ذونائشہ کی کچھ ناگزیر مجبوریاں تھیں جو اسے فی الحال شادی کی اجازت نہیں دے رہی تھیں پر وہ یہ سب ماں کو نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اس کی ماں تھیں۔ اس کی مجبوریوں پر تو ہر حال میں سمجھوتہ کرلیتیں پر کسی اور کے لیے نہیں۔ سو فی الحال معاملات کو روکے رکھنے کے لیے اسے ٹال مٹول سے ہی کام لینا تھا۔

''پسند کروں گا بھی اگر تو آپ ہی کو بتاؤں گا۔ آپ کی مرضی واجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' اس نے محبت سے ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دبایا۔ وہ بے دلی سے ہلکا سا مسکرائیں۔ یہ ان کا من پسند جواب نہیں تھا۔ ماں کی بے دلی بھانپ کر اس نے انہیں اپنے بائیں بازو کے گھیرے میں لے کر ساتھ لگالیا۔

''لو یو مام!'' انہوں اس کا چہرہ تھپتھپایا اور اس بار ذرا کھل کر مسکرائیں۔

''او کے اب جاؤ تم، دیر ہورہی ہے۔''

''او کے!'' وہ فوراً اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

ممی اور ڈیڈی شادی میں گئے تھے۔ خاندان میں ہی شادی تھی مگر عنایہ اپنے پیپرز کی تیاری کی وجہ سے نہیں گئی تھی، کھانا کھا کر کمرے میں آئی تو ٹائم دیکھ کر لیپ ٹاپ آن کرلیا کیوں کہ یہ وقت بشر کی کال کا ہوتا تھا۔ اس نے امریکہ جا کر سب سے پہلے اپنی اور عنایہ کی کال ٹائمنگ سیٹ کی تھی۔ اور وہی ہوا فوراً اس کی کال آنے لگی تھی۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہورہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس سے بات بھی کررہا تھا۔ وہاں صبح تھی اور یہاں رات وہ اپنی صبح اس سے بات کرکے آغاز کرتا تھا اور وہ اس سے بات کرکے پڑھائی میں مصروف ہوجاتی۔ پھر صبح یونی جانے سے پہلے جب سیل فون دیکھتی تو اس کی گڈ وشز اور گڈ نائٹ کے میسجز موجود ہوتے۔ اس وقت وہ سو رہا ہوتا تھا۔ باتوں میں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اچانک اس کی نگاہ دیوار پر لگی گھڑی پر گئی تو اسے ممی ڈیڈی کا خیال آیا۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر کال ملائی۔ بیل جاتی رہی مگر فون ریسیو نہیں ہوا۔ اس بار عنایہ نے ڈیڈ کا نمبر ملایا۔ وہاں بھی وہی صورت حال۔ کئی دفعہ کال ملانے پر دونوں کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ اب اسے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ رات کا آدھا پہر، ہر طرف سناٹے کا راج۔ صرف وال کلاک کی ٹک ٹک اس کے دل کی دھڑکنوں کے ہم آہنگ تھی۔ گھبراہٹ اب خوف میں تبدیل ہورہی تھی۔ ایک عجیب سا خوف، انجانا، نامانوس خوف، اسے اکیلے گھر یا تنہائی سے خوف نہیں آرہا تھا۔ اسے کسی ان ہونی کا خوف لاحق تھا۔ اس خوف سے جو اندیشے پیدا ہورہے تھے۔ وہ اسے ہولا رہے تھے۔ مناسب تو نہیں تھا کہ وہ صغرا کو کال کرتی مگر صورت حال بھی تو نارمل نہیں تھی ناسو مجبوراً ہی سہی اسے صغرا کو فون ملانا ہی تھا۔

''جی بی بی؟'' اس کی نیند میں ڈوبی آواز تب آئی جب عنایہ کو لگا وہ فون نہیں اٹھائے گی۔ اتنی بیلیں جاچکی تھیں۔

''صغرا ممی ڈیڈی ابھی تک نہیں آئے۔ فون بھی پک نہیں کررہے۔ مجھے پریشانی ہورہی ہے۔''

''اللہ خیر!'' صغرا نے ہول کر وال کلاک دیکھا۔

''ہائے میں مرگئی۔ اتنی دیر۔ میں بس آتی ہوں آپ کے پاس۔''

عنایہ لاؤنج میں آگئی۔ اتنی پریشانی میں اس کا بیٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی ساتھ ہی وہ مسلسل ان دونوں کا نمبر بھی ٹرائی کررہی تھی۔ پریشانی ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ اتنے میں صغرا گھبرائی ہوئی اندر آئی تھی۔ عنایہ کو پریشان حال ٹہلتے اور بار بار فون ملاتے دیکھ کر بولی۔

"آپ عماد بابو سے پوچھ کر دیکھ لو، وہ لوگ وہاں سے نکلے بھی ہیں یا نہیں"؟

صغرا کے مشورے پر عنایہ نے سچ مچ اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ عماد اس کے ڈیڈ کی کزن سطوت آنٹی کا بیٹا تھا۔ وہ سب بھی اس شادی میں شریک تھے۔ اس سے معلوم کرتی تو اب تک اتنی پریشانی سے نہ گزرتی۔ اس نے جلدی سے اس کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد اس نے کال اٹینڈ کرلی۔

"خیریت عنایہ، اس وقت کال کی"؟

"عماد بھائی، مام اور ڈیڈا بھی تک نہیں آئے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے؟ وہ گھر کے لیے نکلے بھی ہیں یا وہیں ہوٹل میں ہیں؟" اس نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ اس وقت وہ ہوٹل میں کیا کررہے ہوں گے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں پہنچ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ دولہا والے بھی۔ میرے سامنے، سب سے مل کر انکل اور آنٹی بھی وہاں سے گھر کے لیے رخصت ہوچکے تھے۔"

"مائے گڈنیس!" عنایہ کو چکر ہی آگیا۔ مگر بھائی، وہ...... وہ تو گھر نہیں آئے۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے پھر بھی ویٹ کرو میں دیکھتا ہوں" عماد نے عجلت میں فون کاٹ دیا۔ اسی وقت، عنایہ کے فون پر کال آنے لگی۔ اس نے نمبر دیکھا "اوہ ممی، ممی کال کررہی ہیں۔" اس نے تیزی سے ریسیو کیا، صغرا نے تشکر سے اوپر دیکھا اور پھر اسے،

"ہیلو...... ہیلو ممی کہاں ہیں آپ؟ میں کتنی دیر سے......"

"ہیلو!" اجنبی مردانہ، ٹھہری ہوئی آواز، وہ حیران رہ گئی۔

"آپ کون؟"

"یہ مسز اعجاز کا فون ہے اور آپ غالباً ان کی بیٹی؟" اس کے ممی کہنے سے اندازہ لگایا۔ عنایہ کا دل اندیشوں کی زد میں دھڑ دھڑانے لگا تھا۔

"جی بالکل میں ان کی بیٹی ہوں، ممی کہاں ہیں، ان کا فون آپ کے پاس کیوں ہے۔ میرے ڈیڈ کہاں......؟"

"آرام سے، تسلی سے میری بات سنیں، میں ڈاکٹر فراز ہوں اور ہاسپٹل سے بات کررہا ہوں، آپ کے پیرنٹس کی کار کا ایکسڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ...... وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر عنایہ سن کہاں رہی تھی۔ اس کے اردگرد اتنے دھماکے ہورہے تھے یا آتش فشاں پھٹ پڑے تھے کہ ان کی دھمک میں اسے دوسری کوئی آواز سنائی دینی بند ہوگئی تھی کتنی دیر سے تنے ہوئے اعصاب پر یہ ضرب بہت کاری ثابت ہوئی تھی۔ فون اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے کارپٹ پر گر گیا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیوار کو دیکھتی ہوئی ساکت ومنجمد کھڑی تھی۔ صغرا نے گھبرا کر اس کا بازو ہلایا۔

"عنایہ بی بی، کیا ہوا کس کا فون تھا؟

اور جیسے کسی نے اس میں چابی بھر دی تھی۔ ہاسپٹل، ہاسپٹل ایکسیڈنٹ، میرے ممّی، ڈیڈی، اللہ میرے ممی اور ڈیڈی دونوں ہاسپٹل میں......" وہ زور زور سے چیخنے چلانے لگ گئی تھی۔ ساتھ ہی رو بھی رہی تھی۔ وحشت زدہ، صغرا نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ یہ اور بات کہ ایکسیڈنٹ اور اسپتال کا سن کر اس کے اپنے حواس گم ہورہے تھے۔

"عنایہ بی بی میرا بچہ، ہمت سے کام لو، عماد کو ہی فون کرکے بول دو بیٹا کہ وہ ڈاکٹر سے پتا کرے، صاحب اور بی بی کا پوچھے کہ وہ کیسے ہیں۔ اللہ پاک میری بی بی اور صاحب کو اپنی امان میں رکھنا"۔ اس نے عنایہ کے ہاتھ میں فون دے کر اسے کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"چل میری دھی رانی، بھائی کو فون ملا۔"

"عنایہ نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملایا تھا۔ اس نے پہلی بیل پر ریسیور کیا۔ "میں تو تھک گیا ہوں۔ ہر جگہ سے معلوم کیا ہے مگر انکل آنٹی کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں ہیں۔"

"چل گیا پتا" اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔ "ہاسپٹل میں ہیں وہ دونوں وہ اسے تفصیل سے بتانے لگی۔

"ہمت کرو عنایہ بیٹا۔ میں ابھی فوراً آرہا ہوں تمہارے پاس پھر ہاسپٹل چلتے ہیں۔"

وہ کچھ ہی دیر میں گاڑی اڑاتا ہوا آن پہنچا تھا اس کے ساتھ اس کی ممی سطوت آنٹی بھی تھیں۔ عنایہ ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ اسے ساتھ لگائے تسلی دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ مطلوبہ ہاسپٹل آگیا۔ ریسپشن کاؤنٹر سے معلومات لے کر عماد انہیں مطلوبہ جگہ پر ویٹنگ روم میں بیٹھا کر خود ڈاکٹر سے بات کرنے اندر چلا گیا۔ عنایہ کا خوف سے برا حال ہورہا تھا۔ صورت حال ان کے اندازے سے زیادہ خراب تھی یہ عماد کا رویہ بتارہا تھا۔ اس نے کانپتی ٹانگیں اوپر کرکے بازو ان کے گرد لپیٹ لیے۔ خوف سے اس کے پیٹ میں گرہیں پڑرہی تھیں۔ اسے ہاسپٹل کے در و دیوار سے خوف آرہا تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں سے خوف آرہا تھا۔ اسے ماں باپ سے متعلق کچھ بھی برا سننے سے خوف آرہا تھا۔ خوف کی انتہائی کیفیت میں اس کی حالت خستہ ہوتی دیکھ کر "سطوت نے بازو اس کے کندھوں کے گرد پھیلایا۔ ہمت کرو بیٹا۔ دعا کرو، دعا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اللہ سے دعا کرو، وہ رحم فرمائے۔"

وہ گھٹنوں پر سر رکھے ان کی طرف سے غافل اپنی ہی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ عماد نے انہیں چونکایا۔ اس کے ساتھ اس کے پاپا فرہاد بھی تھے جو یقیناً اسی کے فون پر آئے تھے اور بہت غمگین اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی کچھ کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے پکارا "عماد تم، یہاں خیریت؟" عماد نے مڑ کر دیکھا "اوہ اشعر، تم کیسے؟"

"ممی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ گیارہ بجے لے کر آیا ہوں۔ بلڈ پریشر اور شوگر دونوں بہت کم ہوگئے تھے تو ایڈمٹ کرلیا ڈاکٹر سعید نے، اور تم اس وقت خیریت؟"

اتنے میں آوازیں سن کر عنایہ نے سر اٹھایا کہ آسیہ کی نظر اس پر پڑی اور وہ چونک گئیں۔ "تم عنایہ ہو نا زبیدہ کی بیٹی؟"

سطوت اور عماد نے بیک وقت چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ "آپ کیسے جانتی ہیں عنایہ کو؟"

"میری بہت پیاری اور بہت پرانی دوست ہے زبیدہ اتنے عرصے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ بس دو ہی بار ملی ہیں ہم دونوں' میں ان کے گھر گئی تھی تو اس بچی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ بیٹا خیریت تو ہے نا؟" وہ عنایہ کو دیکھ کر اس سے پوچھ رہی تھیں۔ عنایہ کی کیفیت ایسی ہورہی تھی کہ کوئی اپنا بھی سامنے آکر کھڑا ہوتا تو وہ ایک دم نہ پہچان پاتی تو ان سے تو صرف ایک ہی بار ملی تھی۔ وہ انہیں کیسے پہچان لیتی۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہیں پائی تھی کہ ایک نرس پاس آکر زور سے پکاری۔

"مسز اعجاز کی بیٹی کون سی ہے؟"

عنایہ نے پاؤں نیچے زمین پر رکھے اور کرسی پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ سطوت، فرہاد صاحب اور عماد تیزی سے نرس کی طرف گھومے تھے۔

"یہ ہے ان کی بیٹی؟" سطوت نے اس کا بازو پکڑ کر سامنے کیا۔

"چلیں ان کو لے آئیں ان کی امی سے ملوادیں"

"ان کی کنڈیشن کیسی ہے اب وہ ٹھیک ہے......"

"آپ جلدی سے بچی کو ملوانے لے جائیں۔ سچوئیشن کو سمجھیں۔" عماد کی بات کاٹ کر نرس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ اس کی بات سمجھ کر فرہاد صاحب نے سطوت کو آنکھ سے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔"

عنایہ بیٹا چلو، اپنی مام سے مل لو۔"

"کیا ہوا ہے زبیدہ کو وہ کہاں ہے۔ یہ سب کیا ہے؟"

آسیہ نے ہراساں ہوکر پوچھا پر جواب کون

دیتا۔ وہاں تو سراسیمگی وافراتفری تھی۔ سطوت، عنایہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آئی سی یو میں لے گئیں۔ جہاں پٹیوں، نالیوں اور مشینوں میں جکڑی سوجے منہ والی ماں جو آکسیجن ماسک کے ذریعے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی کو دیکھ کر وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ سطوت نے مضبوطی سے اسے تھاما تھا۔

''دھیان سے میرا بچہ، ہمت سے'' ہر چند کہ ان کا اپنا کلیجہ منہ کو آرہا تھا مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وقت بہت کڑا تھا اور ان کو ہی حوصلہ دکھانا تھا۔ عنایہ نے زبیدہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر ماتھا ٹکا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

''میری...... ب ...... بیٹی، عنا...... یہ۔''

ٹوٹے پھوٹے الفاظ بہت مشکل سے زبیدہ کے لبوں سے خارج ہوئے تھے۔

''تم...... تمہارے...... ڈیڈ، کہاں......؟'' وہ اس سے پوچھ رہی تھیں اتنی تکلیف میں بھی انہیں اپنے نصف بہتر کی فکر تھی۔ وہاں پر موجود سب کی نظریں جھک گئیں زبیدہ کا دل تو پہلے ہی کسی انہونی کی طرف اشارہ کررہا تھا ان سب کے چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گئیں کہ ان کے شوہر اس دنیا میں نہیں رہے۔ عنایہ نے سر اٹھا کر آنسو کی دھند میں انہیں دیکھا۔

''میری بیٹی......'' وہ بہت تکلیف میں تھیں۔ ان سے بولا بھی نہیں جارہا تھا ہر ممکن ہمت کررہی تھیں کہ اپنی بات بیان کرسکیں۔

''آپ کوئی فکر نہ کریں بھابھی، آپ ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائیں گی۔'' سطوت نے ان کے بازو پر تھپکی دی تھی۔ وہ اس وقت کسی اور ہی کیفیت میں تھیں۔ انہیں صرف بیٹی کی تسلی درکار تھی کہ عنایہ محفوظ ہے اور محفوظ ہی رہے گی۔ ان کی باتوں سے یہی ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بیٹی کی طرف سے فکر مند تھیں اتنے میں آسیہ بھی اندر آگئیں۔ زبیدہ کو دیکھ کر وہ رو پڑی تھیں۔

''یہ کیا ہوگیا زبیدہ میری بہن، یہ کیا حال ہوگیا تمہارا؟'' زبیدہ کی بجھتی آنکھوں میں ہلکی سی چمک لہرائی تھی۔

''تم...... آگئیں آسیہ...... تم...... تمہارا...... بیٹا کہاں؟

اس بار بہت ہمت سے کام لے کر انہوں نے الفاظ کی قدرے بہتر ادائیگی کی تھی۔

''وہ باہر کھڑا ہے۔ میں بھی بڑی منت سماعت کرکے آئی ہوں آنے ہی نہیں دے رہے یہ اسٹاف کے لوگ۔''

''تم نے...... کہا...... تھا...... نا...... کہ...... تم ...... عنایہ کو......'' وہ بہت تکلیف میں تھیں۔ بات کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہورہا تھا۔ آواز بھی بھاری ہورہی تھی مگر وہ بات مکمل کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''اس کو...... بہو...... تم...... اس...... کو...... بہو۔''

عنایہ ان کی تکلیف دیکھ کر، محسوس کرکے پلک پلک کر رو رہی تھی پر ان کی اس بات نے تو اسے دم بہ خود کردیا تھا۔

''ممی...... ممی یہ...... یہ آپ......؟'' حیرت کی شدت اور آنسوؤں کی طغیانی نے بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

''تم ٹھیک ہوجاؤ پھر قرینے اور قاعدے سے سب کریں گے اور ویسے ہی کریں گے جیسے تمہاری خواہش ہے۔'' آسیہ نے محبت اور رنجیدگی سے ان کا بازو دبایا۔

''پتا نہیں...... وقت ...... ہے یا نہیں'' انہوں نے سر کو پھر سے تکیے پر پٹخا ''تم ابھی...... ابھی ......''

''زبیدہ ہمت کرو، تم ٹھیک ہوجاؤ گی ان شاء اللہ''

اتنے میں نرس ان کے قریب آکر بولی۔

''پلیز میڈم، آپ یہاں سے باہر جائیں۔ آپ کو منع بھی کیا تھا آئی سی یو میں انتارش نہیں لگاتے۔ ان سے اتنی باتیں کرنی بھی مناسب نہیں ہیں۔

وہ تینوں خاموشی سے باہر آگئیں۔ عنایہ کو انہوں نے دیوار میں نصب کرسیوں کی لائن میں سے ایک کرسی پر بٹھادیا۔ ماں کو دیکھنے اور مل لینے کے بعد اس کی حالت مزید خراب ہوچکی تھی۔ سطوت اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ آسیہ کو تو اشعر نے آہستگی سے بتایا کہ اعجاز صاحب کا انتقال ہوچکا ہے اور زبیدہ کی حالت بہت نازک ہے۔ ان کی کار کا ٹرالر کے ساتھ بہت شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ کار کی حالت دیکھنے والوں کو تو زبیدہ کا اب تک زندہ رہنا ہی معجزہ لگ رہا تھا۔ آسیہ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ اس پر یہ سب سن کر تو وہ سچ مچ چکرا گئیں۔ اشعر نے گھبرا کر انہیں تھاما ''مام، آپ بیٹھ جائیں۔''

''اشعر تم ابھی اور اسی وقت کسی مولوی کو لے آؤ مجھے تمہارا نکاح عنایہ سے کروانا ہے۔ جلدی کرو، جو انتظام ہوسکتا ہے وہ کرو۔''

ان کے سامنے زبیدہ کا سوجا ہوا چہرہ اور بمشکل اپنی آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھتی۔ ان کی التجا کرتی۔ زبیدہ گھوم رہی تھی۔ انہوں نے اشعر کو جو حکم دیا تھا اس کو سن کر تو اسے ہاسپٹل کی چھت اپنے سر پر گرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں مام؟''

''یہ سوال وجواب کا وقت نہیں ہے اشعر، یہ عمل کا وقت ہے۔ زبیدہ مر رہی ہے اور اپنی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتی ہے۔ اسے مجھ پر بھروسا ہے تو ہی اس نے مجھ سے کہا ہے۔ مجھے اس کا مان رکھنا ہے اور میرا مان تم رکھو گے؟'' بھنچی بھنچی آواز میں کہتے انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے تھے۔

''مام!'' اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں ماں کے ہاتھ تھام کر لبوں سے لگالیے۔

''آپ بہت اموشنل ہورہی ہیں اس وقت ......!''

''میں اموشنل نہیں ہورہی، میرے بچے تم اندر جاکر زبیدہ کی حالت تو دیکھو۔ وہ کس حال میں کس طرح سانس لے رہی ہے اور اس حال میں بھی وہ مجھے میری بات یاد کروارہی ہے کہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے عنایہ بہت پسند آئی ہے تو میں اسے بہو بنانا چاہتی ہوں۔ اسے مجھ پر یقین تو ہے نا، میں کیسے اس کا یقین توڑ دوں میں اسے یہ اطمینان تو دے دوں کہ اس کی بیٹی میری بہو بن کر میرے گھر اجالا بکھیرنے والی ہے۔ تم جلدی کرو، کسی کو لے کر آؤ۔''

''اٹس امپاسبل مام، رات کے پونے چار بج رہے ہیں۔ اس وقت کون سے مولوی صاحب ملیں گے اور میں کیسے ان کی بیٹی سے نکاح کرلوں۔'' وہ جھنجلا گیا۔

''تو تم انکار کررہے ہو''؟ انہوں نے برہمی سے اسے دیکھا، کچھ پہلے سے طبیعت خراب، پھر ناراضی اور دوست عزیز سہیلی کی حالت کا غم ان سب نے مل کر ان کا دوران خون تیز کردیا تھا۔ ان کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی وہ گھبرا کر آگے بڑھا مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ''بس مجھے تمہارا جواب مل گیا۔''

''مام پلیز!'' وہ پھر آگے بڑھا۔

سطوت ان کے پاس آئیں ''، آپ کی اور بھابھی کی کوئی بات ہوئی ہے عنایہ کے لیے''؟

''ہاں، میں نے ہی اسے کہا تھا کہ مجھے اس کی بیٹی بہت پسند آئی ہے، میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں مگر آج تو اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کی عنایہ کو اپنی بہو بنالوں۔ وہ اپنی حالت سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ بیٹی کی طرف سے تسلی چاہتی ہے اور میں بدنصیب اسے یہ چھوٹی سی تسلی بھی نہیں دے سکتی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ اشعر تڑپ کر قریب ہوا۔ سطوت نے آسیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''حوصلہ کریں، دعا کریں، اللہ بہتری کرے گا۔ بچے ایک دم ایسا فیصلہ قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔''

”میں بھی کوئی نارمل حالات میں تو اسے مجبور نہیں کر رہی نا، پھر یہ کوئی وقت ہے پسند ناپسند کا“ وہ روتی رہیں۔

”آپ میں سے آسیہ کون ہے۔ پیشنٹ زبیدہ اسے بلا رہی ہے۔“ وہ کوئی تہذیب سے عاری ماسی تھی جو یہ پیغام دے کر واپس پلٹ گئی۔ آسیہ نے ٹشو سے آنسو پونچھے ایک ناراض نظر اشعر پر ڈالی اور اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

”کہاں...... چلی...... گئیں...... تھیں؟“

”اشعر کو دیکھنے گئی تھی“۔ آسیہ کے بمشکل روکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔

”اسے یہاں ...... بلاؤ...... میں ...... دیکھ......“ یہ صرف اشعر کو دیکھنے کی خواہش نہیں تھی۔ یہ ہونے والے داماد کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ وہ اس حالت میں نہیں تھیں کہ کسی کے تاثرات سے کچھ اخذ کر پاتیں۔ آسیہ نے اشعر کو فون کر کے اندر بلایا۔ وہ جیسے ہی اندر آیا۔ انہوں نے قریب آنے کے لیے کہا۔

”یہ دیکھو زبیدہ، میرا بیٹا اشعر“

زبیدہ نے اپنی پوری ہمت مجتمع کی اور آنکھیں تھوڑی سی اور کھولیں۔ بہت خوب صورت اور سنجیدہ نوجوان سامنے کھڑا تھا۔

”بہت...... پیارا......“ انہیں بولنے میں بہت دقت پیش آ رہی تھی پر وہ اپنا مطمح نظر واضح کر رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح، آسیہ کو رونا آ رہا تھا۔ اپنی بے بسی پر یا زبیدہ کی لاچاری پر، ان کے آنسو تیزی سے بہہ نکلے تھے۔ اس بار انہوں نے کسی کے کہنے سے پہلے ہی خود باہر جانا مناسب سمجھا تھا۔ سطوت تیزی سے ان کے پاس آئیں۔

”میں نے عماد کو دبھیجا ہے مولوی کو بلانے کے لیے نیک کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

ان کی بات پر آسیہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ انہوں نے ان کے سامنے اشعر سے بات کی اور اس نے اپنی رضامندی تک ظاہر نہیں کی اور انہوں نے نکاح خواں کو بھی بلالیا۔ یعنی مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ تھا۔ صاف اور سیدھا مطلب یہی تھا کہ وہ عنایہ کی ذمہ داری لینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ بس جہاں امید کی کرن نظر آئی۔ اسے یقین کا سورج بنانے کے لیے وہ اپنا ہر ممکن تعاون کر رہے تھے کہ بس وہ کسی اور کے سر پڑ جائے ہمیشہ کے لیے۔ آسیہ خود پر قابو پا کر عنایہ کے پاس آئیں۔

”عنایہ بیٹا، آپ کے ماموں اور خالہ بھی تھے نا، ان کو فون کر کے بتاتیں نا مما اور پاپا کے ایکسیڈنٹ اور چچا، پھپھو وغیرہ ہیں تو ان کو بھی۔“

عنایہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں شعور کی جھلک نظر آئی تھی۔ ”میرا فون پتا نہیں کہاں ہیں۔ آپ ان لوگوں سے ممی کا فون لے لیں۔ اس میں سب کے نمبرز ہیں۔“

فرہاد صاحب کچھ ہی دیر میں اسٹاف سے فون لے آئے تھے۔ عنایہ نے بہت مشکل سے خالہ کو بتایا کہ کیا صورت حال ہے۔ ان کا ردعمل حسب توقع تھا مگر یہ طے تھا کہ اب وہ دوسروں کو بھی بتا دیں گی۔ وہی ہوا کچھ ہی دیر میں سب کے فرداً فرداً فون آنا شروع ہو گئے تھے۔ صبح فجر کی اذان کے بعد بلکہ نماز کے بعد عماد ایک نکاح خواں کو لیے ہاسپٹل میں موجود تھا۔ آسیہ نے اشعر سے یہی کہا تھا کہ وہ صرف نکاح نامے پر دستخط کر دے یہ اس کا ان پر احسان ہوگا۔ بہت مجبور ہو کر ہی اس نے دستخط کیے تھے۔ اس عالم میں کہ تیوری پر بل تھے اور ہونٹ بھینچے ہوئے ہاسپٹل کے خالی کمرے میں فرہاد، عماد، سطوت اور آسیہ کی موجودگی میں ان دونوں کا نکاح ہو گیا تھا۔ زبیدہ کو خود آسیہ نے یہ خوش خبری سنائی تھی اور گیارہ بجے کے قریب انہوں نے آسودگی سے آخری سانس لی تھی۔

ڈاکٹرز پہلے ہی بتا چکے تھے کہ ان کا بچنا ناممکنات میں سے ہے۔ سوائے عنایہ کے وہاں موجود پانچوں نفوس کو اس بات کا علم تھا۔ اعجاز

صاحب کے لیے تو تیاری کی جا چکی تھی پر اب دونوں کا انتظام کرنا پڑ گیا تھا۔ عنایہ کے دونوں چچا باہر تھے۔ بڑے چچا عرصہ دراز سے کینیڈا میں ہوتے تھے۔ چھوٹے چچا کویت میں اپنی آٹو ورکشاپ چلاتے تھے۔ کہیں سالوں میں آیا کرتے تھے اور اب بھائی کی موت کی اطلاع پر آنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اس کی ایک ہی خالہ اور ایک ہی ماموں تھے۔ جو فیصل آباد میں مقیم تھے اور آنے کے لیے نکل چکے تھے۔ اسے یہ خوف ناک حقیقت پتا چل چکی تھی کہ وہ ایک ساتھ والدین کے مہربان سایئے سے محروم ہوئی ہے۔ قیامت سی قیامت ٹوٹی تھی۔ اس معصوم پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں نا غم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، صدمہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات کم ہوتے جاتے ہیں اور پھر غم روزگار، غم ہستی پر غالب آنے لگتے ہیں۔ سو باری باری سب اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تھے۔ خالہ، ماموں اور چاچو کو اس کی فکر تھی اور ان تینوں نے سطوت اور فرہاد سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ وہ دونوں کیوں کہ سارے حالات واقعات کے چشم دید گواہ تھے سطوت نے آسیہ کی زبیدہ سے محبت کی ایسی منظر کشی کی سب سراہے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ آسیہ مستقل آتی رہی تھیں اور عنایہ سے ان کی الفت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس لیے سب کو یقین کرنا ہی پڑا کہ عنایہ کی قسمت اچھی جگہ کھلی ہے۔ دس دن بعد انہوں نے آسیہ کے ساتھ پروگرام کر کے عنایہ کی رخصتی کر دی تھی۔ صغرا اور اس کی فیملی کو بہت کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا گیا اور گھر کو فی الحال تالا لگا کر بند کر دیا گیا۔ سب اپنے گھروں کو چلے گئے اور عنایہ کو صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ وہ کتنی اکیلی ہے۔ آسیہ اور اشعر کے ساتھ اشعر کے تایا، تائی اور ان کی بیٹی تھی۔ وہ پانچ بندوں پر مشتمل بارات تھی۔ جو اسے رخصت کروانے کے لیے آئی تھی۔ دو گھنٹوں کے اندر وہ اسے لے آئے تھے۔ دلہن بالکل خاموش تھی اور بے تحاشا روئی بھی تھی۔ تو یہ حقیقی بھی تھا اور فطری بھی مگر دولہا کیوں اتنا سنجیدہ و افسردہ تھا۔ یہ غیر فطری تھا۔ دوسروں کو عجیب بھی لگ رہا تھا مگر آسیہ جانتی تھیں کہ یہ سب اس کی دلی آمادگی سے نہیں ہوا۔ وہ بہت مشکل سے مانا تھا تو اس کا یہ رویہ ان کے لیے کچھ غیر متوقع نہیں تھا۔ ان کے دل میں اچھی امید تھی کہ یہ اتنی پیاری بچی اسے خود ہی اپنی محبت میں گرفتار کر لے گی۔ شادی کے بعد خود ہی سب ٹھیک ہو جاتے ہیں یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔ نکاح کے بول اپنے اندر اتنی طاقت ضرور رکھتے ہیں کہ میاں بیوی کو محبت کی لڑی میں پرو دیں۔

انہوں نے عنایہ کو اشعر کے کمرے میں لا بٹھایا۔ جس کی ہلکی پھلکی سجاوٹ اس طرح کی گئی تھی کہ نئے بیڈ کورز اور سائیڈ ٹیبلز پر گلدانوں میں تازہ اور خوش نما پھول سجا دیے گئے تھے۔ اشعر جب کمرے میں آیا تو وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ بہت ہی خاموش اور افسردہ ظاہر سی بات تھی کہ اس کا غم بھی بہت بڑا تھا۔

اشعر کو اس کے غم کا احساس تھا مگر جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ اس پر جھنجلائے ہوا تھا۔ وہ جو بہت تسلی سے، مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اچھا وقت جب حالات سازگار ہو جائیں اور وہ اپنی محبت کو اپنا سکے، اسے ہر طرف ذونائشہ ہی نظر آیا کرتی تھی۔ اس کمرے میں تو اس نے صرف ذونائشہ کو سوچا تھا۔ یہاں وہاں، گھومتی پھرتی، بیٹھتی پیار بھری باتیں کرتی۔ اس کی طرف سے پیار کے اظہار پر شرماتی اور اب یہ لڑکی اس نے قہرمان نگاہوں سے اسے دیکھا، کاش کہ اسے کوئی طلسم آتا تو وہ اسے دھواں بنا کر غائب کر دیتا۔ مارے غصے کے اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور خود ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

عنایہ اسی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ ہر چیز سے بے نیاز، اس نے تو ابھی تک یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ

جب بشر کو اس کی شادی کا علم ہوگا تو اس کیا حال ہوگا۔ ابھی اس کی سوچ کی لہروں سے بھی اس سوچ کا گزر نہیں ہوا تھا۔ جس سے زندگی بھر کا ناطہ جڑا تھا وہ تو اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچ رہی تھی ،وہ صرف اپنے بچپن، جوانی، اپنے گھر اور والدین کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، سب کچھ اس کے دماغ میں ایک فلم کی طرح گھوم رہا تھا۔ وہ سب جو کچھ دن پہلے تک ایک آسودہ حال گھرانے کی علامت تھا۔ جس میں نہ کوئی غم نہ تھا نہ ہی اندیشہ غم، پھر ایسی بادسموم چلی کہ سب خش وخاک کی طرح اڑتا چلا گیا۔

اس کی فرینڈز، رومیصہ شاندانہ اور عشاء اپنے والدین کے ساتھ آئی تھیں اور روز آتی رہیں۔ اس کی اچانک شادی اور رخصتی نے انہیں شاک پہنچایا تھا مگر وقت کا تقاضا بھی وہ دیکھ اور سمجھ رہی تھیں۔ اسے مقدور پھر تسلی تشفی کرواتی رہیں۔ مسلسل رابطے کے وعدے بھی کرتی رہیں اور تینوں نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے بشر کا تذکرہ تک نہیں کیا کہ وہ کس طرح اس سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے کتنا پریشان تھا اور اس کے والدین کی حادثاتی موت کا سن کر اس کے لیے کتنا دکھی اور فکر مند بھی۔ اب وہ اس قدر دکھی تھی کہ بشر کے متعلق کچھ بھی کہنا اس گھاؤ کو گہرا کرنے والی بات تھی۔ اس کی لیے بہتر تھا وہ پچھلا سب بھلا دے اور آگے دل لگانے کی کوشش کرے۔ اس لیے وہ اسے تسلی، دلاسے دیتی رہیں یہ اور بات کہ وہ کچھ سن بھی رہی تھی یا نہیں۔

☆☆☆

دن آہستہ آہستہ بیت رہے تھے۔ اور اشعر اور عنایہ کے معمولات بھی اسی طرح چل رہے تھے۔ اپنے اپنے گنبد میں قیدٗ اشعر نے تو گھر آنا بھی کم سے کم کر دیا تھا۔ کہاں وہ آٹھ بجے سے پہلے گھر آجایا کرتا تھا اور کہاں دس، گیارہ بج جاتے اور اس کا پتا نہیں چلتا تھا۔ عنایہ کو کہاں ہوش ہوتا کہ وہ اس کا آنا، جانا، نوٹ کرتی، یہ تو وہ تھیں، جو ماں ہونے کے سبب ہلکان رہتیں، آسیہ کو عنایہ پر بھی دل ہی دل میں غصہ آتا جو سر جھاڑ، منہ پہاڑ کی عملی تفسیر بنی پھرتی رہتی، لڑکیاں خود بھی تو میاں کو رجھانے کی اپنی طرف ملتفت کرنے کی کتنی کوشش کرتی ہیں پر یہ! انہوں نے اسے دیکھا۔

وہ گلاس وال سے نظر آتے درخت پر نظر جمائے کب سے یونہی ساکت تھی۔ پندرہ دن ہو گئے تھے اس کی رخصتی کو، مگر وہ ہنوز اسی صدمے میں قید اردگرد سے بے نیاز تھی۔ انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا اور خود ہی بات کا آغاز کیا تھا۔ ہلکی پھلکی باتیں، ادھر، ادھر کی، اپنے مرحوم شوہر کی اور اپنے دونوں بیٹوں کی۔

''اشعر نے اپنے پاپا کے انتقال کے بعد بڑی ذمے داری سے بزنس سنبھال لیا مگر میرا بشر، اسے تو شروع سے ڈاکٹر بننے کا جنون تھا تو اس نے میڈیکل ہی سلیکٹ کیا اور اشعر نے پوری طرح اس کی ذمے داری اٹھائی، یہاں اسے مکمل تعلیم دلوائی۔ پھر امریکہ بھجوایا؟'' وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر عنایہ کی سماعتوں کو تو بشر کے نام نے ہی جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''بشر، بشر ظہیر؟''

''تم جانتی ہو بشر کو؟'' آسیہ چونک گئیں۔

''آپ کے پاس ان کی کوئی تصویر ہے؟'' وہ دیکھ کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہی بشر ہے یا کوئی اور، یہ نام اتنا عام نہیں تھا۔ پھر سر نیم بھی وہی۔ اس کا دل بہت تیز دھڑکنے لگا تھا وہ جو اپنے آپ کو پتھر کی صورت ڈھال کر منہ پر نہ نظر آنے والی ٹیپ لگائے پھرتی تھی۔ بشر کا نام سنتے ہی سارا انجماد پگھل گیا تھا۔ وجود میں لرزش اتر آئی تھی اور ساری حسیات مجتمع ہو کر آنکھوں میں آسمٹی تھیں۔ وہ پوری جان سے آسیہ کی سمت متوجہ تھی جو ٹیبل سے اپنا فون اٹھا کر فوٹو گیلری اوپن کر رہی تھیں'' یہ ہے بشر!'' انہوں نے فون اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے فون لے کر دیکھا۔ وہی تھا۔ ہنستا، مسکراتا بشر ظہیر، جس سے ملے اور دیکھے بغیر، بات کیے بغیر دن نہیں گزرتا

تھا۔ جس کے علاوہ کسی اور سے شادی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا اس کے پاس آج قسمت کی ستم ظریفی کے سبب اسی کی بھابھی بنی بیٹھی تھی۔ وہ اشعر کا بھائی تھا۔ اس انکشاف نے اس کے جسم سے روح ہی کھینچ لی تھی۔ وہ دل جو ابھی کچھ دیر پہلے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ اب یوں تھم تھم کر چل رہا جیسے تھک کر رک جانا چاہتا ہو۔ آسیہ منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''یہی بشر ہے نا؟''

عنایہ نے فون ان کی طرف بڑھاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم کیسے جانتی ہو بشر کو؟''

''ہم ہاسپٹل جاتے تھے فارماسسٹ کے پاس تو سر نافع کریم کے پاس آیا کرتے تھے تو یوں تعارف ہوا تھا۔'' اس نے مناسب الفاظ میں بتایا۔

''جب سے اشعر کی شادی کا پتا چلا ہے۔ بے تاب ہوا جا رہا ہے کہ مجھے بھابھی کی تصویر بھیجو، اب کل بھجوائی ہیں میں نے ابھی تک کوئی ریسپانس نہیں دیا۔ آج فون کر کے پوچھوں گی کہ کیسی لگی بھابھی؟''

آسیہ اپنی دھن میں مگن بتا رہی تھیں اور اس کے اردگرد دھماکے ہونے لگے تھے۔ تو اس نے دیکھ لیا اسے اپنی بھابھی کے روپ میں، اسے پتا چل گیا۔ اف وہ کیا محسوس کر رہا ہوگا۔ اس پر کیا بیت رہی ہوگی؟

آسیہ نے اس کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔

''تم اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کر دو بیٹا۔ پہلے ہی کافی حرج ہو گیا ہے۔ اپنی دوستوں سے رابطہ کرو، ان سے کچھ معلومات لو اور پھر سے یونیورسٹی جوائن کر لو۔''

''میرا بالکل دل نہیں چاہتا۔ میں اب نہیں جاؤں گی۔'' اس کے لہجے میں بے زاری اور تھکاوٹ تھی۔ انہوں نے محبت سے چمکارا۔

''نہ میرا بچہ، دیکھو تمہارے پیرنٹس کو کتنی خواہش تھی کہ تم ایک اچھی فارماسسٹ بنو، اب اگر سٹڈیز کو ادھورا چھوڑ دو گی تو انہیں دکھ پہنچاؤ گی۔''

وہ موشنل کر کے ہی سہی مگر راضی کرنا چاہتی تھیں نہ یہ جو جمود اس پر طاری ہے وہ کسی طرح تو پگھلے پھر جب زندگی کی حرارت آئے گی۔ موڈ، مزاج تبدیل ہوگا تو وہ اشعر پر بھی توجہ دینے لگے گی۔ اتنا ہینڈسم اور خوب صورت شوہر پا کر وہ یقیناً خوش ہوگی اور اسے بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔ سو اس کا ماحول تبدیل کرنا بہت ضروری تھا۔ اور اس کے لیے انہیں ہی کوشش کرنی تھی وہ بچ مچ اٹھتے بیٹھتے اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

''عائشہ کا بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ ذیشان پہلے سے میرڈ تو ہے مگر بیوی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ سو اب دوسری شادی کے لیے عائشہ کو پسند کیا ہے۔ اچھے ویل آف لوگ ہیں۔ اب بس منگنی اور شادی کا طے ہونا باقی ہے۔''

ذونائشہ کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور خوشی پورے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی اور خوشی کیوں نہ ہوتی۔ اس کی اور اشعر کی شادی میں رکاوٹ ہی یہی تھی۔ اس کی بہن عائشہ پیدائشی لنگ کا شکار تھی۔ ہلکی سی لنگڑاہٹ جس کی وجہ سے اس کا کہیں رشتہ طے نہیں ہو پاتا تھا۔ اور ان کے والدین بڑی بیٹی کو بٹھا کر چھوٹی کا رشتہ طے کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس صورت میں جب کہ بڑی بیٹی میں پیدائشی نقص بھی ہو تو مزید مسائل بھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ذونائشہ کی طرف سے تسلی تھی کہ وہ ہر طرح سے پرفیکٹ ہے۔ اس لیے اس کے رشتے وشادی کی طرف سے بھی بے فکری تھی۔ وہ اپنی ممی کو اشعر کے متعلق سب بتا چکی تھی اور اچھے وقت کے انتظار میں تھی اور اب وہ اچھا وقت آیا ہی چاہتا تھا تو وہ خوش کیسے نہ ہوتی۔

دوسری طرف اشعر ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

کہتا بھی کیا۔ کب سے وہ اس انتظار میں تھا کہ کب ذونائشہ کی بہن کا رشتہ کہیں طے ہو اور وہ مام کو اس کے گھر لے جائے اور اب جب......؟؟ قسمت کی اس ستم ظریفی پر وہ تو ہنس بھی نہیں سکتا تھا۔ ذونائشہ اس کی طرف سے شدید ردعمل کی متوقع تھی۔ اسے خلاف توقع یوں ٹھس پا کر قدرے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا ''کیا ہوا شعر، تم نے کوئی رسپانس نہیں دیا؟''

''اوہ، ہاں'' وہ چونکا، پھر اسے دیکھا''ہاں مبارک ہو بہت خوشی ہوئی''۔ پھیکی سی مسکراہٹ اور لہجے کا خالی پن، ذونائشہ نے اس بار واضح حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا پرابلم ہے اشعر؟''

''نہیں تمہیں کیوں لگا؟''

''میں تو سمجھی تھی تم بہت خوش ہوگے لیکن لگ تو نہیں رہا۔''

وہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''نہیں، وہ ایکچوئلی ایک بزنس پرابلم میں مینٹلی الجھا ہوا تھا اس لیے۔ مینی مینی کانگریٹس...... پھر اور کیا ڈن ہوا؟''

وہ اسے اپنی باتوں میں الجھا کر اس کا دھیان ہٹانے میں کامیاب رہا تھا۔ ذونائشہ کے تو فرشتوں کو بھی اس کی نام نہاد شادی کا علم نہیں ہو پایا تھا۔

☆☆☆

آسیہ ایک پیاری سی، طرح دار اور اسمارٹ لڑکی کو لیے اس کے پاس آئیں، ''یہ میرے جیٹھ اور بہن دونوں کی بیٹی ہے عائلہ اور عائلہ یہ تمہاری بھابھی عنایہ۔'' عائلہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عنایہ نے بھی ہلکا سا مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''یہ اپنی فرینڈز کے ساتھ ٹرپ پر اسلام آباد گئی ہوئی تھی، اس لیے تم دونوں کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔''

عائلہ، عنایہ کے پاس بیٹھ کر خوش دلی سے باتیں کرنے لگی۔ اپنے بارے میں بتایا کہ وہ تین بہنیں ہیں۔ سب سے بڑی نائلہ جو شادی کے بعد آئرلینڈ میں ہوتی ہے۔ اس سے چھوٹی شمائلہ بشر کی کلاس فیلو تھی اور اب وہ بھی شادی شدہ ہو کر اسلام آباد جا بسی تھی اور اپنے ڈاکٹر میاں کے ساتھ ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہی تھی۔ خود وہ سائیکالوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

''میں بھی ڈاکٹر ہی بننا چاہتی تھی لیکن میرے مارکس کم تھے اور پرسنٹیج نہیں بن پائی تو بشر نے چھیڑ چھیڑ کر میرا ناک میں دم کر دیا۔ میں اتنا روئی، اتنا روئی کہ سب نے اسے ڈانٹا اور مجھے سمجھایا کہ سائیکالوجی لے لو۔ وہ بھی تو ڈاکٹر ہوتے ہیں اور عام ڈاکٹر کے مقابلے میں ان کی اہمیت بھی بہت ہوتی ہے۔ مگر بشر!'' اس نے سر کو دائیں، بائیں مایوسی سے ہلایا۔ ''وہ میرا مذاق ہی اڑاتا رہا کہ تم نے بس ڈاکٹر کا ٹیگ ہی اپنے نام کے آگے لگوانا تھا۔''

اس کے پاس بشر کی نہ ختم ہونے والی باتوں کا ذخیرہ تھا۔ ان کی آپس میں چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق تحائف کا لین دین، وہ تو جیسے کسی اور ہی بشر کی داستان سنا رہی تھی۔ عنایہ کے ساتھ بھی اس کی ہلکی پھلکی شرارت چلتی تھی مگر عنایہ کو وہ اپنے ذومعنی جملوں میں بہت الجھاتا تھا۔ اس سے محبت کا بار بار اظہار کرنا اور جواباً اس سے اظہار چاہنا۔ خیر عائلہ اس کی کزن تھی تو اس لیے ہو سکتا تھا۔ وہاں بے تکلفی بھی اور طرح کی ہو لیکن اصلی دھماکا تو آسیہ نے کیا تھا یہ کہہ کر وہ شروع سے عائلہ کو بشر کے لیے سوچ کر بیٹھی ہیں۔

''آپس میں تو ہم بہنوں نے کب سے بات کی ہوئی ہے مگر ذکر اس لیے نہیں کرتی تھیں کہ بچوں کے رجحان کا کچھ علم ہو پر شکر ہے۔ دونوں کی بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ایک دوسرے کو چھیڑے بغیر تو کھانا نہیں ہضم ہوتا۔'' آسیہ پیار سے دونوں کے متعلق بتا رہی تھیں اور عنایہ جس کا سکتہ ہی بشر کے نام سے ٹوٹا تھا۔ اپنے دھڑ دھڑاتے دل اور الٹ

پلٹ ہوتے دماغ کے ساتھ یہ سب سن رہی تھی۔ بشر کس کے ساتھ سینسئر تھا اس کے ساتھ یا عائلہ کے ساتھ اگر اس کی بات عائلہ سے طے تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ بھی تھے تو اس کے ساتھ اس نے کیا کھیل کھیلا تھا۔ وہ ساری محبت، وہ ملنا، فون کرنا، امریکا جا کر بھی مخصوص ٹائم پر ویڈیو کالز کرنا، وہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ دھوکا تھا۔ اس کے دل سے ٹیس اٹھی تھی۔

یا اللہ، وہ کس صدمے کو برداشت کرے، کس کس دکھ کا مقابلہ کرے، ایک سے بڑھ کر دوسرا دکھ، ایک کے بعد دوسری آزمائش وہ تو اتنے دن سے یہ سوچ سوچ کر ادھ موئی ہو گئی تھی کہ جب بشر کو اس کی شادی کا پتا چلے گا اور خاص طور پر یہ کہ وہ اسے اپنی ہی بھابھی کے روپ میں دیکھے گا تو اسے کیسا دھچکا لگے گا۔ کتنا دکھ ہوگا لیکن اب تو یہ سوچ اسے سراسر اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہو رہی تھی۔ بھلا بشر کو اس کی شادی ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا، وہ تو اس کے ساتھ ٹائم پاس کر رہا تھا۔ اسے بے وقوف بنا رہا تھا اور وہ بن رہی تھی۔ دکھ کی شدت سے اس نے لب بھینچ لیے تھے اور پھر سے خاموشی کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی۔

☆☆☆

''یہ میں نے کیا سنا ہے اشعر!'' آئی کانٹ بلیو ڈیٹ وہ ابھی اسکوائش کورٹ سے باہر آیا تھا۔ پسینے سے شرابور، پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کرسی پر بیٹھا وہ جوس پی رہا تھا۔ شام مغرب میں تبدیل ہو کر رات میں ڈھلنے والی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا۔ اس کا پسینا سکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جوس کے سپ لیتا گہری سوچ میں تھا مگر ذونائشہ کے غیر معمولی انداز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''کیا سن لیا تم نے ایسا؟''

''تم نے شادی کر لی ہے؟'' اس نے ایسے پوچھا جیسے جو کہہ رہی ہو اس پر خود بھی یقین نہ کر رہی ہو۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی اس کے لہجے میں اس کے چہرے کے ہر نقش میں اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے چھلکتی۔ گردن دائیں، بائیں ہلاتی، اشعر اگلا گھونٹ لینا بھول گیا۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

کچھ توقف کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوا۔

''جس نے بھی بتایا، تم کلیئر کرو کہ یہ سچ ہے یا نہیں؟''

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' وہ محتاط نظروں سے اسے دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔ ذونائشہ نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔

''یہ پہیلیاں نہیں بجھواؤ مجھ سے صاف بات کرو۔''

''اگر ہوئی بھی تو......'' وہ تمہید باندھنے لگا تھا کہ وہ ایک دم سے چلائی تھی۔

''نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے اشعر، تم ایسا کر ہی نہیں سکتے، ہرگز نہیں۔'' وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔ ''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے، اتنا بڑا دھوکا نہیں دے سکتے۔ اشعر تم نے مجھ سے انتظار کا وعدہ کیا تھا اور صبر سے، تحمل سے انتظار کیا بھی پھر اب جب ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ منزل تک جانے والے سب راستے صاف ہو گئے تو تم ایسا گڑھا کیسے کھود سکتے ہو کہ جس میں گر کر میں ہی فنا ہو جاؤں۔''

اور یہ تو جب سے شادی نام کا پھندہ گلے پڑا تھا اشعر تب سے خوف کے پل صراط پر چل رہا تھا۔ اگر ذونائشہ کو پتا چل گیا۔ پھر کیا ہوگا۔

سب کہنا فضول ہے، بے کار ہے، وہ کچھ سننے والی نہیں، وہ ضاحتیں سننے نہیں بلکہ ایک مضبوط انکار سننے آئی ہے کہ وہ اسے یقین دلائے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ اندیشہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر لایا کہ کہیں اشعر یہ نہ کہہ دے کہ یہ سب سچ ہے۔ وہ جو اندیشہ اسے ہولا رہا تھا وہ اندیشہ ہی تو نہیں تھا پر اشعر یہ کیسے کہہ دیتا یہی تو اسے

سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''تم جب کیوں ہو اشعر! حقیقت کیا ہے۔ بتا کیوں نہیں دیتے''؟

''جو بتاؤں گا وہ حقیقت ہی ہوگی۔ میرا یقین رکھنا۔''

وہ نرمی سے گویا ہوا اور دھیمے لہجے، نرم آواز میں اسے سب بتاتا چلا گیا۔ ذونائشہ دم بہ خود تھی۔

''تو یہ سب سچ ہے۔'' بہت دیر بعد وہ سرگوشی نما آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اس بار اشعر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

''ہاں سچ ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ میرا اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں اور میں یہ تعلق نبھاؤں گا بھی نہیں۔ اسے مجبور کردوں گا کہ وہ خود ہی مجھ سے علیحدگی لے لے، میں اسے کسی صورت اپنے گھر میں نہیں بساؤں گا۔''

''بسانے کے بعد کہہ رہے ہو کہ نہیں بساؤں گا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولی تھی، اشعر نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

''وہ تمہارے گھر تمہارے کمرے میں موجود ہے اور تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں گریٹ'' اس نے ہلکی سی تالی بجائی۔ ''ایسی باتیں کہانیوں میں تو اچھی لگتی ہیں حقیقت میں ممکن ہی نہیں۔'' ذونائشہ کے لہجے میں تپش تھی۔ جو وہ اشعر کی شادی کا سن لینے کے بعد اس کے وجود کو جھلسا رہی تھی۔

''مگر مجھے ناممکن کو ممکن بنانا آتا ہے'' اشعر کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ ''اگر وہ میری بیوی حیثیت پا چکی ہوتی تو میں اس وقت یہاں تمہیں وضاحتیں دینے کے بجائے وہاں بیٹھا اس کے حسن کو خراج پیش کررہا ہوتا۔''

''حسن! یعنی حسین بھی ہے۔'' وہ ابرو اٹھا کر طنزیہ مسکرائی تھی۔

''تمہیں پرابلم کیا ہے؟ شادی مجھ سے کرنی ہے نا تو میں حاضر ہوں تم سے شادی کے لیے۔ اس کو چھوڑو، وہ ہم دونوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے ممی لائی ہیں۔ ممی ہی جانیں۔'' اشعر نے جھنجلا کر جوس میز پر پٹخا۔

''تم مجھ سے بھی شادی کرلوگے۔ اس سے تو کر ہی رکھی ہے اور تمہیں لگتا ہے۔ میں مان جاؤں گی۔'' ذونائشہ کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا تھا۔ ''تمہیں مجھ سے محبت ہے تو اسے چھوڑنا ہوگا۔ میں اس کی موجودگی میں تو تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔'' وہ اٹھ گئی۔ اشعر نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔

''تمہاری مرضی، بس یہ یاد رکھنا کہ تم میری محبت اور وہ محض منکوحہ۔'' وہ بھی اٹھ گیا تھا۔ ذونائشہ نے کرسی کی بیک اتنے زور سے پکڑی تھی کہ اس کی انگلیاں بھی سفید پڑ گئی تھیں۔ اشعر نے نرمی سے اس کا ہاتھ کرسی سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں بہت نرمی سے بہت محبت سے دبالیا۔ ''آئی لو یو ویری مچ، مائے سوئیٹ ہارٹ''۔

''یہ کیسی محبت ہے جس میں کوئی اور بھی شریک ہے؟''

اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی، اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اشعر کے لمس نے اسے اندر سے کمزور کردیا تھا۔

''شریک تو بہت دور کی بات، اس کی تو پرچھائیں تک نہیں ہے۔ میرے دل میں، میں نے کبھی اسے دانستہ دیکھا تک نہیں، نہ ہی میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے دیکھو، یہ اشعر ظہیر کا دل ہے۔ یہاں جو بس گیا، بس وہی اس کا مالک ہے۔ ہر کسی کے لیے شاہراہ عام نہیں ہے یہ۔''

اس نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھنے چاہے مگر ذونائشہ ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہوگئی اور پرس میں سے ٹشو نکال کر اپنے چہرہ کو صاف کرکے تھپتھپایا۔

''اوکے بائے۔'' وہ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ تمہارے لیے کچھ ڈریسز لائی ہوں۔ انہیں استعمال کرو اور تھوڑا سا میک اپ اور جیولری

بھی استعمال میں لایا کرو، کیوں ہر وقت یہ سادہ سا حلیہ بنائے پھرتی ہو۔ بیٹا سہاگنیں ایسی نہیں ہوتیں۔ ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ پھر تو ویسے ہی مصروفیات زندگی الجھا کر رکھ دیں گی۔'' آسیہ آنٹی نے تین بھاری بھرکم شاپنگ بیگز اسے پکڑائے تھے جو اس نے بے دلی سے تھام ایک طرف رکھ دیے تھے۔

''نہیں ایسے نہیں، انہیں کھول کر دیکھو، جو کمی نظر آئے۔ وہ پوائنٹ آؤٹ کرو اور ایک سوٹ جو سب سے زیادہ پسند آئے وہ مجھے پہن کر دکھاؤ۔

وہ آج ٹھان کر آئی تھیں کہ اسے کچھ تو اس کے خول سے نکالنا ہی ہے۔ بھلا کہیں سے وہ شادی شدہ لڑکی دکھتی ہے ہر وقت اپنے آپ میں گم تو اشعر کا بھی کیا قصور، وہ کیا توجہ دے اس پر'' خود ہی توجیہہ دے کر وہ آگے بڑھیں اور شاپرز بیڈ پر الٹ دیے اور سارے جوڑے کھول کھول کر اسے دکھانے لگیں۔

پھر ایک لائٹ براؤن شرٹ، جس پر سبز، سفید اور گلابی رنگوں سے ایمبرائیڈری کی ہوئی تھی۔ اس پر گلابی ڈوپٹا اور سفید ٹراؤزر والا سوٹ نکال کر اسے دیا کہ وہ بھی پہن کر دکھائے۔

وہ سوٹ ان سے لے کر واش روم چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں نہا کر، وہی لباس پہن کر ان کے سامنے آئی تو بے ساختہ ''ماشاءاللہ'' کہتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ خوب صورت تو وہ ویسے ہی بہت تھی۔ تھوڑی سی تیار ہو کر تو روپ ہی انوکھا لگنے لگا تھا۔ اس نے بہت لائٹ سا میک اپ بھی کرلیا تھا۔

''وہ لاکٹ سیٹ پہن لو اس کے ساتھ۔ سہاگن ایسے ناک، کان، گلا خالی کرکے پھرتی اچھی نہیں لگتی، جاؤ، پہن کر میرے پاس آجاؤ۔''

وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ان کی آنکھوں میں فتح کی چمک لہرائی تھی۔ یہ ان کی پہلی فتح تھی اس کو اپنے خول سے نکالنے کی۔ بے شک اس کم عمر لڑکی کا غم بہت بڑا تھا مگر وہ ساری عمر تو غم کے اس گنبد میں قید نہیں رہ سکتی تھی۔ اور خود سے باہر بھی نہیں آسکتی تھی۔ کسی کو یہ ہمت کرنی ہی تھی اور آج آسیہ نے یہ ہمت کر دکھائی تھی۔ وہ نیکلس سیٹ پہن کر آگئی۔ انہوں نے بازو پھیلایا۔

''ادھر آ میرا بچہ''۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''اب تم اپنی پڑھائی بھی شروع کردو، میں اشعر سے کہوں گی کہ وہ تمہیں یونیورسٹی لے جائے۔ یا تم عائلہ کے ساتھ چلی جاؤ وہ بھی تو جاتی ہے نا، یوں تو گھر بیٹھے بیٹھے ٹائم ہی ویسٹ ہورہا ہے۔ مصروفیت سے دل بھی بہل جاتا ہے۔''

''اب تو اتنی چھٹیاں ہوگئیں۔'' دھیمی سی آواز میں وہ منمنائی۔

''تو کیا ہوا بیٹا، تھوڑی سی زیادی محنت کرلینا۔ سب کور ہوجائے گا۔'' وہ خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی، انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

☆☆☆

آج جیسے اس نے ذونائشہ کو منایا تھا۔ اس کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ اس نے سچے دل سے اسے چاہا تھا اور وہ بھی اس سے ویسی ہی محبت کرتی تھی۔ اس میں اشعر کو کبھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا اور آج اپنی محبت کو یوں اپنے سامنے روتا ہوا پا کر دل بہت دکھا تھا۔ بہت زیادہ۔ گھر آتے ہی وہ اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نہا کر، چینج کرکے وہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا ہی تھا کہ عنایہ آگئی۔

''چائے لاؤں؟''

اشعر کی بھنویں سمٹیں۔ اس نے سر اٹھا کر ناگواری سے اسے دیکھا، اچھا لباس، میک اپ، جیولری، اس نے جھٹکے سے لیپ ٹاپ بیڈ پر پھینکا اور تیزی سے کھڑا ہوا، وہ بے اختیار پیچھے ہوئی تھی۔

''تمہیں کس نے میری چائے کی فکر کرنے پر لگایا ہے اور یہ اتنی تیار ہوکر کس لیے گھوم رہی ہو؟'' اس کے تیور پل پل بدل رہے تھے وہ اس کے قریب

آیا تو وہ ڈر کر دو قدم مزید پیچھے ہوئی۔
"آنٹی نے کہا ہے۔"
"کیا کہا ہے؟" وہ پھنکارا تھا "یہ کہ یوں تیار ہو کر میرے آگے پیچھے پھرو تا کہ میں تمہیں بیوی کی حیثیت سے قبول کرلوں"؟ مارے شرم کے عنایہ کا برا حال تھا۔

"اس غلط فہمی کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دو کہ ایسا کچھ ہوسکتا ہے۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ میں تمہیں کبھی یہ مقام نہیں دوں گا۔ یہاں صرف وہ آئے گی۔ جس سے مجھے محبت ہے۔ جس سے میری کمٹمنٹ ہے، تم صرف مام کی ذمے داری ہو، میری نہیں۔" وہ شعلے اگل رہا تھا اور عنایہ کھڑے کھڑے زمین میں دھنس رہی تھی۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی جو اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کی زبان بھی پتھر کی سل بن چکی تھی۔ کوئی حرکت نہیں تھی اس میں کہ وہ اپنی صفائی کے لیے کچھ کہہ پاتی۔ وہ پھر شروع ہوگیا۔

"اپنی حد میں رہو، میں صرف مام کی وجہ سے لحاظ کررہا ہوں ورنہ تمہیں اپنے بیڈ روم میں پاؤں بھی نہ رکھنے دوں فی الحال تم یہاں سے چلی جاؤ تو بہتر ہے۔" اس کے لہجے کے زہر نے عنایہ کے لیے ڈنک کا سا کام کیا تھا۔ وہ چونک کر حواسوں میں آئی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ نیچے جانے کے بجائے وہ سامنے خالی کمرے میں چلی آئی یہاں کم از کم وہ اپنے دکھوں کا، اپنی بدنصیبی کا، اپنی بے عزتی کا کھل کر ماتم تو کرسکتی تھی، جی بھر کر رو تو سکتی تھی۔

وہ اپنی ماں کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا مگر عنایہ کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔ اس لیے اسے وہ جتنا ہوسکتا تھا، اتنا دکھ دے رہا تھا۔ جی بھر کے بے عزت کرتا تھا۔ اس کی نظر میں زبردستی کے نکاح کے بعد وہ اتنی بے وقعت ہوچکی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ہر طرح کا سلوک روا رکھنے کے لیے آزاد تھا۔ اب اس کی یہی حیثیت تو رہ گئی تھی کہ اس کے ساتھ جو مرضی کیا جائے نہ کوئی پوچھنے والا۔ نہ کوئی روکنے والا وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد، جس کا ہر لاڈ وہ اٹھاتے تھے اور آج یوں دنیا کے بے رحم سمندر میں اس کی خوف ناک لہروں کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اکیلی رہ گئی تھی، وہ جتنا روتی کم تھا۔ سو وہ روتی رہی۔ پھر اس کے سو جانے کا یقین کرکے ہی کمرے میں آئی تھی۔

☆☆☆

آسیہ اور رابعہ آنٹی اپنی کسی جاننے والی کے گھر جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ تو عنایہ کی تنہائی کے خیال سے رابعہ، عائلہ کو بھی ساتھ لے آئی تھیں۔

"ہم شفیع صاحب اور ان کی بیگم کو حج کی مبارک باد دینے جارہے ہیں۔ تم دونوں بہنیں آپس میں انجوائے کرو۔" اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ عائلہ کی کمپنی بہت اچھی تھی۔ وہ بہت ہنس مکھ اور باتونی تھی۔ اب بھی اسے ساتھ لیے کچن میں چلی آئی۔ دو ملازمائیں جو کچن کے کاموں پر مامور تھیں۔ انہیں باہر بھجوایا اور خود عنایہ کے ساتھ مل کر کباب، نگٹس اور اسنیکس فرائی کیے۔ چائے تیار کی اور لاؤنج میں لے آئیں، کھاتے، پیتے، اس کی زبان بھی چلتی رہی۔

"اب اس بشر کو دیکھو کتنے دن ہوگئے نہ فون پر بات، نہ اسکائپ پر، میرا فون ہی نہیں اٹھا رہا تو میں نے خالہ کے فون سے کال کی، ایسے بولا آگے سے جیسے بیمار ہو، خالہ تو بہت پریشان ہوئیں۔ وہ تو میں نے کہا خالہ چھوڑیں، پورا ڈرامہ ہے بلکہ فلم ہے۔ آپ کی یاد آئی ہوگی تو آپ کو اموشنل کرنے کے لیے ایکٹنگ کررہا ہے۔ کچھ دن کے لیے چھوڑ دیں اسے، ٹھیک ہوجائے گا۔"

عائلہ اپنے ازلی لاابالی پن سے بول رہی تھی اور عنایہ ہاتھ میں کباب لیے، ساکت رہ گئی تھی۔ یہ نام اور اس نام کا مالک شخص اس کے دل کے نگر کا مالک تھا۔ راج کرتا تھا اس پر۔ وہ جو اس کی محبت میں اس طرح مبتلا تھی کہ وہ اسے ہر پل اپنے قریب محسوس ہوتا تھا، اب ہر چند کہ وہ اپنے آپ کو اس کے

متعلق سوچنے سے روکنے کی بہت کوشش کرتی تھی مگر سوچیں کب کسی کی مرضی کی پابند ہوتی ہیں۔ اگر ہوتیں تو وہ بہت سی سوچوں کو تالا لگادیتی کہ جن کو سوچ کر اسے صرف اذیت ملتی تھی ماں باپ کو سوچتی تو اذیت، بشر کو سوچتی تو اذیت، یہ یادیں، یہ سوچیں اس کے لیے ہر پل سلگتی بھڑکتی آگ بن گئی تھیں جو ہر پل اس کے دماغ کو جلا جلا کر خاک کررہی تھیں وہ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کو مقسوم سمجھ کر اپنی قسمت پر شاکر ہونا بھی چاہتی تو اشعر اور عائلہ اپنے اپنے رویوں اور باتوں سے سارے درد پھر سے جگا دیتے۔ انداز دونوں کا مختلف تھا مگر نتیجہ بشر کی یاد کی صورت میں ایک ہی تھا۔

"میں نے کہا خالہ اب تو اس کے فائنل ایگزیمز بھی ہوگئے ہیں تو واپس کیوں نہیں آرہا۔ آپ کہیں نا اسے۔"

عائلہ کی بات پر عنایہ کو سانس لینا دوبھر ہوگیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ واپس بھی آئے گا۔ یہیں، اسی گھر میں، اس کے سامنے، عائلہ مزید کہہ رہی تھی۔

"پتا نہیں خالہ کی اور اس کی کیا بات ہوئی، خالہ آئیں تو پوچھوں"۔

خالہ تو کیا آتیں فون آگیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی حالت میں ہاسپٹل میں ہیں۔ ان کو کوئی سیریس چوٹ تو نہیں آئی مگر بائیں ٹانگ اور پاؤں کے ٹخنے پر شدید چوٹ آئی تھی اور اب بہت دن تک انہیں بیڈ ریسٹ کرنا تھا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سورج اپنی تپش سب پر الٹ کر اب کچھ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ عنایہ، آسیہ آنٹی کی ٹانگ کی ہلکے ہاتھ سے مالش کرکے باہر لان میں چلی آئی۔ پھول، پودے سارے دن کی دھوپ برداشت کرکے کملائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اب ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور بہت اچھی محسوس ہورہی تھی۔ چڑیاں، کوے اور کچھ فاختائیں ادھر، ادھر پھرکتی پھر رہی تھیں۔ وہ لان کو جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور اتنے انہماک سے انہیں دیکھنے لگی جیسے اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہ ہو۔

"ہیلو!" اس کے قریب سے بھاری، مردانہ آواز آئی تھی، اس نے چونک کر اوپر دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ساکت رہ گئی۔ وہ کیا ہر چیز ہی ساکت رہ گئی تھی۔ چلتی ہوا، پرندوں کی چہکار، پودوں کی سرسراہٹ، سب رک گیا تھا۔ کہ منظر ہی اتنا ناقابل یقین تھا۔ اس کے سامنے بشر کھڑا تھا۔ بشر، ڈاکٹر بشر ظہیر، ایک بیگ نیچے رکھے، ایک کندھے سے لٹکائے براؤن پینٹ، آف وائٹ شرٹ اور براؤن کیپ لگائے بہت سنجیدہ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں ہی اپنی طرف دیکھتا پاکر وہ کھنکارا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام" وہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی تو وہ آگے بڑھ گیا اور سیدھا آسیہ کے کمرے میں گیا تھا۔ عنایہ کسی ہپناٹائزڈ معمول کی طرح چلتی ہوئی لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ آگیا تھا۔ وہ یعنی بشر ظہیر جسے دیکھنا جس سے ملنا، بات کرنا، اس کی زندگی کی تمنا ہوا کرتا تھا۔ جو اس کے حسین خوابوں کی تعبیر تھا۔ اب اس کے لیے نامحرم ہوچکا تھا۔ اس کی یہ حیثیت جس میں وہ اس کا سامنا کرنے کے خیال سے بھی خوف زدہ ہوجاتی تھی۔ اسی حیثیت میں اس کا سامنا کرلیا اور کوئی طوفان نہیں آیا۔ وہ آیا۔ اسے دیکھا اور خاموشی سے اندر چلا گیا۔ نہ شکوہ، نہ گلہ، نہ ہی کوئی فرد جرم عائد کی اور نہ کوئی الزام تراشی ہی کی۔

"عنایہ، عنایہ بیٹا!" آسیہ اسے پکار رہی تھیں۔
وہ سر جھٹک کر تیزی سے ان کے پاس آئی تھی۔

"ملی بشر سے، دیکھو تو کیا سرپرائز دیا ہے اس نے بغیر کسی کو بتائے اچانک آیا ہے۔ بشر یہ تمہاری بھابھی۔" آسیہ کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بشر ان کے بیڈ کے

پاس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ویسا ہی سنجیدہ اور خاموش عنایہ نے مکمل توجہ آسیہ کی طرف مبذول کی جو اسے مختلف ڈشز کے نام بتارہی تھیں جو اسے ڈنر کے لیے بنوانی تھیں۔ ''فی الحال اچھی سی چائے، میرے بیٹے کے لیے''

اصل رونق تو رات میں لگی تھی۔ جب رابعہ، عائلہ اور اشعر سب آئے تھے۔ سب ہی چہک رہے تھے۔ اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کررہے تھے اور وہ بہت دھیما دھیما سا مسکراتا۔ کسی کسی بات کا جواب دیتا اور پھر چپ اور سنجیدہ ہوجاتا۔ جب عنایہ سارے کاموں سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں جانے لگی تو وہ بھی اس کے بالکل پاس سے گزر کر برابر والے کمرے میں چلا گیا تھا۔ عنایہ کو صحیح کا جھٹکا لگا تھا۔ ''تو یہ برابر والے کمرے میں'' وہ چکرا گئی۔ ایک بار آسیہ نے تذکرہ کیا تو تھا کہ اوپر والے بیڈرومز ان دونوں بھائیوں کے ہیں مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اشعر کا بھائی کون ہے۔ اس نے ایک نظر اس کے بند دروازے پر ڈالی اور بھاری قدم گھسیٹتی ہوئی اپنے صوفے پر آگئی۔

☆☆☆

وہ اپنی دوستوں سے نوٹس منگوا کر، سب ری کور کرکے یونیورسٹی جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی میں ایسی مگن ہوئی کہ اشعر کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ''مجھے نیند آرہی ہے تم ایسا کرو، نیچے اسٹڈی میں جاکر پڑھ لو۔''

وہ درشتی سے کہتا ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ اسٹڈی روم؟ اسٹڈی روم نیچے تھا اور نیچے آسیہ اور بشیراں کب کی سوچکی تھیں۔ ویران، سنسان لاؤنج اور نیچے کا سارا پورشن بھائیں، بھائیں کرتا ہو وہ منظر کشی کرکے خود ہی گھبرا گئی۔

''میں ٹیبل لیمپ چلا لیتی ہوں۔ آپ دوسری لائٹس آف کردیں'' وہ باہر آیا تو وہ جلدی سے بول پڑی۔ اشعر نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور حتمی لہجے میں انکار کیا تھا۔

''نہیں۔''

وہ خاموشی سے اپنا فولڈر اور لیپ ٹاپ لے کر سامنے والے کمرے میں آگئی۔ یہاں کم از کم یہ تو تسلی تھی کہ وہ دونوں بھائی اوپر ہیں۔ ویسا سناٹا تو نہیں۔ جیسا نیچے ہے۔ وہ پھر سے پڑھنے میں مگن ہوجاتی کہ مما یاد آگئیں۔ وہ جب اس طرح ڈوب کر اسٹڈیز کررہی ہوتی تھی تو وہ اس کے لیے بار بار چائے، کافی، دودھ، یا ڈرائی فروٹس لایا کرتیں۔ عنایہ کی آنکھیں بھیگ گئیں، کہاں، کہاں نہیں یاد آتی تھیں۔ وہ آج وہ لاوارثوں کی طرح بیٹھی تھی اور سچ مچ لاوارث ہی تو تھی وہ کون تھا اسے دیکھنے اور پوچھنے والا، اتنے دنوں کے بعد پڑھنے بیٹھی تھی، اور پرانی عادت کے بموجب اسے چائے کی طلب ہورہی تھی مگر نیچے جاکر چائے بنانے کا تصور ہی اتنا ہولناک تھا کہ وہ پھریری لے کر سیدھی ہوگئی۔ اتنے میں بھڑا ہوا دروازہ ناک ہوا اور پھر کھلتا چلا گیا۔ اس نے حیرت سے اور کسی قدر خوف سے دیکھا۔ بشر اندر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی اور اس میں کافی کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں بسکٹ تھے وہ حیران سی آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے ٹیبل پر ٹرے رکھی اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا کافی بنالیتا ہوں۔'' بہت دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ ''تم تو گرم پیتی ہونا۔ لے لو اپنا کپ'' ساتھ ہی کپ اٹھا کر عنایہ کے سامنے رکھا۔

''ایکچوئلی اشعر کو عادت نہیں ہے روشنی میں سونے کی وہ مکمل اندھیرا کرکے ہی سوتا ہے۔'' رات کے سناٹے میں بشر کی دھیمی آواز بھی واضح تھی۔ عنایہ سن رہ گئی تھی۔ وہ کب سے منتظر تھی کہ وہ اس سے یہاں بیٹھ کر پڑھنے کا سبب پوچھے گا مگر وہ تو سب جانتا تھا پھر کیوں پوچھتا۔

''کچھ مشکل لگے تو پوچھ لو۔ میڈیکل اور فارمیسی کو ایک ہی چیز سمجھ لو۔'' وہ مبہم سا مسکرایا اتنا کہ ہونٹ بس ذرا سا پھیل کر پھر سے آپس میں مدغم

ہوگئے۔ عنایہ نے نفی میں سر ہلایا اور کافی پینے لگی، کمرے میں پھر سے خاموشی کی حکومت تھی۔

جب پلکیں شہر کے رستوں پر
اشکوں کا نور لٹاتی تھیں
جب سانسیں اجلے چہروں کی
تن من میں پھول سجاتی تھیں
جب چاند کی رم جھم کرنوں سے
سوچوں میں بھنور پڑجاتے تھے
ہر عہد نبھانے کی قسمیں
خط خون سے لکھنے کی رسمیں
اب اپنی گم صم آنکھوں میں
کچھ دھول ہے بکھری یادوں کی

اور اس دھول نے آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔ عنایہ کو کپ سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک تو اس کی موجودگی میں یہ خوف غالب آجاتا تھا کہ وہ یہ نہ پوچھ لے کہ تم نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا۔ کسی اور کی دلہن کیسے بن گئیں۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی دھیمی آواز ابھری۔

''کافی ختم ہوگئی تو کپ دے دو'' عنایہ نے بغیر دیکھے کپ ٹرے میں رکھ دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں کل الیکٹرک کیٹل اور کافی میکر اوپر لے آؤں گا'' وہ ٹرے لے کر دروازے کے پاس پہنچا ''اوکے گڈ نائٹ''

''گڈ نائٹ'' وہ آہستگی سے کہتی لیپ ٹاپ پر جھک گئی۔ بلاشبہ کافی نے اس کے اندر نئی توانائی جگا دی تھی۔

☆☆☆

کب سے دونوں یونہی خاموش اور گم صم بیٹھے تھے کہنے سننے کو شاید کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ وہ عائشہ کی شادی کا کارڈ لے کر آئی تھی اور اس کے بعد یونہی چپ بیٹھی ٹیبل کی گلاس ٹاپ کو گھور رہی تھی۔ اشعر بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے فون کی بیل نے دونوں کے درمیان موجود خاموشی کو غائب کیا تھا۔

''ہیلو۔ جی ممی؟''

''میں عنایہ بات کررہی ہوں۔ آنٹی کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو وہ آپ کو بلارہی ہیں؟'' دوسری طرف سے آتی ہوئی آواز بہت خوب صورت اور کھنکتی ہوئی تھی۔ ذونائشہ نے چونک کر سخت تعجب سے اشعر کو دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر حیران و پریشان تھا۔

''تو بشر سے کہہ دیتیں نا۔'' اس کی آواز میں سرد مہری اتر آئی تھی۔

''وہ گھر پر نہیں ہیں اور آنٹی نے آپ کا نمبر ملا کر، آپ ہی سے بات کرنے کے لیے کہا ہے۔''

''اوکے، میں آتا ہوں کچھ ہی دیر میں۔'' اس نے فون بند کرکے چور نگاہوں سے ذونائشہ کو دیکھا، وہ صدمے اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''یہ...... تمہاری بیوی تھی نا؟''

''بیوی مائے فٹ!'' زہر خند لہجے میں کہہ وہ فون پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ ''ہاں شانی، تم ڈاکٹر صاحب سے ممی کے لیے نمبر لے لینا۔ پھر مجھے انفارم کردینا۔ میں انہیں لے آؤں گا۔''

''وہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہارے گھر میں موجود ہے۔ تمہارے کمرے میں ہر چیز شیئر کررہی ہے اور میں، میں کیا ہوں؟ میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟ میں کیوں ملتی ہوں تم سے، کیوں اپنے آپ کو ڈی گریڈ کرتی ہوں، مجھے اب اس بے نام تعلق کو ختم کردینا چاہیے یہی ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔''

ذونائشہ خود ترسی کا شکار ہورہی تھی، وہ تو پہلے ہی اس دکھ میں جلتی رہتی تھی۔ اشعر کسی اور کے ساتھ اپنے گھر میں اپنے کمرے میں یہ تصور ہی اتنا بھیانک تھا کہ وہ آگ کے الاؤ میں جا گرتی تھی۔ اور آج ابھی اس کی بیوی کی آواز سن کر اس کے دکھ میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔

''تم پھر غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ صرف پیپرز کی حد تک میری بیوی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تمہیں کیسے یقین آئے گا''؟

''تو ختم کردو اس پیپر میرج کو، مجھے یقین اسی

طرح اسکتا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی، چبا چبا کر بولی تھی۔

"پھر وہی بات، کہا ہے کہ نا میں تم سے شادی کے لیے ریڈی ہوں۔ تم مان جاؤ تو ہماری شادی ہوجائے گی اور جب شادی ہوجائے گی تو مام خود ہی اس کے لیے کچھ اور سوچ لیں گی ورنہ اس طرح سے تو وہ امید لگائے بیٹھی رہیں گی۔ تم میری پوزیشن کو سمجھو۔"

"میں کیا کیا سمجھوں بہتر یہ ہے کہ تم مجھے سمجھانے کے بجائے خود سمجھو کہ یہ سب کس طرح ممکن ہے۔ میں بہرحال سوکن بن کر نہیں جاؤں گی۔" وہ کرسی سے اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ اشعر نے غصے سے کرسی کو ٹھوکر ماری اور اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آسیہ اب مکمل صحت یاب ہو چکی تھیں۔ سو آج اوپر آگئیں۔ عنایہ اپنے ناخن تراش رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑی ہوگئی۔

"آئیں آنٹی، بیٹھیں پلیز۔"

"ہاں بیٹا، بیٹھتی تو ہوں۔ میں ایکچوئلی اوپر کے پورشن کو کو سیٹ کروا رہی ہوں۔ تو تمہارے بیڈروم کی سیٹنگ بھی چینج ہونی چاہیے۔ کیٹلاگز منگوائے ہیں میں نے تم دیکھ کر پسند کرکے بتانا کہ کیسا فرنیچر ہونا چاہیے تو وہی آرڈر کردیں گے۔"

"ارے نہیں آنٹی" وہ گھبرا گئی "وہ" شاید پسند نہ کریں۔" اس کا اشارہ اشعر کی طرف تھا۔ وہ ہلکے سے ہنس دیں۔

"نہیں وہ کچھ نہیں کہے گا۔ تم پریشان مت ہو۔"

مرتی کیا نہ کرتی ایک بہت خوب صورت اور نفیس ڈیزائن پر انگلی رکھ دی۔

"اب بشر کے روم کے لیے بھی مشورہ دو" ان کی اگلی بات پر وہ گڑبڑا گئی۔

"میں کیسے بتا سکتی ہوں آنٹی، وہ تو آپ ان سے ہی پوچھیں۔"

"لو، بھابیاں تو کیا کیا آئیڈیاز دیتی ہیں مگر تم تو رہنے ہی دو، میں خود ہی کوشش کرتی ہوں۔"

☆☆☆

جب اشعر اندر آیا تو وہ اپنے ٹیسٹ کی تیاری کررہی تھی وہ تھا اور آتے ہی ٹھٹک گیا۔ "یہ کیا ہے سب؟" اس نے ناگواری سے چاروں طرف دیکھا۔ عنایہ نے اپنی کتابیں وغیرہ سمیٹنا شروع کردیں۔

"آنٹی نے سیٹنگ چینج کروائی ہے۔"

"کس کے کہنے پر کروائی ہے؟" اشعر کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"تمہیں روم کی سیٹنگ پسند نہیں تھی تو کسی اور کمرے میں شفٹ ہوجاتیں۔ اس کی سیٹنگ چینج کروانے کی کیا مصیبت تھی؟" اس نے کوٹ اتار کر زور سے بیڈ پر پھینکا اور جیسے دھاڑا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہوئی تھی۔

"آنٹی نے خود سب کروائی ہے۔ میں نے نہیں کہا" میں تو تب کہتی جب کوئی احساس ملکیت ہوتا اس نے دل میں سوچا۔

"تم کچھ بھی نہیں کہتی ہو اور سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوتا چلا جاتا ہے۔" اس کے تلخ لہجے نے اس کے دل میں پھر سے زخم ڈالے تھے۔ [illegible] وہاں دکھتا ہے۔ جہاں کوئی امید ہو [illegible] نکاح جیسا مضبوط بندھن ہوتے [illegible] امید لگانے کی غلطی وہ نہیں کرتی تھی [illegible] کا دل تو رستا ہوا پھوڑا بن گیا تھا۔ ذرا سی ٹھیس سے بہنے لگتا تھا۔ ماں باپ کی اچانک دائمی جدائی، بشر سے جدا ہو کر کسی اور سے شادی اور ایسی شادی کہ وہ تو کیا شوہر سے بے زار تھا۔ وہ خاموشی سامنے والے کمرے میں آگئی تھی۔

☆☆☆

اشعر کو اس میں دلچسپی نہیں تھی تو وہ کون سا اس کے معاملات میں کوئی دلچسپی ظاہر کرتی تھی، وہ کیا پہنتا ہے کیا کھاتا ہے، کب [illegible] نا ہے اور کب اٹھتا ہے۔ اس کے سب معاملات کو ابھی بھی آسیہ ہی دیکھ رہی تھیں۔ عنایہ صبح جب اٹھتی [illegible] وہ گہری نیند سو رہا ہوتا تھا، وہ تیار ہو کر یونیورسٹی چلی جاتی، ابھی بھی تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ وہ تیار ہو کر باہر آئی تو بشر بھی لاؤنج سے نکلتا نظر آیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" اس کی آواز بھی مدھم ہوئی اور چال بھی۔

"یونی جارہی ہو۔" وہ تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

"جی۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"آؤ، میں چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ دروازے کھولے، وہ بنا کچھ کہے، پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔

"روز کیسے جاتی ہو؟" بشر نے گاڑی بیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"عائلہ کے ساتھ۔" مختصر جواب۔ وہ گاڑی روڈ پر لا چکا تھا مگر فوری بریک لگائی۔

"اوہ تو عائلہ نے جانا تھا کیا؟"

"نہیں وہ آج کہیں اور بزی ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا، وہ کچھ چپ سا ہوگیا، ظاہر سی بات تھی کہ عائلہ زندگی کو پوری طرح انجوائے کر رہی تھی اور عنایہ کی مصروفیات تو وہ دیکھ ہی رہا تھا، تو کیا کہتا۔ پھر وہ ہلکے سے کھنکارا تھا۔

"پوچھو گی نہیں کہ میں کہاں جارہا ہوں؟"

"پتا نہیں۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"بحریہ یونیورسٹی وہاسپٹل میں جاب کرلی ہے میں نے۔" اس کی اطلاع پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"مبارک ہو۔"

"شکریہ۔" وہ بھی مسکرایا تھا کچھ دیر خاموشی رہی پھر بشر نے ہی اسے توڑا تھا، ممی نے روم کی سیٹنگ چینج کرتے ہوئے اشعر سے نہیں پوچھا تھا کیا؟"

عنایہ سن رہ گئی تھی، تو اس نے رات کی تلخ کلامی بھی سن لی تھی، اسے ناگواری محسوس ہوئی۔

"آپ آنٹی سے پوچھ لیجیے گا۔" بشر نے ویو مرر سے اس کی تاثرات دیکھے اور خاموش ہوگیا تھا۔

☆☆☆

عائشہ کی بارات میں پستئی سبز تھری پیس سوٹ میں ملبوس، اسٹائلش بال بنائے اشعر اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ دل میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ذونائشہ نے نظریں چرالیں مگر اشعر کی آنکھیں تو ذونائشہ کے چہرے پر مقناطیس کی طرح چپک گئی تھیں، وہ مسٹرڈ کلر کی میکسی پہنے پارلر سے تیار ہو کر حوروں کو مات دے رہی تھی۔

"لائک سو بیوٹی فل" وہ قریب آ کر آہستگی سے بولا۔ اس نے تیکھی نگاہ ڈالی۔

"وہ تیار ہوتی ہوگی تو اسے بھی یہی کہتے ہو گے؟"

"اوہ، اشعر نے اوپر دیکھتے ہوئے لمبی اوہ کی تھی۔" اسے دیکھوں گا تو تعریف کروں گا نا؟"

"ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔" وہ ہنوز مشکوک تھی۔ وہ زچ آگیا۔

"تمہیں یقین کیسے آئے گا، مجھے بس یہ بتا دو۔"

"جب تم اسے طلاق دے کر فارغ کرو گے۔ تب۔" بڑی بے رحمی سے کہا تھا اس نے، نادان نہیں جانتی تھی کہ اپنی ہی ہم صنف پر کیسا ظلم ڈھانے کا مطالبہ کر رہی تھی۔

"تم مجھ سے شادی کرلو، وہ خود ہی طلاق مانگ لے گی۔"

"میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی ضرورت نہیں۔ خود مرد بن کر فیصلہ کرو، مجھے پانا ہے تو وہ شادی ختم کرنی ہوگی۔" وہ دوٹوک لہجے میں کہہ کر مڑی کہ اشعر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم ابھی مجھ سے نکاح پڑھوالو میں ابھی اسے طلاق لکھ دیتا ہوں۔"

"پہلے طلاق، نکاح کے بعد تم مکر جاؤ تو۔"
"تمہیں مجھ پر بھروسا ہی نہیں ہے، محبت میں اگر ایک دوسرے پر اعتبار نہ ہو تو پھر رہ ہی کیا جاتا ہے۔" وہ کبھی کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوا تھا، کسی کو یوں صفائیاں پیش نہیں کی تھیں، پر یوں کبھی کوئی اس سے بدگمان بھی تو نہیں ہوا تھا نا اور اب بدگمان ہوئی بھی تو کون جس کی محبت میں وہ پور پور بھیگا ہوا تھا، جس کی ہنسی سے اس کی خوشی مشروط تھی اور جس کا رونا اس کے لیے غم کا سبب تھا۔ ماں کے احترام میں نکاح کے تین بول پڑھوا کر کسی اور کو زندگی میں شامل کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ ذونائشہ کو گنوا دیتا، ہرگز نہیں، اس نے وہیں کھڑے کھڑے حتمی فیصلہ کرلیا تھا، یہ سوچے بغیر کہ وہ لڑکی جس کا دنیا میں دوسرا کوئی ٹھکانا نہیں، وہ کہاں جائے گی۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا، اس کا مسئلہ اپنی محبت کا حصول تھا، جس کے لیے وہ ہر حد سے گزر جانے کو تیار تھا۔

☆

بشر نیچے آیا تو اسے عنایہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے حیرت سے اردگرد دیکھا، ملازمہ ناشتا میز پر لگا رہی تھی۔
"وہ محترمہ کہاں ہیں جو یونیورسٹی جاتی ہیں؟" اس نے سرسری لہجہ اپنایا۔
"وہ بھابھی؟ وہ تو جی چلی گئیں۔" وہ مصروف انداز میں جواب دے کر کچن میں چلی گئی۔
"چلی گئیں، اتنی جلدی؟" اس نے کلاک دیکھا، ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے، اس دوران ملازمہ چائے لے کر پھر آ گئی۔
"جی وہ عائلہ بی بی کی طرف گئی ہیں، دونوں اکٹھی جاتی ہیں نا، کبھی ان کے ابو کے ساتھ اور کبھی پوائنٹ سے۔"
اس نے فوراً عائلہ کا نمبر ملایا تھا۔ "ہیلو عائلہ۔"
"یس، خیریت بشر، اتنی صبح؟"
"تم کہاں ہو؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔
"پوائنٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ پیدل پیدل۔"
اس نے جی بھر کر بے چارگی لہجے میں سموئی تھی۔
"تم وہیں رکو، میں آ رہا ہوں۔" وہ تیزی سے باہر لپکا۔ "صاحب جی ناشتا" ملازمہ پیچھے پیچھے آئی تھی۔
"دیر ہو رہی ہے۔ وہیں آفس میں کرلوں گا۔" وہ تیزی سے پورچ سے گاڑی نکال کر لایا اور اسے اتنی تیزی سے گیٹ سے نکالا کہ کتنی دیر فضا میں ٹائر چرچرانے کی آواز گونجتی رہی، وہ زیادہ دور نہیں گئی تھیں۔ اس نے قریب جا کر گاڑی روکی اور دروازے کھول دیے۔ عائلہ نے پہلے عنایہ کو بٹھایا پھر خود بیٹھی تھی، بشر نے گاڑی پھر سے چلا دی تھی۔
"میرا ویٹ کرلیا کرو، میں اسی ٹائم جاتا ہوں۔"
عائلہ نے حیرت سے اسے دیکھا، "مجھے تو علم نہیں، عنایہ نے بھی نہیں بتایا۔"
"تو ان کو معلوم ہوگا، تو ہی بتائیں گی نا۔ انہیں کیسے معلوم ہوتا اب میں نے بتا دیا ہے تو آئندہ دھیان رکھنا۔"
وہ نرمی سے کہہ کر سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا نہ کوئی گلہ، نہ حرف شکایت، وہ وہی بشر تھا، اس کا خیال رکھنے والا، اس پر کوئی آنچ نہ آنے دینے والا، وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ عنایہ جان بوجھ کر وقت سے پہلے عائلہ کے ساتھ آ گئی تھی کہ بشر کے ساتھ نہ جانا پڑے مگر جتانا تو دور کی بات، اس نے تو ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا تھا اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

☆☆☆

"ہیلو۔" ذونائشہ کی پریزنٹیشن چل رہی تھی کہ اشعر کا فون آیا تو اس نے ریسیو کرلیا۔ "تم کہاں ہو؟"
"میں پریزنٹیشن ہال میں ہوں، خیریت؟"
"ہاں، خیریت ہی ہے، تم سے ملنا تھا مجھے۔"
"میں فری ہو کر بتاتی ہوں۔"
"اوکے، میں ویٹ کر رہا ہوں۔"
وہ دوبارہ ہال میں آ گئی، دل میں البتہ کھلبلی سی مچ گئی تھی کہ پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہا تھا، کیوں ملنا چاہ رہا تھا۔ فارغ ہوتے ہی اسے فون کیا۔

"اب بولو کیا کہنا ہے جو اتنی جلدی مچا رہے تھے۔"
"میں وہیں آ رہا ہوں تمہارے پاس، کہیں چلنا ہے۔"
"مگر کہاں؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا مگر وہ عجلت میں تھا، اس نے فون کاٹ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ آ چکا تھا۔ ذونائشہ نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑی اور اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔
"ایسی کیا ایمرجنسی لاگو ہو گئی، تم تو سانس لینے کا موقع نہیں دے رہے۔"
اشعر نے ڈیش بورڈ پر رکھی ایک فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ پڑھو۔"
ذونائشہ نے ناسمجھی سے اسے ایسے دیکھا اور فائل تھام لی۔ کھول کر پڑھتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ "طلاق نامہ"
"ہاں، میں نے پیپرز بنوا لیے ہیں اور سائن بھی تمہارے سامنے کروں گا مگر اس کے لیے شرط وہی ہے۔"
"کون سی شرط؟" ذونائشہ نے چونک کر اسے دیکھا وہ بہت سنجیدہ تھا۔ توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کیے۔
"تم ابھی میرے ساتھ کورٹ چل رہی ہو نکاح کے لیے۔"
"لیکن کیوں، اس طرح کیوں، پراپر وے سے کیوں نہیں۔" وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر اس نے بات کاٹ دی۔
"تمہیں کیا لگتا ہے ممی کی من پسند لڑکی کو طلاق دینے کے بعد بھی میں ان سے یہ توقع رکھوں کہ وہ میرے کہنے پر تمہارے لیے پرپوزل لے کر جائیں گی۔" وہ استہزائیہ مسکرایا۔ "ناممکنات لو رہنے دو۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور مشکل آئے ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔ جسٹ نکاح ہوگا، رخصتی بعد میں ہو جائے گی۔"
"یہ سارے ایشوز تو تمہارے ساتھ ہیں نا مجھے تو ایسی کوئی پرابلم نہیں، میں کیوں اپنے پیرنٹس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں۔" اس کی بات پر وہ غصے سے اس کی طرف پلٹا تھا۔
"ہر جگہ تم اپنی منوانا چاہتی ہو اور میں کٹھ پتلی کی طرح تمہارے اشاروں پر ناچتا رہوں، تمہارے پیرنٹس کو دکھ ہوگا تو میری ماں کو صدمہ نہیں پہنچے گا، میں تو ان کا عہد توڑ رہا ہوں۔ ان کی کروائی گئی شادی ختم کر رہا ہوں۔ تم بس ایک فیصلہ کرو اور مجھے بتا دو، آج ابھی یا کبھی نہیں۔"
"تم اموشنل ہو رہے ہو اشعر، ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔"
"تم مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب دو اور بس۔" وہ اپنی بات پر قائم تھا، ذونائشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"اشعر پلیز۔" اپنے کندھے پر موجود اس کے ہاتھ کا لمس۔ اشعر نے پلٹ کر اسے دیکھا، ذونائشہ کی آنکھوں میں آج بہت دن کے بعد وہی محبت نظر آ رہی تھی جو اشعر کو دیکھتے ہی قندیلوں کی طرح روشن ہو جایا کرتی تھی، محبت سے اسے دیکھتی، وہ اسے مسحور کر گئی تھی۔
وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سب بھلا بیٹھا، سب کچھ یہ بھی کہ وہ روڈ پر گاڑی چلا رہا ہے اور گاڑی موڑ کاٹ رہی ہے، ذونائشہ کی آنکھوں کی چمک، سورج کی چندھیا دینے والی روشنی کی طرح ہر منظر پر غالب آ گئی، حتیٰ کہ زوردار دھماکا اور اس کے نتیجے میں سلب ہوتے حواس بھی اس کے سامنے مغلوب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"تم جلدی آ گئیں نا آج!" آسیہ نے عنایہ کو اندر آتے دیکھا تو مسکرائیں۔
"جی وہ اسی وجہ سے سر نہیں آئے تو تقریباً سارے اسٹوڈنٹس نے چھٹی کرلی۔" اس نے وجہ بتائی وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔
"دل بہت گھبرا رہا ہے، ڈوب رہا ہے بالکل۔" عنایہ گھبرا کر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"کیوں آنٹی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" وہ سینے کو مسل رہی تھیں، عنایہ نے ان کی پشت مسلی۔

"آنٹی کسی کو فون کر کے بلالیں۔"

"کس کو فون کروں۔" انہوں نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"آپ کے دونوں بیٹوں میں سے کسی کو۔" وہ دونوں بیٹوں میں سے کسی کا نام نہیں لے پائی تھی۔

"تم پہلے میرا بی پی چیک کرلو پھر دیکھتی ہوں۔" وہ اپنا بیگ وہیں چھوڑ کر اندر سے وہ ڈیوائس لے آئی جس کا اسٹریپ ان کی کلائی پر باندھ کر بلڈ پریشر چیک کیا، لو ہو رہا تھا، وہ جلدی سے کچن میں شریفاں کو او آر ایس تیار کر کے لانے کا کہہ کر ان کے پاس آ بیٹھی ان کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا، شریفاں نمکول لے کر آئی تو عنایہ نے گلاس خود ان کے منہ سے لگایا، پہلا گھونٹ لیتے ہی انہیں دھکا لگا، انہوں نے گلاس ہٹا کر نفی میں سر ہلایا۔ اتنے میں عنایہ کے بیگ میں سے اس کے فون کی آواز آنے لگی، اس نے زپ کھول کر فون نکالا، نیا نمبر تھا اس نے کال اٹینڈ نہیں کی، مگر فوراً ہی دوبارہ کال آنے لگی تو اس نے ریسیو کرلی۔ "ہیلو۔"

"ہیلو عنایہ میں بشر ہوں۔" بشر کی آواز بدلی ہوئی سی تھی۔

"اوہ، جی فرمائیے۔" اسے بشر کے فون پر حیرت ہوئی۔

"تم یونی میں ہو؟"

"نہیں گھر پر ہوں، خیریت؟"

"ممی کہاں ہیں؟" عنایہ نے فون کان سے ہٹا کر اچنبھے سے فون کو دیکھا، یہ بات تو وہ اپنی ماں سے خود بھی پوچھ سکتا تھا، اس سے کیوں پوچھ رہا تھا، بہر حال جواب تو دینا ہی تھا۔

"یہیں لاؤنج میں بیٹھی ہیں...... ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، بی پی لو ہو رہا ہے، میں انہی کے پاس ہوں اس نے تفصیل سے بتایا۔

"تم ممی سے دور ہو کر میری بات سنو۔" بشر کی آواز دھیمی ہوگئی تھی، عنایہ حیران پریشان سی ہو کر اٹھی اور قدرے فاصلے پر چلی گئی، آسیہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں، وہ بہت دھیمے سے پوچھ رہی تھی۔ "جی بات کریں۔"

"میں ہاسپٹل میں ہوں، اشعر کا بیڈلی ایکسڈنٹ ہوگیا ہے اور......"

"اور!" اس نے بے چینی سے پوچھا، دل دھڑ دھڑانے لگ گیا تھا۔ وہ چپ کیوں ہوگیا، بول کیوں نہیں رہا؟

"آپ بتائیں نا، وہ کہاں ہیں اور کس کنڈیشن میں ہیں؟"

"ہی از نو مور۔" بشر کی آواز کپکپا گئی تھی اور عنایہ کو یوں لگا در و دیوار لرزنے لگے ہوں اور چھت مرتعش ہو کر نیچے گرنے والی ہو، اس کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکاری، وہ بمشکل خود کو گھسیٹ کر لاؤنج سے باہر لائی کہ سامنے سے شمع آنٹی اور عائلہ آتی دکھائی دیں، ان تک یقیناً اطلاع پہنچ چکی تھی۔ عائلہ کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں اور ابھی بھی ان سے آنسو نکل نکل کر اس کے رخسار بھگو رہے تھے وہ دونوں ہاتھوں سے ماں کا بازو تھامے انہیں لے کر آرہی تھی، ان کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بہہ رہی تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ ایک طرح سے وہ پوری عائلہ کے سہارے چل رہی تھیں۔ عنایہ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی پائے۔ شمع نے خود ہی اسے گلے لگا کر بھینچ لیا، اتنی زور سے کہ عنایہ کو اپنی پسلیاں چٹختی محسوس ہوئیں، ان کا پورا وجود مرتعش تھا۔

"باجی شمع باجی۔" آسیہ انہیں دیکھ چکی تھیں اور صوفے سے اٹھ چکی تھیں، بہن کو دیکھ کر شمع کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جانے کو تھے۔

"آسیہ، میری بہن۔" انہوں نے وہیں سے

بازو پھیلائے اور ان کی طرف بڑھیں، آسیہ کو جیسے کوئی الہام ہوا تھا۔ "ہمت کرو آسیہ اشعر کا ایکسیڈنٹ۔" ان کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"ہائے میرے اللہ، میرا بچہ۔" وہ تیورا کے گرنے لگیں مگر عنایہ، عائلہ اور شمع نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ان کا حال دیکھ کر اگلی خبر سنانے کی تو کسی میں بھی ہمت نہیں رہی تھی، "باجی مجھے اشعر کے پاس لے چلیں ابھی فوراً۔"

"وہ یہیں آرہا ہے آسیہ...... یہیں آرہا ہے وہ" شمع کی برداشت جواب دے گئی تو وہ چیخ اٹھیں، "اشعر چھوڑ گیا ہے ہمیں۔"

"آنٹی، ایسا نہیں ہو سکتا نا۔"

"ایسا ہوگیا ہے اور سب تمہاری نحوست کی وجہ سے ہوا ہے۔" "تم اپنے ماں باپ کو کھا گئیں، منحوس لڑکی، تمہاری نحوست نے میرا بچہ بھی مار ڈالا۔" آسیہ دونوں ہاتھوں سے عنایہ کو مارنے، پیٹنے لگیں۔

"آسیہ، آسیہ، کیا کر رہی ہو، ہوش میں آؤ۔" شمع نے آسیہ کو اور عائلہ نے عنایہ کو الگ کیا۔ اتنے میں ایمبولنس اندر داخل ہوئی اور کچھ ہی لمحوں میں سفید چادر سے ڈھکا اسٹریچر اندر لایا گیا، ساتھ چلتے تھکے ہارے مظہر صاحب (عائلہ کے والد اور بشر کے تایا) اور بشر کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کیسے اس سب کا سامنا کر رہا تھا، وہ اپنے آفس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کال آئی تھی۔

"جی کون؟" اس نے پوچھا۔

"مسٹر اشعر ظہیر آپ کے بھائی ہیں؟"

"جی بالکل میرے بھائی ہیں، آپ کون؟" اس نے پوچھا۔

"ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، ان کی کنڈیشن بہت خراب ہے آپ اس ہاسپٹل آجائیں۔" وہ اجنبی جو کچھ بتا رہا تھا اسے سن کر بشر کو اپنے اردگرد دھماکے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، وہ اٹھ کر باہر بھاگا تھا وہ گاڑی کو اڑاتا ہوا مطلوبہ ہاسپٹل پہنچا تھا، جہاں یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ اشعر اور اس کے ساتھ موجود لڑکی موقع پر ہی دم توڑ چکے تھے اس لڑکی کے والد اور بھائی بھی آچکے تھے، ان کا حال بھی مختلف نہیں تھا، بشر پاگلوں کی طرح بھائی کا زخمی منہ چوم رہا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر چکا تھا، یہ یقین اتنی جلدی آنے والا نہیں تھا۔ اس پر جو گزر رہی تھی، وہ ناقابل بیان کیفیت تھی۔

اشعر کی گاڑی ورکشاپ میں مرمت کے لیے بھجوائی ہوئی تھی اس نے پانچویں دن کال آئی تھی "آپ یہاں آئیں، کچھ دکھانا ہے۔" بشر وہاں پہنچا تو استاد نے کچھ کاغذات اس کی طرف بڑھائے "سر جی! یہ کاغذ ملے ہیں گاڑی کے اندر سے۔" خون آلود کاغذات کو بشر نے حیرت سے دیکھا اور جب خون کے دھبے صاف کیے تو ان پر رقم تحریر دیکھ کر تو وہ ششدر رہ گیا تھا۔

"طلاق نامہ......؟ اشعر، عنایہ کو طلاق دے رہا تھا مگر کیوں؟" وہ عنایہ سے شادی پر خوش نہیں تھا، یہ تو معمولی عقل رکھنے والے کو بھی نظر آجاتا تھا مگر وہ اسے طلاق دے رہا تھا۔ اس نوبت کا تو تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ اشعر کے ساتھ موجود لڑکی ذونائشہ کے متعلق علم ہوا تھا کہ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب پر تھی وہ اور اشعر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور یہ تو یقینی بات تھی کہ اشعر کی ایمرجنسی میں عنایہ سے ہونے والی شادی ان کے تعلق پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ اب غالباً وہ ذونائشہ کے لیے، اسے مطمئن کرنے کے لیے عنایہ کو طلاق دینے والا تھا یا کسی اور وجہ سے بشر نے اذیت سے آنکھیں میچیں، ممی نے اپنی دوست کو مطمئن کرنے کے لیے ان کی بیٹی کی زندگی ہی داؤ پر لگا دی تھی۔ اگر اشعر عنایہ کو طلاق دے دیتا، اس کے بعد؟ اس کے بعد کا سوچ کر ہی بشر کو جھرجھری آگئی تھی، گھر میں جو طوفان آتا اور سب سے بڑھ کر عنایہ کے لیے زندگی عذاب ہو جاتی۔

☆☆☆

اشعر کا دکھ کوئی ایسا چھوٹا دکھ تو تھا نہیں کہ دنوں

میں ہلکا پڑ جاتا، وہ تو اس گھر کا سربراہ تھا، باپ کے بعد سارے معاملات بہ احسن وخوبی نمٹانا، ماں کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرنا، ان کے ہر حکم کی بجا آوری کرنا، بشر کے تعلیمی معاملات سے لے کر اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل کرنا اس نے اپنا فرض بنایا ہوا تھا، بزنس کیسے چلتا ہے، گھر کے اخراجات اور آفس کی دیکھ بھال سب اس کے ذمے تھا اور وہ بہت اچھے سے نبھا بھی رہا تھا۔

اب اس کی اچانک موت نے بشر کو دکھ کے ساتھ ساتھ بہت سارے مسائل کے اژدھام میں دھکیل دیا تھا، یہ نہیں تھا کہ اسے بزنس کی کوئی سمجھ بوجھ ہی نہیں تھی، اشعر جتنا تو نہیں پر بہت حد تک وہ جانتا تھا، پھر منیجر انوار صاحب بہت معاونت کر رہے تھے۔ اس کے لیے بس یہ سب سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، افسوس کے لیے ہی اتنے لوگ جا آ رہے تھے کہ وہ ہاسپٹل سے مسلسل چھٹیاں لینے پر مجبور تھا، حالات کو دیکھتے ہوئے تو خدشہ تھا کہ وہ مستقل بزنس کا ہی ہو کر رہ جائے گا اور ڈاکٹری لپیٹ کر رکھنی پڑ جائے گی۔ بہت مشکل تھا ان حالات میں سنبھالنا۔ دن، ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل رہے تھے مگر وہ سب جیسے ایک گنبد بے در میں مقیم تھے کہ ان کی زندگی میں جو جمود اشعر کی موت نے طاری کیا تھا وہ کوئی چیز پگھلا نہیں سکی تھی۔ بالآخر چار ماہ دس دن کا عرصہ گزرا اور عنایہ کی عدت بھی ختم ہو گئی۔

''عنایہ تم پھر سے اپنی کلاسز جوائن کر لو۔ اب تو تمہاری عدت بھی ختم ہو چکی ہے۔'' عائلہ نے اسے مشورہ دیا۔

''نہیں اب میں ہرگز یونی نہیں جاؤں گی۔ میرے نصیب میں ہی آگے پڑھنا نہیں لکھا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئیں، ایسے کیسے چھوڑ دو گی۔'' عائلہ نے جھڑکا مگر وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

''یہ بار بار چھوڑنا اور جوائن کرنا، تماشا ہی بن گیا ہے۔ میری قسمت میں اتنی تعلیم تھی جو میں نے حاصل کر لی۔'' پھر تو سب نے ہی سر پھوڑ لیا مگر وہ اپنی بات سے نہیں ہٹی، حتیٰ کہ بشر نے بھی بات کی تھی۔

''آپ غلط کر رہی ہیں۔'' انداز تخاطب بدل چکا تھا وہ چونکی مگر ظاہر نہیں کیا ''آپ تو فارمیسی کی اتنی اچھی اسٹوڈنٹ ہیں۔ آپ کو اپنی تعلیم ضرور مکمل کرنی چاہیے۔ دو تو سمسٹر رہ گئے ہیں آپ کے۔''

اس کے سامنے وہ بالکل خاموش رہی، گونگوں کو مات دیتی خاموشی، جو اشاروں میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں، وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ گیا۔

''آپ پر کوئی زبردستی نہیں ہے، جسٹ ایک ریکویسٹ ہے۔'' بے ساختہ عنایہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا بس ایک نظر اور جیسے ان بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت دھول بن کر اڑ رہی تھی۔

''اپنی تعلیم ضرور مکمل کریں اور اس کے بعد ہو سکے تو جاب کر لیں، فارغ بیٹھ کر کچھ بھی فضول سوچنے سے بہتر ہے اپنے آپ کو مصروف کر لیں۔ سب سے بڑی بات یہاں رہنے کا مضبوط جواز بھی مل جائے گا۔'' وہ پلٹ کر چلا گیا اور وہ سن سی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

★ ★ ★

''تت...... تت...... تمہیں کہاں سے یہ پیپرز ملے؟'' آسیہ تو طلاق کے کاغذات دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی تھیں۔

''اشعر کی گاڑی سے اور تاریخ بھی وہی ہے ان پر۔'' رسان سے کہتے ہوئے انگلی مطلوبہ تاریخ پر رکھی۔

''یا اللہ، وہ اس حد تک آ چکا تھا۔ مجھے بتائے بغیر، مجھ سے کچھ تو کہتا، کوئی بات تو کرتا۔ میں کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتی۔''

''ایز اٹ از جیسے پہلے حل نکالا تھا۔ تب بھی اس نے احتجاج کیا تھا تو آپ نے کب اس کی مانی تھی؟'' بشر کے ٹھنڈے لہجے میں ہلکی سی تلخی کی آمیزش تھی وہ ناراض ہو گئیں۔

''تو میں کیا کرتی، مرتی ہوئی دوست کی بات

نہ مانتی، اور پھر ایسے کیسے اس کی جوان بیٹی اپنے گھر میں رکھ لیتی۔''

''جیسے اب رکھی ہوئی ہے۔'' اس کے لہجے میں ٹھنڈک کچھ اور بڑھی تھی مگر وہ بھڑک اٹھیں۔ ''بکواس کرتے ہو ماں کے ساتھ، رکھی ہوئی ہے سے کیا مطلب؟ نکال دوں گھر سے، ایدھی والوں کو دے آؤں؟ کیا کروں اس کا، تم بتا دو، میں وہی کرتی ہوں۔''

''آپ بلاوجہ ناراض ہو رہی ہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ نے جب دیکھا تھا کہ اشعر کسی طرح راضی نہیں ہو رہا تو آپ کو یہ اسٹیپ لینا ہی نہیں چاہیے تھا، آپ اپنی فرینڈ سے وعدہ کر لیتیں کہ آپ ان کی بیٹی کو بہو بنائیں گی، انہوں نے اشعر کی شرط تو نہیں رکھی تھی نا کہ اسی سے ان کی بیٹی کی شادی ہو، آپ کے دو بیٹے تھے نا، آپ مجھے آزما لیتیں، وہ کمٹڈ تھا تو نہیں مان رہا تھا، میں تو......''

''کیا تم تو......'' انہوں نے چمک کر اس کی بات کاٹی۔ ''جب میں نے عائلہ کے لیے تم سے کہا تھا تو تم نے کیا کہا مجھے؟'' وہ چپ ہو گیا، آسیہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ ''تم بھی کہیں کمٹڈ تھے، ماں ہوں تمہاری، سب سمجھتی ہوں بلکہ......'' وہ رکیں اور بشر کی سانس بھی رکی تھی، بے اختیار اس نے ماں پر سوالیہ نظریں گاڑیں تھیں۔

''تم ابھی بھی کمٹڈ ہو اب وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے، یہ تو میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ ابھی بھی تمہارے دل میں موجود ہے۔'' بشر سچ مچ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

''اب بہتر ہو گا کہ تم مجھے بتا دو، کم از کم تمہاری شادی تو تمہاری مرضی سے کروا دوں۔ پھر مجھے عنایہ کا بھی کچھ کرنا ہے، شمائلہ اپنے جیٹھ کے لیے کہہ رہی ہے، اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے، دو بچے ہیں، دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ اب اس سے بہتر تو اس کے لیے کوئی مل بھی نہیں سکتا۔''

بشر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''کیوں نہیں مل سکتا۔''

''کنواری لڑکیوں کے رشتوں کے لیے دنیا پریشان بیٹھی ہے تو یہ تو پھر شادی شدہ رہ چکی ہے، میں تو اس کی خالہ کو فون کر کے مشورہ لوں گی، اور اس ذمے داری سے فارغ ہونے کی جلد از جلد کوشش کروں گی، آئے گئے پہلے ہی پوچھتے ہیں کہ اب اس کا کیا کریں گی بلکہ......'' وہ رکیں۔

بشر نے چونک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا ''بلکہ!''

''بلکہ چند ایک نے تو یہ بھی کہا کہ اس کی شادی تم سے کروا دوں۔'' انہوں نے تیزی سے جملہ مکمل کر کے اسے دیکھا، وہ بری طرح چونکا تھا۔

''مم...... مجھ سے؟'' اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ہکلا سا گیا۔

''ہاں تم سے، تاکہ اسے سہارا بھی مل جائے اور یہاں رہنے کا مضبوط جواز بھی۔'' وہ رک کر کھنکاریں ''مگر تم ظاہر ہے کیوں اس سے شادی کرو گے، وہ تمہاری بھابھی ہے اور سب سے بڑی بات تم کہیں اور......''

''نہیں، یہ کوئی مسئلہ نہیں۔'' اس نے اتنی تیزی سے بات کی کہ آسیہ کی بات کٹ گئی، وہ دم بہ خود اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''تم، تم راضی ہو، عنایہ کے ساتھ شادی کے لیے۔''

''مجھے چھوڑیں، آپ ان سے پوچھیں۔'' وہ نظر چرا کر اٹھ گیا۔

''یہ تم کہاں چل پڑے، بیٹھو ادھر، میں یہاں اکیلی الجھنوں اور پریشانیوں میں چکرا کر رہ گئی ہوں اور تم ہر بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئے، بیٹھو یہاں اور مجھے صحیح سے بتاؤ، تم واقعی عنایہ کے ساتھ شادی کے لیے تیار ہو، اس پر ترس تو نہیں کھا رہے؟''

''میں ترس کیوں کھاؤں گا ممی، وہ کوئی لولی، لنگڑی معذور ہیں یا گونگی، بہری ہیں۔'' وہ تیزی سے بولا تھا۔

انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ ''میرا خیال کر رہے ہو۔''

''ممی پلیز، آپ نے مجھ سے پوچھا، میں نے پوزیٹو جواب دے دیا، آپ اب وجوہات کو چھوڑیں اور مطمئن ہو جائیں کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

آسیہ اچنبھے میں گھری اکیلی بیٹھی سوچتی رہیں، ان کا صدمے سے دماغ کام نہیں کر رہا یا کوئی اور وجہ ہے کہ انہیں کہیں کوئی گڑبڑ کیوں لگ رہی ہے۔ اشعر، عنایہ سے شادی کے لیے رضامند نہیں تھا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا۔ بشر اس سے پہلے تک ہر رشتے سے انکار کرتا رہا جس سے اس کی کہیں اور دلچسپی کا پتا چلتا تھا، اب ایک دم عنایہ پر کیسے مان گیا۔ کہیں بشر پہلے سے عنایہ کو ہی تو نہیں۔'' ان کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔

اشعر اور عنایہ کی تصویریں بھجوانے کے بعد بشر کی پراسرار خاموشی، عنایہ کا بشر کے نام پر چونکنا، پاکستان آجانے کے بعد دونوں کا آپس میں انتہائی پرتکلف رویہ۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ عنایہ کا بے حد خیال رکھنا، انہیں لگ رہا تھا ان کے دماغ میں انکشافات کی ایک فلم سی چل پڑی ہو۔ پے درپے انکشافات، اس نے بہت شوق سے اشعر اور عنایہ کی تصویریں منگوائیں اور پھر جیسے سکتے میں چلا گیا، دو دن تو ان کا فون تک نہیں ریسیو کیا، تو یہ وجہ تھی اس کے پراسرار رویے کی۔

وہ مسلسل سوچ رہی تھیں مگر ابھی کچھ اور غور کرنا تھا، باجی سے مشورہ کرنا تھا، ہر چند کہ وہ پہلے سے انہیں کہہ چکی تھیں کہ وہ مناسب سمجھیں تو عنایہ اور بشر کی شادی کروا دیں، عائلہ کے لیے دو بہترین پروپوزلز موجود تھے اور انہیں بھانجے کا رجحان عائلہ میں نظر نہیں آیا تھا اور آسیہ کے لیے اپنی مرحومہ سہیلی کی بیٹی کے تحفظ کا بہترین طریقہ، وہ تحمل مند اور دور اندیش خاتون تھیں اور کچھ اشعر نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں، زبردستی کی بیوی کو کسی طرح سے قابل قبول کر کے۔ اب وہ اپنی عائلہ کو ایسی کسی آزمائش میں ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

☆☆☆

''بشر، بیٹا یہ تھوڑا سا گروسری کا سامان لانا ہے۔'' آسیہ، عنایہ سے لسٹ لکھوا رہی تھیں، بشر سیڑھیاں اتر کر باہر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ان کی پکار پر پلٹ کر ان کے پاس چلا آیا۔ انہوں نے لسٹ اسے تھمائی۔ ''ایسا کرو، عنایہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ اسے کچھ لینا ہوا تو لے لے گی۔''

''نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' اس نے گھبرا کر منع کرنا چاہا۔

''کیوں نہیں چاہیے۔ کب سے کہیں نہیں گئی ہو، اب تعلیم کا سلسلہ بھی پھر سے شروع کرو گی تو لازماً کئی ضرورت کی چیزیں درکار ہوں گی جاؤ حلیہ درست کر کے آؤ۔'' انہوں نے پیار سے کہا تو وہ کشمکش میں پڑ گئی، بشر کی موجودگی میں وہ ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ جہاں وہ موجود ہو وہاں پھٹکے بھی نہیں یہ سامنا دیتا بھی کیا تھا، سوائے اذیت، دکھ اور شرمندگی کے، ان کے دوبارہ کہنے پر وہ جز بز ہوتی اٹھ گئی تھی۔

''آؤ۔'' مال کے سامنے گاڑی روک کر، اترنے سے پہلے بشر نے اسے پکارا وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، اس کی آواز پر چونکی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لیمن کلر کے پرنٹڈ دوپٹے اور شرٹ کے ساتھ آف وائٹ ٹراؤزر میں ملبوس، بجھی بجھی افسردہ، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے، ہونٹوں پر پپڑی بشر نے گہری سانس لی تھی، کبھی یہ، چہرہ کھلتا گلاب ہوا کرتا تھا مگر وقت کے بادسموم نے اسے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ شاپنگ کے بعد اس نے گاڑی ریسٹورنٹ کے سامنے روکی تو عنایہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''بھوک لگ رہی ہے کچھ کھا لیتے ہیں۔''

''بہت دیر ہو گئی ہے، بہتر ہے گھر چلیں۔'' وہ سامنے دیکھ رہی تھی، بشر مدھم سا مسکرایا۔

''گھر ہی جانا ہے، فی الحال آؤ۔'' وہ مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے چلنے لگی، وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ چکی تو وہ آہستہ سے بولا...... ''تمہارے ساتھ جو

کچھ بھی ہوا وہ بہت افسوس ناک سہی مگر اس سب میں میرا کیا قصور ہے، مجھ سے کیوں اتنا کٹتی ہو تم؟''

''نہیں ایسی بات نہیں۔ بس اب تو عادت ہی ہو گئی ہے چپ رہنے کی۔'' وہ نظریں جھکائے بہت مدھم آواز میں بولی تھی۔ ریسٹورنٹ کی دھیمی لائٹس، پرسکون ماحول میں صرف کٹلری کے ٹکرانے کی آوازیں تھیں یا بہت دھیمی دھیمی سی بھنبھناہٹ۔

''اچھا ہوتا ہے چپ رہنا مگر کبھی کبھار بولنا ضروری ہو جاتا ہے، جہاں آپ نے اپنا مطمع نظر بیان کرنا ہو، وہاں تو بولنا بہت ضروری ہو جاتا ہے اور جب آپ سے کچھ پوچھا جا رہا ہو، وہاں تو جواب دینا لازمی ٹھہرا۔'' وہ اسے بولنے پر اکسا رہا تھا، عنایہ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اب اتنا وقت بھی ان دونوں کے بیچ حائل نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کی عادتیں ہی بھول جاتی۔ اب بھی سمجھ گئی کہ وہ اس کی چپ توڑنا چاہتا ہے۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ مسکرایا تھا۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہوں نا، کیوں اس چپ کے خول میں ہر وقت بند رہتی ہو، کچھ بولا کرو، سب میں گھلا ملا کرو۔''

''کیا بولا کروں اور کن سے گھلا ملا کروں؟'' وہ بہت دھیمے سے بولی تھی، اتنے میں ویٹر آرڈر لے آیا تو بشر بھی خاموش ہو گیا، ویٹر کے جانے کے بعد اس نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''کھانا شروع کرو۔'' پہلے کا تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہاں آجانے کے بعد میں نے تمہارے اور اشعر کے ریلیشن میں موجود سرد مہری محسوس کر لی تھی، اس کا اونچا اور غصیلا لہجہ، اس کی جھنجلاہٹ اور گھر سے باہر ٹائم پاس کرنا سب بتا رہا تھا کہ کہانی کیا ہے، میرے اپنے اندر تمہارے حوالے سے چور نہ ہوتا تو میں اس سے ضرور پوچھتا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھ رہا ہے لیکن میں ظاہر ہے کوئی فرشتہ تو نہیں کہ جس سے اپنے دل کی گہرائیوں سے محبت کی اور اپنے انتظار کا وعدہ سونپ کر گیا۔ وہ اپنی مجبوریوں کی بدولت ہی سہی پر میری بھابھی بن گئی تو

میں کیسے اسے بھلا کر، اپنے دل کے زخم چھپا کر اپنے بھائی سے پوچھ تاچھ کرنے لگ جاتا، ایسا ممکن ہی نہیں تھا، تم ہر جگہ، ہر لحاظ سے بے قصور و بے گناہ ہو۔ ممی نے بھی اپنی طرف سے بہترین فیصلہ کیا مگر میرا بھائی اشعر بہت کھرا بندہ تھا، شرعی بیوی سے منہ موڑ کر گناہ گار تو ہوا مگر اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہوا۔ وہ ایسا ہی تھا، کمپرومائز کرنا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا، پتا نہیں اس نے نکاح نامے پر سائن کیسے کر دیے ورنہ اس نے جو کام نہیں کرنا تھا وہ نہیں کرتا تھا۔''

''اور آپ؟ آپ ان کی جگہ ہوتے تو......؟''

اس کے سوال پر وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ضبط سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''آپ نے جواب نہیں دیا، ان کی جگہ آپ ہوتے تو؟''

''کاش ہوتا تو آج یہ سب نہ ہوا ہوتا۔''

''ان کی ڈیتھ میری وجہ سے ہوئی ہے؟'' اس نے سوال کیا تھا یا کوئی پن چبھوئی تھی۔

''غلط بات مت کرو عنایہ، ایسا نہیں تھا مگر اس کے دل و دماغ میں ٹینشن تو تھی نا، بوجھ تو رہتا تھا، اس کی محبت اس کے سامنے موجود تھی مگر وہ ماں کی خاطر مجبور تھا، میں ذونائشہ کے پیرنٹس سے بھی ملا ہوں وہ بہت دکھی ہیں، بہت افسردہ، انہوں نے بتایا کہ اشعر ابھی بھی اس کے ساتھ شادی کے لیے رضامند تھا مگر ذونائشہ کی ضد تھی کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے تو وہ اس سے شادی کر لے گی، اس بات پر اشعر بہت ڈسٹرب ہو جاتا تھا، یہ بھی وہ جانتی تھی مگر اشعر ہی کی طبیعت کی مالک تھی، اپنی کرنے والی، اپنی منوانے والی، سب سے بڑی بات وہ اشعر کو شیئر کرنے سے خوف زدہ تھی، سچ مچ دونوں کے درمیان بہت محبت تھی کہ ساتھ زندہ رہے اور ساتھ ہی......''

اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی نمی اتر آئی تھی، کتنا ضبط کرتا، حوصلہ دکھاتا پر اشعر اس کا ایک ہی ایک بھائی تھا، اس کی جواں مرگ پر غیر بھی رو پڑے تھے تو وہ تو اس کا خون تھا۔ عنایہ نے جھجکتے

ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے گویا تسلی دی تھی بشر کی آنکھوں میں کتنے عرصے بعد وہ قندیلیں روشن ہوئی تھیں جو قریباً ایک سال پیشتر عنایہ کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھلملایا کرتی تھیں اور عنایہ اسے تسلی دینے کے لیے مسکرائی تو کتنے ہی آنسو ایک ساتھ چھلک گئے تھے۔ اشعر کو پار کرکے یا ان عظیم لوگوں کی عظمت کے اعتراف میں۔ آسیہ آنٹی، جنہوں نے اپنی طویل عرصہ بعد ملنے والی دوست کے لیے اس کی خوشی کے لیے بیٹے کو زبردستی دوست کی بیٹی سے نکاح کے لیے منایا، بیٹے کی ناخوشی و ناراضی سہہ لی مگر اس کے لیے چھپر چھاؤں بنی رہیں۔ بشر اسے بھابھی کے روپ میں دیکھ کر کتنا ہی شاکڈ ہوا مگر سامنا ہونے پر اسے بھابھی والا احترام دیا، عائلہ، شمع آنٹی، مظہر انکل سب لوگ اس سے عزت و محبت سے پیش آتے تھے۔

''اشعر تمہارے ساتھ خوش ہوتا، تمہیں خوش رکھتا تو میں ہمیشہ کے لیے تمہیں ایک اچھی یاد بنا کر دل کے اندر چھپا لیتا، تمہیں بھلا دیتا مگر اس نے تو تمہیں قبول ہی نہیں کیا تو مجھے سکون کیسے ملتا، میرے ہی گھر میں تم یوں غم زدہ، پریشان رہتی رہو اور میں کیسے مطمئن ہوتا۔ ایک بے چینی، خلش، بے اطمینانی مجھے نہ سونے دیتی تھی نہ جینے دیتی تھی۔ کچھ اور وقت گزرتا تو میں اشعر سے کسی طور ہی سہی مگر بات کرنے کی کوشش ضرور کرتا، غلطی مام کی ہے، جب وہ کسی طرح سے نہیں مان رہا تھا تو وہ زبردستی کرنے کے بجائے تمہیں یونہی گھر لے آئیں اور مجھ سے......''

وہ رک گیا۔ عنایہ نے بھی نظر چرا لی تھی۔

''میں نے یہ کہا تھا مام سے، مگر وہ کہتی ہیں۔ ایسے تمہارے رشتہ دار نہیں آنے دیتے۔ تو چلو تم ان کے پاس ہی ہوتیں مگر اس طرح سے بچوں کی مرضی کے بغیر ان کی شادی کروانے کا رسک نہیں لینا چاہیے، یہ سوچ کر کہ وہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد آپس میں سیٹ ہو ہی جائیں گے۔ بھلا ایسے اور کتنا عرصہ تم دونوں ساتھ رہ سکتے تھے؟'' عنایہ نے اسے دیکھا، وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ''غلط کہہ رہا ہوں میں؟''

''نہیں، ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ مگر وہ سچویشن ہی ایسی تھی، ممی ضد کر رہی تھیں کہ ان کے سامنے میرا نکاح کیا جائے۔ آنٹی تو بہت مجبور ہو گئی تھیں۔ جس طرح بھی انہوں نے کہا مگر ممی کو مرتے ہوئے پرسکون کر دیا تھا۔ میں ان کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتی، آگے جو ہوا میری قسمت۔''

''تمہیں غصہ نہیں آتا تھا۔ سچ بتانا۔'' بشر کے سوال پر وہ آزردگی سے مسکرائی۔

''آتا تھا، کیوں نہیں آتا تھا مگر ان کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی نا، تو اتنا تو ان کا حق بنتا تھا۔''

''تمہیں پتا ہے وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا؟''

''ہاں۔'' بشر نے چونک کر اسے دیکھا، وہ سکون سے کہہ رہی تھی۔ ''مجھے شروع میں ہی پتا چل گیا تھا، جتنا سخت ردعمل تھا ان کا وہ بتانے کے لیے کافی تھا۔ وہ اپنے جذبات میں اپنی محبت میں سچے تھے، پرخلوص تھے اور ان کی یہ عادت مجھے ان کی عزت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔''

''میرا بھائی تھا نا تو عادت بھی تو میری ہی طرح ہوگی نا۔'' بشر کے بے ساختہ کہنے پر وہ نظر نہیں اٹھا پائی تھی۔

☆☆☆

''نہیں آنٹی، یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' وہ ایسے پیچھے ہٹی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ آسیہ نے اسے ہاتھ بٹھا کر بہت پیار سے بشر کا رشتہ پیش کیا تھا اور عنایہ کو شدید جھٹکا لگا۔

''کوئی ان ہونی اور عجیب بات نہیں کی میں نے، تم خود دیکھ لو، اس کی بھی شادی کرنی ہے اور تمہاری بھی تو بہتر ہے کہ ایک دوسرے سے ہی کر دی جائے۔'' انہوں نے اس کے رخسار پر آئی لٹ کان کے پیچھے اڑسی تھی۔

''نہیں آنٹی پلیز، یہ زیادتی ہے، میں اب مزید آپ کے لیے مشکلات کا سبب نہیں بننا چاہتی، آپ نے ہی بتایا تھا کہ ان کی بات عائلہ سے طے

ہے۔ تو آپ اپنی بہن سے اپنے تعلقات کیوں خراب کر رہی ہیں۔'' وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح انہیں اپنی طرف دیکھتی اتنی پیاری لگی کہ انہوں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔

''میری جان تم کیوں اتنی فکر مند ہو رہی ہو، بشر نے کہا کہ وہ عائلہ کو بہن کی طرح سمجھتا ہے، اس لیے اس سے شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، مجھے شمع باجی نے خود کہا ہے کہ میں تمہاری اور بشر کی شادی کا سوچوں، سب کو تمہاری فکر ہے بیٹا، سب تمہارے لیے پریشان ہیں۔ انجان لوگ پتا نہیں کیسے ہوں، میں کیسے تمہیں کہیں اور بیاہ دوں، بشر میرا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے شادی کرکے بہت خوش رہے گا۔ یہاں زور زبردستی والی کوئی بات نہیں۔''

عنایہ نے چونک کر انہیں دیکھا، وہ اثبات میں سر ہلا کر جس طرح مسکرائیں۔ وہ اسے جھینپنے پر مجبور کر گیا، دل الگ تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ انہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا بشر؟

''میں اس کی ماں ہوں۔ لو اس کے چہرے سے اس کے دل کا حال جان گئی ہوں، اس نے کچھ نہیں کہا۔''

وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ''اشعر کا بھی مجھے کچھ کچھ اندازہ تو تھا، وہ جس طرح شادی کے لیے منع کرتا تھا۔ مجھے لگتا تھا وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے مگر اور میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی شادی اس کی من پسند جگہ ہی کرواؤں مگر میں نے مجبوراً ہی سہی ایک بہت پیاری لڑکی سے اس کی شادی کروائی مگر وہ اپنی کمٹمنٹ میں پکا تھا، اب کم از کم بشر کی خوشی تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔''

وہ پھر مسکرائیں مگر آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ عنایہ آگے ہو کر ان کے شانے سے جا لگی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اشعر کا دکھ تو ہمیشہ رلانے والا تھا کوئی آج کی بات تو تھی نہیں مگر وہ اپنی آنکھیں پونچھ کر بہت محبت اور خوشی سے مسکرائیں اب ان شاء اللہ اس گھر میں بھی خوشی آئے گی۔''

☆☆☆

بہت سادگی سے بشر اور عنایہ کا نکاح کروا دیا گیا تھا۔ اس بار بشر کو نیچے ہی کمرہ سیٹ کر دیا تھا۔ کیونکہ بشر اور عنایہ دونوں ہی نہیں چاہتے تھے کہ آسیہ نیچے اکیلے رہیں۔ بشر ہر طرح سے اپنی محبت کا ثبوت دے رہا تھا زندگی عنایہ پر پھر سے مہربان ہو گئی تھی، اس نے پھر سے اپنے سمسٹر کو جوائن کر لیا تھا، اور چھ ماہ بعد جب وہ ایگزیم سے فری ہوئی تو ڈاکٹر نے وہ خوش خبری سنائی جسے سننے کو آسیہ کے کان ترس رہے تھے۔ وہ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھ رہی تھیں، انہی دنوں عائلہ کی شادی کا ہنگامہ جاگ گیا۔ بہت شاندار طریقے سے اس کی شادی انجام پائی اور خوش گوار یادیں چھوڑ گئی۔

اشعر کی پیدائش، جی ہاں، بشر اور عنایہ کے بیٹے کا نام اشعر رکھا گیا تھا، نے ہر طرف خوش گوار ہلچل پیدا کر دی تھی۔ شمع آنٹی کا اپنے گھر سے زیادہ ان کے گھر میں دل لگتا تھا۔ آسیہ کو تو کھلونا مل گیا تھا، بشر صبح میں ہاسپٹل اور شام میں آفس کے چکروں میں اسے اتنا ٹائم نہیں دے پاتا تھا مگر رات اس کی اور اشعر کی تھی۔ وہ جی بھر کر اس سے کھیلتا اور باتیں کرتا تھا۔

''اب تو یہ کچھ بڑا بھی ہو گیا ہے۔ تم چاہو تو جاب کر لو۔''

''نہیں آنٹی ناراض ہوتی ہیں، ابھی یہ تھوڑا اور بڑا ہو جائے۔''

''پھر اور آ جائیں گے۔ تم اپنی تعلیم لپیٹ کر ہی رکھ دو۔'' بشر کی بات پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ اسے دیکھ کر ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا تھا۔ عنایہ نے دل کی گہرائیوں سے اس کی ہنسی کے دائمی ہونے کی دعا مانگی تھی۔ اس گھر میں خوشی بہت انتظار کے بعد بہت بڑے دکھوں کے بعد آئی تھی وہ اس گھر سے اتنی وابستہ ہو چکی تھی کہ اس کے مکین اس کے دل میں بہت اونچے مقام پر فائز ہو چکے تھے، وہ ان کی خوشیوں کے لیے ہر پل کوشاں، انہیں خوش دیکھ کر خود بھی سرشار تھی۔

☆☆

شمسہ الطاف

یقین محکم

"امی! رمضان آرہا ہے، روزے کیسے رکھیں گے؟" سولہ سالہ شزا نے ماں سے کہا۔

"جیسے ہر سال رکھتے ہیں۔" امی سلائی مشین پر جھکی مصروف انداز میں بولیں۔

"آئے روز گھر میں فاقے پڑتے ہیں، ابو تو دوسری زوجہ محترمہ کو ایسے پیارے ہوئے کہ پلٹ کر کبھی خبر تک نہیں لی کہ ہم زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ اس مہنگائی کے دور میں آپ کی سلائی کڑھائی سے حاصل ہونے والی رقم بھی کچھ کارگر نہیں ہو پاتی۔ آٹا آتا ہے تو چینی نہیں، وہ ملے گی تو گھی نہیں۔ عید کی خوشیاں تو درکنار، مجھے تو سحر و افطار کے انتظام کے بھی لالے پڑے ہیں۔" شزا نے ماں کے سامنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"بیٹا! رمضان کی فکر مت کرو، یہ برکتوں والا مہینہ اپنی برکتیں ساتھ لے کر آتا ہے۔ تم دیکھنا اللہ غیب کے خزانوں سے رزق کی برسات کرے گا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ تم اپنی چھوٹی سی دماغ دانی میں فکروں کے جال مت پالو، ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" امی نے اطمینان سے اسے سمجھایا۔ مگر وہ امی کی صابر طبیعت کے خیال سے ایک تلخ سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

شزا کے ابو ان چار بہن بھائیوں کو امی کے ذمے چھوڑ کر سارے خاندان کی مرضی کے خلاف شادی رچا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ کسی کی حسین زلفوں کے اس قدر اسیر ہو گئے تھے کہ انہیں اپنے پچھلوں کا ایک پل کو بھی کبھی خیال ہی نا آیا۔ امی وقت کی ماری مختلف گھروں میں جا کر سلائی کا کام لاتیں اور دن رات محنت کر کے چڑیوں کی طرح بچوں کا دانہ لاتیں۔ مگر اس مہنگائی کے دور میں جہاں بھلے بھلوں کی سٹی گم ہوئی ہے، وہاں ایسے مفلسوں کے گھروں میں کبھی کبھی فاقے پڑنا کوئی عجیب بات نا تھی۔

☆☆☆

رمضان شریف شروع ہوا ہی تھا کہ ماموں جان جو کبھی ہفتوں میں شکل نا دکھاتے تھے اور کچھ دینے دلانے کی تو خیر انہیں ممانی سے اجازت ہی نا تھی۔ مہینہ بھر کا راشن اور دو بڑے شاپر فروٹس کے لے کر ان کے گھر ان سے ملنے چلے آئے۔

"آج سورج کس سمت سے نکلا تھا جو اتنی مہربانیاں۔" شزا کو حیرت ہوئی۔ امی بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں۔ یہ اسی کے کام ہیں جہاں سے چاہتا ہے رزق کا انتظام کر دیتا ہے، بے شک وہ بڑا مہربان ہے۔

چاچو شام کو آئے تو ڈھیروں سامان لے آئے، شزا کے گھر میں خوردنی اجناس کی ایسی ریل پیل ہوگئی جو کبھی بابا کی دوسری شادی سے پہلے بھی اس نے اپنے گھر نہ دیکھی تھی۔

دونوں خالاؤں نے ان سب بہن بھائیوں کے لیے عیدی کے طور پر اچھی خاصی رقم بھیجی تھی۔ پھپھو سب کے لیے عید کے کپڑے لے کر آئیں،

خدائی رحمت ماہِ رمضان اترتے ہی ان پر ہن کی طرح برسنے لگی تھی۔ شزا کو بھی یقین آ گیا کہ واقعی رمضان اپنی برکتیں ساتھ لے کر آتا ہے۔

محلے کی ایک معزز سی عورت ان کے گھر آئی، امی کپڑے سلائی کر رہی تھیں وہ وہیں ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ شزا نے دیکھا وہ امی کو کچھ رقم دے رہی ہے......

''نہیں بہن! شزا کے ابا نے دوسری شادی ضرور کر لی ہے۔ وہ گھر بھی نہیں آتے مگر اپنے بچوں کو اور مجھے خرچا بھجوا دیتے ہیں۔ ہمیں زکوٰۃ خیرات کی ضرورت نہیں، آپ کسی مستحق کو دیجیے۔'' امی نے بڑی سہولت سے ابا کے لیے صفائی پیش کی۔ شزا متحیر رہ گئی' اس کی امی کتنی صابر اور وفادار بیوی واقع ہوئی تھیں' شوہر کی کج ادائی کے باوجود وہ کبھی ان کو برا نہ کہتی تھیں۔ عورت کے جاتے ہی وہ بول پڑی۔

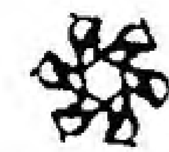
''امی آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''بیٹا! میں نے مصلحت آمیز جھوٹ بولا ہے، اپنے شوہر کی برائی کرنا بیوی کو زیب نہیں دیتا۔'' امی کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سکون تھا لیکن ان کے اندر کتنے طوفان تھے، یہ تو وہ جانتی تھیں یا پھر ان کا خدا باخبر تھا۔

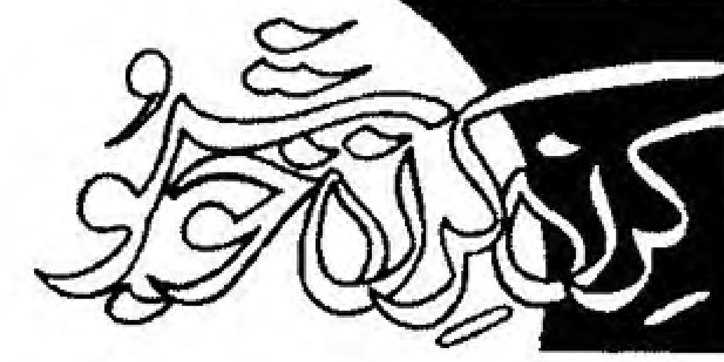
''امی آپ کتنا سچ کہتی تھیں کہ رمضان میں اللہ غیب کے خزانوں سے نعمتیں عطا کرتا ہے۔'' شزا متاثر ہو کر کہنے لگی۔

''دیکھو بیٹا! ہم رمضان میں خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں' قرأت کرتے ہیں تو اللہ ہماری ضروریات بھی بن مانگے پوری کرتا ہے۔ وہ آسمانوں سے اپنی نعمتوں کی برسات کرتا ہے۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے، اس نے پیدا کیا ہے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے، بے شک وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔''

شزا امی کے لفظوں پر غور و فکر کر رہی تھی اور ساتھ ہی وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ کیسے ہم رمضان میں اچھے مسلمان بن کر نماز، روزہ اور تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر پورا سال رمضان سمجھ کر اسی محبت و حلاوت سے عبادت کریں تو دنیا میں تو جو اللہ کی نعمتوں کا نزول ہم پر ہو وہ تو ہو۔ اس کے علاوہ ہماری موت بھی تو عید جیسی ہو گی۔ قبر کی پہلی رات چاند رات کی طرح، کاش ہم اپنا قبلہ درست رکھ کر چلیں تو جہنم کی کھائیاں اور قبر کا اندھیرا ہمارے مقدروں سے چھٹ جائے۔ اس کے دل نے شدت سے خواہش کی تھی کہ وہ پوری زندگی ماہ رمضان کی طرح گزارے۔



شعاع عمیر



القرآن

مرنے والوں کی روحیں کیا دنیا میں لوٹ آتی ہیں؟

☆اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو۔اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے (الواقعہ 85.86)

☆ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے (یٰس 31)

☆ ہرگز نہیں، یہ بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک (المومنون 100)

ان آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرنے والوں کی روحیں قیامت سے پہلے دنیا میں نہیں لوٹائی جاتیں۔چاہے وہ چند لمحوں کے لیے قبر میں بھی کیوں نہ ہو۔

غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن خطاب کے پاس پہنچے جو چند سواروں کے ساتھ تھے۔اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد کی قسم کھا رہے تھے۔اس پر رسول کریم ﷺ نے پکار کر کہا۔ آگاہ ہو، یقیناً اللہ تمہیں منع کرتا ہے کہ تم اپنے باپ داداؤں کی قسم کھاؤ پس اگر کسی کو قسم کھانی ہی ہے تو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے (البخاری کتاب الایمان صفحہ 59 حدیث نمبر 1067)

صلوۃ التوبہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر وہ اچھی طرح وضو کرے اور اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھے اور پھر اللہ سے معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور معاف کر دیتے ہیں۔(سنن ابی داؤد 1523)

سعدیہ وحید سعدی......اسلام آباد

آج کے مصنف

ایک روز قاضی ابو حازم کسی شہر سے گزر رہے تھے۔راستے میں انہیں ایک شخص ملا اور یوں مخاطب ہوا۔

''قاضی صاحب،۔آپ نے ہمارے شہر میں جو منصف مقرر کیا ہے، وہ بہت دیانت دار ہے'' یہ سننا تھا کہ قاضی ابو حازم برافروختہ ہو گئے۔

''اے شخص! تو کیسی بات کر رہا ہے کسی پولیس افسر کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیانت دار ہے یا نہیں ہے لیکن ایک منصف ان باتوں سے بالا ہوتا ہے۔''

راستے میں ابو حازم کے ایک ساتھی نے ان سے پوچھا۔''حضرت آپ اس شخص پر خفا کیوں ہو گئے تھے؟'' ابو حازم بولے۔''منصفی کے منصب کی یہ توہین ناقابل برداشت ہے۔ بدقسمتی دیکھو، آج کل ایسے اشخاص بھی اس منصب پر مامور ہو رہے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں دیانت دار سمجھیں اور ان کی تعریف کریں۔اس سے پہلے کبھی نہیں سنا کہ فلاں منصف دیانت دار ہے اور فلاں منصف بددیانت۔

صدف سمیع......کراچی

صدف صدف

☆ ہزار دوستوں کی دوستی کو ایک شخص کی عداوت کے بدلے مت خریدو۔

☆ عورت عشق کرتی ہے جبکہ مرد صرف چاہ سکتا ہے۔

☆ گندگی نے کوے کو نکما بنا دیا ہے ورنہ وہ بھی ایک پرندہ اور باز بھی۔

☆ ہر شخص بے عزتی معاف کر سکتا ہے مگر بھول نہیں سکتا۔

☆ شیطان سالک تھا۔ اگر مجذوب ہوتا تو کبھی مردود نہ ہوتا۔

کنول شاہین قیصر......تلہ گنگ

امام ابو حنیفہؒ کی بے مثال بصیرت

ایک شخص نے امام صاحبؒ سے عرض کیا کہ ''میں نے کچھ روپے ایک جگہ چھپا کر رکھ دیے تھے اب وہ جگہ مجھے یاد نہیں آتی، میں کیا کروں۔''

''امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ''یہ کوئی فقہ کا مسئلہ تو ہے نہیں جو تم مجھ سے پوچھنے آئے ہو۔'' پھر جب اس شخص نے زیادہ اصرار کیا تو امام صاحبؒ نے کہا کہ آج تمام رات تم نماز پڑھو ان شاءاللہ، اللہ کوئی صورت پیدا کر دیں گے۔چنانچہ اس شخص نے رات کو نماز پڑھنی شروع ہی کی تھی کہ اسے یاد آ گیا کہ اس نے روپے کہاں رکھے تھے اور وہ نماز چھوڑ کر فوراً اپنا دفینہ نکالنے بھاگ کھڑا ہوا، صبح کو وہ دوڑا ہوا آیا اور امام صاحبؒ کو تمام واقعہ سنایا۔

امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ''ہاں شیطان کیسے برداشت کرتا کہ تم ساری رات نماز پڑھتے رہو۔ پھر بھی تمہیں چاہیے تھا کہ ساری رات نماز پڑھتے رہتے'' (تاریخ کے دریچوں سے۔حضرت مفتی رفیع عثمانی)

نسیم بشیر......ڈنگہ

مسکراہٹ

☆مسکراہٹ زندگی کا دوسرا نام ہے

☆مسکراہٹ مایوسی کے تاریک بادلوں میں امید کی کرن ہے۔

☆مسکراہٹ دوستی کی کنجی ہے۔

☆مسکراہٹ اس گلزار کی مانند ہے جس کا ہر پھول ہر موسم میں شگفتہ رہتا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران......گجرات

صلہ شہید

تحریک پاکستان میں مسلم طلبہ نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان میں سے بعض اعلا ملازمتوں کے امیدوار ہو کر انٹرویو میں پیش ہوئے۔ان سے اکثر یہ سوال کیا جاتا کہ وہ سیاست میں کیوں حصہ لیتے رہے؟ یہی سوال باب اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ایک ممتاز رہنما راشد چوہدری سے کیا گیا۔راشد چوہدری نے سوچا کہ اب ملازمت کے لیے منتخب ہونے کا سوال ہی نہیں لہٰذا اس نے جواب دیا۔

''ہم نے سیاست میں اس لیے حصہ لیا تاکہ آپ حضرات کو ان کرسیوں پر بیٹھنے کا موقع مل سکے اور جس پولیس رپورٹ کا آپ بار بار حوالہ دیتے ہیں، وہ میرا اعزاز ہے۔''

افشاں سمیع......کراچی

کلام بابا بلھے شاہ

رب رب کردے بڈھے ہو گئے ملاں پنڈت سارے

رب دا کھوج کھرا نہ لبھا، سجدے کر کر ہارے
رب تے تیرے اندر وسدا، وچ قرآن اشارے
بلھے شاہ رب اوہنوں نے ملسی، جیہڑا اپنے نفس نو مارے

دلچسپ و عجیب

دنیا کی مقبول ترین موسیقی کی کتابوں میں ایک کتاب کا مصنف ایک قصائی کا بیٹا تھا یہ کتاب اس نے اپنی دکان میں بیٹھ شور وغل کے درمیان لکھی، دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اس کتاب کی کوئی نہ کوئی دھن ہر روز بجائی جاتی ہے۔ اس کتاب کا نام ''ہومورسکھ'' اور اس کا مصنف ہے ''انطوک ڈوراک''۔

سیدہ لوبا سجاد.......... کھڑور پکا

ویلنٹائن ڈے

ویلنٹائن ڈے سے سات دن پہلے ایک گفٹ شاپ میں وکیل صاحب گئے۔ انہوں نے چالیس خوب صورت کارڈ خریدے اور سب پر انہوں نے بھیجنے والے کی جگہ لکھا۔

''ہیلو جان! بہت یاد آ رہی ہو شام کو ملو جہاں کل ملے تھے۔ آئی لو یو!''

دوکان دار نے پوچھا: ''یہ کیا معاملہ ہے؟''

وکیل صاحب نے بتایا۔ ''گزشتہ ویلنٹائن ڈے پر آس پاس کی کالونی میں ایسے بیس کارڈ بھیجے تھے کچھ ہی دن میں طلاق کے چار کیس مل گئے تھے۔ اس بار چالیس کارڈ بھیج رہا ہوں۔''

شازیہ اعجاز...... فیصل آباد

کوزے

☆ دنیا میں سب سے زیادہ نفرتوں کا سامنا سچ بولنے والوں کو کرنا پڑتا ہے (افلاطون)

☆ جو قوم صحت اور تعلیم کو کاروبار بنا لے وہ قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے (نیلسن منڈیلا)

☆ تم تب تک بہادر نہیں بنتے جب تک مشکل حالات سے نہیں گزرتے (میری ٹائلر مور)

☆ کچھ لوگ چاہتے ہیں، کچھ لوگ خواہش کرتے ہیں اور کچھ لوگ کر کے دکھاتے ہیں تم کون ہو؟ (مائیکل جارڈن)

☆ اگر ہم سے غلطی ہوئے تو ابلیس کی طرح دلیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ معافی مانگ لینی چاہیے کیونکہ ہم ابن آدم ہیں۔ ابن ابلیس نہیں (الغزالی)

عائشہ ضیاء.......... مٹوٹلی

شگوفے

☆ جس نظر سے وہ پرائی بہو بیٹیوں کو دیکھتے تھے۔ اس نظر کے لیے ان کی اپنی بیوی ایک عمر سے ترس رہی تھی۔ (مشتاق احمد یوسفی)

☆ کہتے ہیں ''عورت کوئی راز نہیں رکھ سکتی'' حالانکہ عورت کہتی ہے ''میں تو راز رکھ سکتی ہوں وہ لوگ نہیں رکھتے جنہیں میں بتاتی ہوں (ڈاکٹر محمد یونس بٹ)

☆ جس تھانیدار، مولوی اور پنڈت کا پیٹ نہیں، سمجھ لیں وہ اپنے پیشے سے مخلص نہیں (ڈاکٹر محمد یونس بٹ)

☆ شاہجہاں نے اپنی لاڈلی بیگم ممتاز کو کبھی خالی پیٹ نہ رہنے دیا اور اس محبت کی ماری ہوئی روح نے اپنی حیات میں جتنی بھی سانسیں لیں حاملہ لیں (مستنصر حسین تارڑ)

صائمہ سحر.......... فیصل آباد

نظم

کس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں
تم میری زندگی کی عادت ہو
کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوب صورت ہو
داستان ختم ہونے والی ہے
تم میری آخری محبت ہو

(جون ایلیا)

بشریٰ محمود



فصہ نور، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

شکستہ آئینوں کی کرچیاں اچھی نہیں لگتیں
مجھے وعدوں کی خالی سیپیاں اچھی نہیں لگتیں

گزشتہ رت کے رنگوں کا اثر دیکھو کہ اب مجھ کو
کھلے آنگن میں اترتی تتلیاں اچھی نہیں لگتیں

وہ کیا اجڑا نگر تھا جس کی چاہت کے سبب اب تک
ہری بیلوں سے الجھی ٹہنیاں اچھی نہیں لگتیں

دبے پاؤں ہوا جن کے چراغوں سے بہلتی ہو
مجھے ایسے گھروں کی کھڑکیاں اچھی نہیں لگتیں

بھلے لگتے ہیں طوفانوں سے لٹتے بادبان مجھ کو
ہوا کے رخ پہ چلتی کشتیاں اچھی نہیں لگتیں

یہ کہہ کر اس سے بھی تعلق توڑ آیا ہوں
میری جان مجھ کو ضدی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں

کس گھر میں رسن بستہ رہیں جو رات دن محسن
مجھے اکثر وہ سبھی ہرنیاں اچھی نہیں لگتیں

فرح سلیم، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی غزل

میری راتیں تیری یادوں سے سجی رہتی ہیں
میری سانسیں تیری خوشبو سے بسی رہتی ہیں

میری آنکھوں میں تیرا سپنا سجا رہتا ہے
ہاں میرے دل میں تیرا عکس بسا رہتا ہے

اس طرح میرے دل کے بہت پاس ہو تم
جس طرح پاس ہی شہ رگ کے خدا رہتا ہے

تم کو معلوم بھی شاید کبھی ہو کہ نہ ہو
میرے آنگن میں لگے پھول گواہی دیں گے

میں نے عرصے سے کسی پھول کو دیکھا بھی نہیں
تجھ کو سوچا ہے تو پھر تجھ کو ہی سوچا ہے فقط

تیرے سوا کسی اور کو سوچا بھی نہیں
تم کو معلوم بھی شاید کبھی ہو کہ نہ ہو

رباب راجپوت، کی ڈائری میں تحریر

شبیر جمال صدیقی کی نظم

اب کیا لکھیں ہم کاغذ پر
اب لکھنے کو کیا باقی ہے
اک دل تھا سو وہ ٹوٹ گیا
اب ٹوٹنے کو کیا باقی ہے
اک شخص کو ہم نے چاہا تھا
اک ریت پہ نقش بنایا تھا
ان ریت کے ذروں کو ہم نے
پھر اپنے دل میں سجایا تھا
وہ ریت تو کب کی بکھر گئی
وہ نقش کہاں اب باقی ہے

اب کیا لکھیں ہم کاغذ پر
اب لکھنے کو کیا باقی ہے

ہم جن کو اپنی نظموں کا
عنوان بنایا کرتے تھے
لفظوں کا بنا کر تاج محل
کاغذ پر سجایا کرتے تھے
وہ ہم کو اکیلا چھوڑ گئے
سب رشتوں سے منہ موڑ گئے
اب رشتے سارے سونے ہیں
وہ پیار کہاں اب باقی ہے
اب کیا لکھیں ہم کاغذ پر
اب لکھنے کو کیا باقی ہے

عائشہ جہانگیر مرالی، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی غزل

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں

تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں

تو کہ یکتا تھا بے شمار ہوا
ہم بھی ٹوٹیں تو جا بجا ہو جائیں

ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
پھر کہیں اور مبتلا ہو جائیں

ہم اگر منزل نہ بن پائیں
منزلوں تک کا راستہ ہو جائیں

عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں، کیمیا ہو جائیں

اب کے گر تو ملے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں کہ تیری قبا ہو جائیں

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

زوہا خان، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت نظم

اس رات کی تنہائی میں،

اس رات کی تنہائی میں
تیری یاد کی ہمنوائی میں
تصور وصل کی رعنائی میں
ہم جدا ہو کے بھی جدا نہیں
اس رات کی تنہائی میں
اس رات کی تنہائی میں
ہم تجھ میں کھوئے رہتے ہیں
صحرائے ہجر میں بھٹکتے ہیں
سپنے ملن کے کبھی بکھرتے ہیں
اس رات کی تنہائی میں
اس رات کی تنہائی میں
جب وحشت بڑھتی جاتی ہے
تیرے لمس کی مہک لبھاتی ہے
امید قربت پھر ٹوٹتی نہیں
اس رات کی تنہائی میں
اس رات کی تنہائی میں
ہے یاد اس کی جو ابھی تک نہیں ملا
مگر اس سے کچھ بھی گلا نہیں
میری زندگی ہے اس کی منتظر
جیسے میرے وجود کی فکر نہیں
اس رات کی تنہائی میں

شگفتہ سلیمان



بشریٰ ناز ____ جہلم
اس کو چاہا بھی تو اظہار نہ کرنا آیا
کٹ گئی عمر، ہمیں پیار نہ کرنا آیا
اس نے مانگا بھی تو کیا ہم سے جدائی مانگی
اور ہم تھے ہمیں انکار نہ کرنا آیا

کنول شاہین کیتھر ____ تلہ گنگ
مجھ سے گریز چاہیے تو ہر رستہ بدل
میں سنگ راہ ہوں تو بھی سبھی راستوں میں ہوں
مجھ سے بچھڑ کے تو بھی روئے گا عمر بھر
یہ سوچ کر کریں بھی تیری خواہشوں میں ہوں

حرا آصف ____ سرگودھا
سینکڑوں طوفان لفظوں کے دبے تھے زیر لب
ایک پتھر تھا خموشی کا کہ جو ہلتا نہ تھا
یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیم
اب سوائے بھول جانے کے چارہ نہ تھا

فائزہ بھٹی ____ پتوکی
دل میں کسی کی یاد کا طوفان رہ گیا
میں نیم جان سوختہ سامان رہ گیا
آنکھوں میں رشک آ گیا پھولوں کو دیکھ کر
گلشن میری امید کا ویران رہ گیا

انشراح علیم ____ پشاور
میں تیرے ملنے کو معجزہ کہہ رہا تھا لیکن
تیرے بچھڑنے کا سانحہ بھی کمال گزرا

زوہا خان ____ سکھر
دل ٹوٹ بھی جاتے تو محبت نہیں مرتی
اس راہ میں لٹ کر بھی خسارہ نہیں ہوتا

فوزیہ ثمریٹ ____ گجرات
جس نگر بھی جاؤ، قصے ہیں کمبخت دل کے
کوئی لے کر رو رہا ہے، کوئی دے کر رو رہا ہے

رملہ ____ کراچی
روگ ایسے بھی غم یار سے لگ جاتے ہیں
در سے اٹھتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں
عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
بعد میں سینکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں

لبنیٰ خاور ____ فیصل آباد
موسم موسم آنکھوں کو اک سپنا یاد رہا
صدیاں جس میں سمٹ گئیں وہ لمحہ یاد رہا
قوس قزح کے رنگ تھے ساتوں اس کے لہجے میں
ساری محفل بھول گئی، وہ چہرہ یاد رہا

نادیہ حسین ____ گوجر خان
یہ تیری توجہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص تیرے شہر کا برہم ہے میری جاں

ثروت ظفر ____ لانڈھی کراچی
پھر لہو بول رہا ہے دل میں
دم بہ دم کوئی صدا ہے دل میں
دشت بھی دیکھے، چمن بھی دیکھا
کچھ عجب آب و ہوا ہے دل میں

ندا، فضہ ____ کراچی
نہ جانے کون سی منزل پہ آ پہنچا ہے پیار اپنا
نہ ہم کو اعتبار اپنا نہ ان کو اعتبار اپنا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ____ کراچی
حیرت سے سارے لفظ اسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

نادیہ یاسر ____ گلستان جوہر
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا ہوا

لائبہ، ایمن ____ مظفر آباد
زندگی کس طرح بسر ہو گی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

خنا کرن ———— پتوکی

گزر گئے ہیں بہت دن رفاقت شب میں
اک عمر ہو گئی چہرہ وہ چاند سا دیکھے
تیرے سوا کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

نادیہ فیصل، طوبیٰ فیصل ———— گجرات

مار دو بھلے جاں سے پر یہ سزا تو ہمیں نہ دو
کہ ہمارے سامنے بیٹھو اور اجنبی لگو

شبنم حنیف ———— لاہور

ڈھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں ہمیں
زندگی ہم سے بچھڑ کے خود بھی پچھتائی بہت

یاسمین ملک ———— چکوال

زندگی کی تھکن میں گم ہو گیا
وہ لفظ جسے سکون کہتے ہیں

نادیہ یاسر ———— کراچی

زندگی کی تلخیوں نے چھین لی شرارتیں میری
اور لوگ سمجھتے ہیں مغرور ہو گیا ہوں میں

سدرہ عاصم ———— فیصل آباد

ہم سے روٹھا بھی گیا ہم سے منایا بھی گیا
پھر سبھی نقش تعلق کے مٹائے بھی گئے

ایمان سرفراز ———— بھائی پھیرو

یوں تو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
یہ تجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

ثمرہ، اقراء ———— کراچی

اب اندھیروں میں جو ہم خوف زدہ بیٹھے ہیں
کیا کریں خود ہی چراغوں کو بجھا بیٹھے ہیں

علوینہ، فرینہ ———— حیدرآباد

میں زمانے میں بدنام فقط اس لیے ہوں
مجھے دنیا کی طرح بدل جانا نہیں آتا

عائشہ، تحریم ———— گوجرہ

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا

مقدس آصف ———— رلے وند

اس عہد میں ایسی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اس نے، مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدہ دیدار کر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

عابدہ نثار ———— کراچی

اب تو یاد بھی ان کی آتی نہیں
کتنی تنہا ہو گئیں تنہائیاں
فریب کھا ہی گئے اہل جستجو آخر
چراغ ڈھونڈنے آئے تھے شام لے کے چلے

سیدہ لوبا سجاد ———— کھرڑیانوالہ

دوسری بار بھی ہوتی تو اسی سے ہوتی
میں بالفرض محبت کو دوبارہ کرتا

نائمہ ———— کراچی

طب کے ہزاروں نسخوں کے بعد
وہ آئے، مسکرائے اور شفا ہو گئی

اریبہ شمشاد، منیبہ شمشاد ———— کراچی

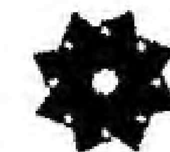
آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

صائمہ سلیم ———— کراچی

دل کا دکھ جانا تو دل کا مسئلہ ہے پر ہمیں
اس کا ہنس دینا ہمارے حال پر اچھا لگا

صدف عمران ———— کراچی

دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے



رمضان کے مشروبات

خالدہ جیلانی

آلو بخارے کا شربت

اشیاء:۔

آلو بخارے	500 گرام
چینی	ایک کلوگرام
کھانے کا زرد رنگ	ڈیڑھ گرام
ایسنس	چند قطرے

ترکیب:۔

آلو بخارے اچھی طرح دھو کر صاف کر لیں۔

آدھے لیٹر پانی میں آلو بخارے ڈال کر رات بھر کے لیے چھوڑ دیں۔ صبح کو اسی پانی میں آلو بخاروں کو ابال لیں۔ دو چار جوش آنے کے بعد چولہے سے اتار لیں۔ چھلکے اور گٹھلی نکال کر پھینک دیں۔

اب اس رس میں چینی ملا کر پکائیں۔ ایک تار کی چاشنی تیار ہو جائے تو ایسنس اور زرد رنگ بھی ملا دیں اور چمچہ چلا کر سب کچھ اچھی طرح ملا لیں، پھر اتار کر ٹھنڈا کر کے اور صاف بوتل میں بھر لیں۔

فالسے کا شربت

اشیاء:۔

فالسے	آدھا کلو
چینی	چھ سو گرام
سیٹرک ایسڈ	آدھا چائے کا چمچہ
پانی	ایک لیٹر

ترکیب:۔

فالسوں کو اچھی طرح صاف کریں۔ تھوڑے پانی میں فالسے ڈال کر ہاتھوں کے ذریعے مسلیں اور گٹھلیاں الگ کریں۔ گودا ملا پانی ململ میں ڈال کر پتلا رس نکال لیں۔ چینی اور پانی ملا کر چینی حل ہونے تک پکائیں۔ پھر چھان کر ایک تار کی چاشنی بنائیں۔ رس ڈال کر تھوڑی دیر تک پکائیں۔ اسے ٹھنڈا کر کے سیٹرک ایسڈ ملائیں۔ اب اس شربت کو صاف خشک بوتلوں میں بھر کر رکھیں۔ اب اس کو انگور کے تیار شربت میں اچھی طرح ملا دیں۔ صاف اور خشک بوتلوں میں اس مشروب کو بھر کر ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں۔ برف اور ضرورت کے مطابق پانی ڈال کر اس مشروب کو پیش کریں۔

کیری کا شربت

اشیاء:۔

کیری	ایک کلو
چینی	ایک کلو
لیموں	چار عدد
کالا نمک	چائے کا آدھا چمچہ

ترکیب:۔

کیری چھیل کر ٹکڑے کر کے ایک برتن میں ڈال دیں اور تین سے چار گلاس پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر چڑھا دیں۔

جب کیریاں نرم پڑ جائیں تو برتن کو چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈی ہونے پر گرینڈ کر لیں اور دوبارہ چولہے پر چڑھا دیں اور چینی ڈال دیں، وقفے وقفے سے چمچہ چلاتی رہیں جب چینی اچھی طرح سے حل ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔

جب ٹھنڈا ہو جائے تو لیموں کا رس اور کالا نمک ڈال کر مکس کریں اور ایک بوتل میں ڈال کر فریج میں رکھ لیں۔

جب ضرورت ہو ایک گلاس پانی میں دو بڑے چمچ ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے پیش کریں۔

روبینہ شریف



نشانی

ایک بادشاہ نے خوشی میں سارے قیدی رہا کر دیے اچانک سے ایک انتہائی عمر رسیدہ شخص نظر آیا۔

بادشاہ نے قیدی کو بلا کر پوچھا۔ ''کب سے قید ہو؟''

بزرگ نے جواب دیا ''آپ کے ابا کے دور سے۔''

یہ سن کر بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

''اسے دوبارہ قید کرو۔ ابا جی کی نشانی ہے۔''

دانیہ عامر.........کراچی

فرماں برداری

ایک شخص کے تین بیٹے تھے۔ ایک انجینئر، دوسرا ڈاکٹر اور تیسرا بینکر تھا۔ اس شخص نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا ہر بیٹا اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر میں ایک لاکھ روپے رکھے گا۔

جب وہ شخص فوت ہو گیا تو اس کی نصیحت کے مطابق اس کی تدفین کے وقت اس کے انجینئر بیٹے نے ایک ہزار روپے والا پورا پیکٹ اپنے والد کی قبر میں رکھ دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر بیٹے نے پانچ ہزار روپے کے بیس نوٹ اپنے باپ کی قبر میں رکھ دیے۔

بینکر بیٹے نے جیب سے چیک بک نکالی۔ تین لاکھ کا چیک کاٹا اور دو لاکھ روپے قبر سے اٹھا کر تین لاکھ کا چیک رکھ دیا۔

غزل.........ملتان

وجہ

دفتر میں ملازمت کے امیدوار سے پوچھا گیا کہ اس نے پچھلی ملازمت کیوں چھوڑ دی تھی؟

''مالکان نے مجھ سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔''

امیدوار نے جواب دیا۔

''کیا کہہ دیا تھا انہوں نے؟''

''یہی......کہ دوسری ملازمت ڈھونڈ لو۔''

تبسم بشیر.........ڈنگہ

معصومیت

ایک شخص پی سی او کے اندر گیا، جیب سے موبائل نکالا اور بات کرتے ہوئے باہر آ گیا۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا۔

''جناب! موبائل سے کال کرنی تھی تو پی سی او میں کیوں گئے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔

''میرے دوست نے کہا تھا پی سی او سے کال کرنا، پیسے کم لگیں۔''

حرما واجد.........کراچی

عقل

ایک بچے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے والد اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا ''زخم کیسے آیا؟''

والد نے جواب میں کہا۔

''یہ دیوار میں پیپر ویٹ کی مدد سے کیل گاڑ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ پیپر ویٹ کے بجائے کسی اور چیز سے کیل گاڑو، کچھ تو عقل سے کام لو، دماغ استعمال کرو، کھوپڑی استعمال کرو اور پھر اس نے پیپر ویٹ رکھ کر کھوپڑی استعمال کی۔''

صائمہ بشیر.........فیصل آباد

ڈر

ڈاکٹر مریض سے ''اب تو آپ خطرے سے باہر ہیں پھر بھی آپ اتنا کیوں ڈر رہے ہیں۔''

مریض نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''جس ٹرک سے میرا ایکسڈنٹ ہوا۔ اس کے پیچھے لکھا ہوا تھا سو ہنیو زندگی رہی تے فیر ملاں گے۔''

لبنیٰ خاور.........فیصل آباد

احتیاط

کسی نے مرزا صاحب پوچھا

''آپ کے خیال میں محبت شادی سے پہلے ہونی چاہیے یا شادی کے بعد؟''

جس پر مرزا صاحب نے ارشاد فرمایا۔

''اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ محبت شادی سے پہلے ہو یا بعد میں بس بیوی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔''

حنا کرن.........چنوکی

رانگ نمبر

شوہر ''جان سوچا کال کر لوں، تم مجھے یاد کر رہی ہوگی۔''

بیوی: ''اور جو صبح لڑائی ہوئی تھی وہ بھول گئے؟''

شوہر: ''او فٹے منہ گھر دا نمبر مل گیا۔''

نادیہ حسین.........گوجر خان

سیلفی

ماں گھبرائی ہوئی بولی۔ ''بیٹا جلدی آ جاؤ، بہو کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ منہ ٹیڑھا، آنکھیں اوپر اور گردن گھوم گئی ہے۔''

''رہنے دیں امی! وہ سیلفی لے رہی ہوگی۔''

بیٹے نے جواب دیا۔

مسرت طارق......آزاد کشمیر

اچھی صحت کا راز

دادا جی نے اپنی 100 ویں سالگرہ کا جشن منایا۔ ہر ایک نے اچھی صحت اور چاق چوبند جسم کا راز جاننا چاہا۔

دادا نے کہا ''میں آپ کو اپنی کامیابی کا راز بتاتا ہوں، میری بیوی اور میں نے 75 سال پہلے شادی کی تھی۔ ہماری شادی کے دن، ہم نے ایک وعدہ کیا تھا۔ کہ ہمارے بیچ جب بھی کوئی جھگڑا ہو گا اور جو غلط ثابت ہو گا وہ سزا کے طور پر 5 کلومیٹر پیدل چلے گا۔ اور میں ان 75 سالوں میں تقریباً روزانہ 5 کلو میٹر چل رہا ہوں۔''

ایک دوست نے مزید پوچھا۔ ''لیکن تمہاری بیوی بھی پتلی اور طاقت ور ہے۔''

دادا نے کہا۔ ''میری بیوی مجھے چیک کرنے کے لیے میرے پیچھے 5 کلومیٹر چلتی ہے کہ چل رہا ہوں یا پارک میں بیٹھا ہوں۔''

ام ہانی......چکوال



کچھ موتی چننے ہیں

ادارہ

محبت

''محبت میں انکار نہیں ہوتا۔ محبوب جب کہے کہ سجدہ واجب ہے تو، تو پھر کربلا کا میدان ہو یا آدم کے دیدار کا سجدہ۔ سجدہ کیا جاتا ہے اگر محبوب صبر کا تقاضا کرے تو پھر شدید بیماری کا عالم ہو یا بیٹے کی جدائی کا صدمہ صبر کیا جاتا ہے اور اگر سامنے آگ ہو اور عشق ثابت قدمی کا خواہش مند ہو تو آگ میں بھی بلا خوف وخطر کود لیا جاتا ہے اور اگر محبوب دوران نماز قبلہ بدلنے کا حکم دے تو سوال کے بغیر کہ کیوں بدلنا ہے؟ باجماعت قبلہ بدل لیا جاتا ہے کیونکہ محبت میں انکار نہیں ہوتا۔ (عمیرہ احمد.........آب حیات)

اقراء عزیز.........گاؤں دریا خان جلبانی

خوف

خوف کا پسندیدہ مسکن اس انسان کا دل ہے، جس میں احساس گناہ تو ہو لیکن گناہ چھوڑنے کی طاقت نہ ہو۔ خوف زدہ انسان کی ہر بازی مات ہر جنگ شکست اور ہر کوشش ناکام ہوتی ہے۔ خوف خوراک سے طاقت اور نیند سے راحت چھین لیتا ہے۔ سب سے بدقسمت ہے وہ انسان جو اپنے مستقبل سے خائف ہو۔ جدا ہونے والے ہمراز اور ادب نہ کرنے والی اولاد سے خوف آتا ہے۔

اگر خیال کی اصلاح ہو جائے تو خوف دور ہو سکتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں پر توبہ کر لی جائے تو خوف دور ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک کے فضل پر بھروسا کر لیا جائے اور اس کی رحمت سے مایوسی نہ ہونے دی جائے تو خوف نہیں رہتا۔ (واصف علی واصف کی کتاب ''دل دریا سمندر'')

کنول شاہین قیصر تلہ گنگ

غلام قومیں

بابا کہتے ہیں۔

''یہاں کوئی فرض ادا کرنے والا نہیں، اسی لیے تو اکثریت کو حقوق نہیں ملے۔ غلام قوموں کی عمریں، زندگی کی گاڑی کھینچتے کھینچتے گزر جاتی ہیں ان کی زندگیاں کتاب، علم اور روشنائی سے خالی ہوتی ہیں۔ ہاتھ میں قلم کے بجائے عقیدے کا خنجر ہوتا ہے اسی لیے یہاں انسانیت لہولہو پھرتی ہے یہاں محبتیں، ہجر اوڑھ لیتی ہیں اور آنکھ میں ٹھہرے لوگ اجل کی جھیل کے ٹھہرے ٹھنڈے یخ پانی کی تہ میں اتر جاتے ہیں۔ غلام قوموں سے علم اٹھا لیا جاتا ہے اور جہاں علم کی پیاس مر جائے۔ تو وہاں خون کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے۔'' میں لفظوں کی جگالی کرنے والا شخص تھا مگر میرا باپ ہمیشہ گہرے چپ کی بکل لیے پھرتا ہے وہ اکثر کہتے ہیں کہ ''جہاں شور ہوگا وہاں شعور نہیں ہوگا۔'' (دم ...طارق بلوچ صحرائی)

اقراسرور.........ڈی جی خان

ایک چپ

پہلے میں سمجھا کرتی تھی چپ زہر ہے اور سناٹے موت کے سائے ہیں! اب مجھ پر کھلا کہ چپ تو معرفت ہے...... چپ تو سمندر ہے...... چپ تو جوگ ہے...... چپ تو پاس انفاس ہے...... چپ تو تزکیہ نفس ہے...... چپ تو گویائی کا مینار ہے...... اندر کی ہر گرہ کھلتی جاتی ہے...... ہر روزن روشن ہو جاتا ہے تو باہر کے گلے شکوے ختم ہو جاتے ہیں......اسی کو شاید خودشناسی کہا گیا ہے مگر کتنی کانٹوں ابھری راہوں کو عبور کر کے بندہ یہاں تک آ جاتا ہے! مگر جب آ جائے تو سہاروں سے بے نیاز ہو کر، اس جہان مرغ و ماہی کی ساری مصلحتیں سمجھنے لگ جاتا ہے......

صائمہ سحر.........فیصل آباد

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین





صومیہ عنایت......پشاور

س۔ کتے، بلی اور گھوڑے میں سے زیادہ وفادار جانور کون سا ہے؟

ج۔ اتنی سی بات نہیں پتا...... تمہیں...یا بلی سے ویسے ہی کوئی دشمنی ہے۔

منزہ اختر......گوجرانوالہ

س۔ بھیا! سنا ہے کہ آپ پچھلے جنم میں مجنوں تھے، کیا واقعی؟

ج۔ صرف پچھلے جنم میں ہی کیوں۔

حسینہ تجمل حیدری......پنڈدادنخان

س۔ نفرت کو محبت میں بدلنے کا طریقہ تو عنایت فرمائیں؟

ج۔ محبت صرف محبت۔

عامرہ نیر اقبال......فیصل آباد

س۔ بھیا جی! ذرا جلدی......روتے ہوئے کو چپ کرانے کا آسان طریقہ بتا دیجیے؟

ج۔ خوب صورت سا کوئی جھوٹ بول دیجیے۔

شبانہ میمن......میر پور خاص

س: ''فرض کرو کہ اگر سگریٹ پینے پر پابندی لگ جائے تو تم تصویریں کیسے کھنچوایا کرو گے کیونکہ تمہاری تصویریں تو سگریٹ کی بنا ادھوری ہوتی ہیں۔ کہیں گنڈاسا تو نہیں پکڑ لو گے؟''

ج: ''تمہارا مشورہ اچھا ہے، عمل کرنے کی سوچیں گے۔''

ناصرہ عفت......کراچی

س: ''یہ تو سب کو پتا ہے کہ جب انسان کو بے پناہ غم ملتا ہے تو وہ رو دیتا ہے مگر جب کوئی خوشی ملتی ہے تو تب بھی یہ آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں؟''

ج: نازک آنکھیں، برداشت کا مادہ کم جو ہوتا ہے ان میں۔''

طاہرہ گل تاس......کلرسیداں

س: ''ذوقی بھائی! یہ بتائیں کہ جو درد ملتا ہے ہمیشہ اپنوں سے ہی کیوں ملتا ہے؟''

ج: ''کیونکہ پھر غیروں سے شکایت کون کرے۔''

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

ثناء ذوالفقار............نورے والی رحیم یار

اپریل کا ٹائٹل پسند آیا۔ ''انٹرویو'' میں روبینہ عارف سے ملاقات اچھی رہی ''میری سنیئے'' میں عائشہ جہاں زیب کی سنی۔ ریڈیو سے دلچسپی نہیں ہے اس لیے ''آواز کی دنیا سے'' نہیں پڑھتی۔ ''شب نم کی سحر'' رخ چوہدری کے ناول کا نام بہت اچھا لگا لیکن کہانی اتنی خاص نہیں لگی۔ خیر ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے آگے بڑھے گی تو مزا آئے گا۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کہانی کو بہت اچھے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ حمزہ کو حسان صاحب کا آفس جوائن نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ''ڈھل گئی دھوپ'' صدف ریحان نے بہت اچھا لکھا۔ اریزہ کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ شکر ہے کہ اینڈ میں مناقب کو ساری حقیقت پتا چل گئی۔

''ہم ستارے ہوتے'' سدرۃ المنتہیٰ کا انداز تحریر مجھے ویسے ہی بہت پسند ہے اس تحریر میں بھی انہوں نے بہت اچھے جملے لکھے۔

''خاندان'' مزمل سلیم نے بہت اچھا پیغام دیا۔ 'محبت کا پھیلاؤ'' بھی بورنگ سی اسٹوری تھی بالکل اچھی نہیں لگی۔ ''بہت دیر کردی'' سبق آموز تحریر تھی۔ مقصود نے واقعی بہت دیر کردی۔ ''انکل پیار محبت'' اور ''دلہن وہی جو'' بھی اچھے افسانے تھے۔

اس مرتبہ منشا محسن علی کی کمی محسوس ہوئی پلیز ان کی تحریر ضرور شامل کیا کریں۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں اقراء جٹ نے سوالات کا بہت اچھا مقابلہ کیا۔

''مسکراتی کرنیں'' نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' میرا فیورٹ سلسلہ ہے پلیز اسے دو صفحات کا تو دیا کریں۔

ج: پیاری ثناء! اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

صائمہ سحر............فیصل آباد

میں پہلی بار کرن میں شرکت کررہی ہوں۔ آج چند افسانوں پر تبصرہ کروں گی۔ آئندہ ان شاءاللہ پورے رسالے پر کروں گی۔ ماڈل خوب صورت تھی۔ روبینہ عارف کو پڑھ اچھا لگا۔ اور F.M کے حماد اسماعیل کی سب باتیں بہت کام کی تھیں۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں اقراء جٹ کے بعض جواب بہت اچھے لگے۔ میں بھی اس میں شمولیت کرنا چاہتی ہوں کیا جگہ مل جائے گی؟ مزمل سلیم کا ''خاندان'' ہمارے معاشرے کی محدود سوچ کی عکاسی کرتا دل کو چھو گیا۔ ''سب محبت کا پھیلاؤ'' سیما بنت عاصم نے اچھا لکھا۔ اس افسانے میں مجھے ''اپنی جھلک نظر آئی۔ جو لوگ ہمیشہ اپنی منواتے ہیں وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں'' ''دلہن وہی جو پیا من بھائے'' سویرا فلک نے ایک خودسر لڑکی بہت اچھا لکھا۔ دل کو بہت بھایا۔

میرا بھتیجا آفاق ''اس نے جلدی جلدی کا شور مچا رکھا ہے اسی نے خط پوسٹ کرنے جانا ہے۔ میں کرن کے ہر سلسلے میں شمولیت کی متمنی ہوں۔ پلیز مجھے بزم میں لازمی جگہ دیجیے گا۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔ مختصر تبصرے پر شرمندہ ہوں آپ یہ بھی بتادیں کہ خط کس تاریخ تک بھیجا جاسکتا ہے؟

ج: پیاری صائمہ سحر! آپ ہر ماہ کرن کی محفل میں شرکت کرسکتی ہیں۔ ''مقابل ہے آئینہ'' ہو یا کوئی اور سلسلہ آپ ہر سلسلے میں شرکت کرسکتی ہیں۔ آپ کا خط اگر ہمیں 28 تک بھی مل جائے گا شائع کردیا جائے گا۔

ثناء شہزاد............کراچی

اپریل کا کرن 14 تاریخ کو ملا سرورق پسند آیا حمد ونعت پڑھ کر سب سے پہلے ''نامے میرے نام'' پر انٹری دی یہ دیکھنے کے لیے کے وہاں میرا تبصرہ نہ ہونے کی وجہ سے محفل کتنی سونی ہے۔ پچھلے مہینے طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی تو اس بار 3 دن میں پورا کرن چاٹ لیا۔ انٹرویو جلدی جلدی پڑھ ڈالے اقراء جٹ کے جوابات مزا دے گئے اس کے علاوہ ایک بات اور کرن کتاب وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہترین ہوتی جارہی ہے۔ اس بار ماشاءاللہ آٹھ افسانے تھے جنہیں دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا ماورا طلحہ کا افسانہ اچھا لگا' محبت کے ساتھ' تکیہ کلام انکل کا تھا ہم نے بھی محبت کے ساتھ پڑھا نظیر فاطمہ کا ''بہت دیر کردی'' میں مقصود نے واقعی میں دیر کردی۔ انسان کی زندگی میں ہمیں ان کی قدر نہیں ہوتی ان کے جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کیا کھو دیا ''وہ رات' قراۃ العین کا لاجواب تھا۔ بہت خوب صورت پیغام تھا جو شوہر اپنے بیوی بچوں کے خاطر اپنا [illegible] آرام سب تیاگ دیتا ہے ہم اس کے ذرا [illegible] دینے پر اتنی باتیں سنانے لگتے ہیں کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ''زرمینہ'' نبیلہ خان نے اچھی لکھی کاش اس سے ہر لڑکی سبق سیکھے۔ سویرا فلک کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں دلہن واقعی میں وہی ہونی چاہیے 'جو پیا من بھائے' پیا کے من کے علاوہ تھوڑی سی سسرال والوں کے من کو بھی بھا جائے تو کیا کہنے کیوں کہ سارا دن تو گھر والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ''خاندان'' مزمل سلیم کی ہلکی پھلکی تحریر اچھی لگی ''راز بشریٰ ماہا کا سب سے زیادہ پسند آیا لیکن آج کے دور میں یہی تو المیہ ہے کہ بہو کو بیٹی کا درجہ کوئی نہیں دیتا جس کی وجہ سے اتنے مسئلے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ''سب محبت کا پھیلاؤ'' سیما بنت عاصم نے اچھا لکھا رخ چوہدری کا ناول ''شب نم کی سحر'' پہلی قسط پڑھی پسند آئی نگہت عبداللہ، کہانی کو خوب صورتی سے آگے لے کر چل رہی ہیں ربیکا کامیاب ہوجائے گی۔ حمزہ کو چھین لے گی شہرینہ سے اس کے علاوہ تیمور غزنی سارہ کو دھوکے میں نہ رکھے۔ ام طیفور اور تنزیلہ ریاض کی اسٹوری پر تبصرہ محفوظ ہے مکمل ہونے پر کروں گی صدف ریحان کی تحریر پسند آئی'' ہم ستارے ہوتے'' سدرہ المنتہیٰ نے بھی بہت زبردست لکھا۔

ج: پیاری ثناء! ہر ماہ کرن پر آپ کا تبصرہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ جس ماہ آپ غائب ہوتی ہیں تو آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

انوش ابصار............قائداعظم یونیورسٹی

آج کل اتنی بزی تھی کہ بتا نہیں سکتی نیا گھر بنوایا ہے وہ چینج کرنا اُفف بڑا مرحلہ ہے ابھی تو پیکنگ ہورہی ہے سو مصروفیت ہی مصروفیت میں کرن لیا۔ ہمیشہ وقت پر پڑھنے میں دیر ہوگئی مجھے تو سب کہانیاں ہی کمال لگیں ''شب نم سحر'' کے سب سے پہلے تو پیج زیادہ کیے جائیں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئی'' یہ دونوں سلسلے وار ایک جیسے ہی لگ رہے ہیں نہ تو دل کو یک دم ٹھا کر کے لگنے والے نہ ایویں ہی سو سو۔

تنزیلہ آپی کی تحریر مجھے بہت پیاری لگی عاجزم میں [illegible] کا کردار بہت پسند آیا۔ سدرہ آپی کا ناول ''اگر ہم ستارے ہوتے'' [illegible] آپی ہم ستارے ہیں سچی میں اس ماہ کی [illegible] کہانی۔ سدرہ آپی کی لگی باقی افسانے اس بار بہت سارے اور بڑے مزے کے تھے بہت شکریہ۔

ج: پیاری انوش! اپنی مصروفیات کے باوجود آپ نے اس ماہ بھی کرن پر تبصرہ کیا کرن سے محبت کا بے حد شکریہ۔

لاریب انعم............لاڑکانہ

اس ماہ ہمیشہ کی طرح مجھے کرن بہت اچھا لگا ساری کہانیاں سپرڈوپر تھیں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کی کہانیاں عام ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے اردگرد کی لگتی ہیں جس طرح اپنے محلے گلی کی ہوں' ویلڈن نگہت آپا! ''من مورکھ'' کی جگہ لی ''شب نم کی سحر'' رخ چوہدری نے بہت عرصے بعد جلوہ افروز ہوئیں جس طرح کہانی نے اسٹارٹ لیا ہے تو تعارفی قسط سو سو لگی شگفتہ تو شگوفہ ہی لگی۔ لگتا ہے ساس بہو کی روایتی لڑائی پر مبنی ہوگا ناول لیکن ظاہر ہے کہانی تو دو چار اقساط کے بعد ہی سامنے آئے گی۔ صدف ریحان کا ناولٹ اچھا تھا۔ ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں ناولٹ بھی سبق آموز تھا۔ افسانوں میں جو نمبر ون رہا سعیدہ عمیر کا ہے۔

ج :۔ پیاری لائبہ: کرن میں سعیدہ عمیر کا افسانہ شائع نہیں کیا گیا ہے۔ کرن کی کہانیوں پر تبصرہ کرنے کا

شکریہ۔

سوہنیا نظیر..........فیصل آباد

مابدولت چند دن پہلے فارغ ہوئی ہوں پیپرز سے 'اب مزے ہی مزے۔ جی تو بات کروں کرن پر تو اس ماہ کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ اب کی دفعہ کرن اچھا تھا۔ مگر حنبل ذکا اور روائیہ کی یاد مٹانے میں ناکام ہی رہا۔ میں نے تو پرانے کرن بھی ڈھونڈ لیے پھر سے مجبور نشیمن پڑھنے کے لیے تنزیلہ آپی ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ام طیفور کی ''من عاجزم من بے کسم'' اچھی لو اسٹوری۔ صدف ریحان گیلانی واہ واہ واہ تسی تے میلہ ہی لوٹ لیا۔ سوہنیو ان کے باقی ناولز کی طرح سبق آموز بہترین کہانی دل رج کے خوش کیتا۔ باجی سدرہ کا ناول بھی اچھا لگا افسانے بہت سارے تھے سارے ہی گڈ' اسپیشلی مادر اطلحہ کا ہارٹ ٹچنگ۔ اب کسی ایونٹ پر اسٹوڈنٹس سے سروے کیجیے گا۔

ج: پیاری سوہنیا! اسٹوڈنٹس کا شمار قارئین میں ہی کیا جاتا ہے آپ قارئین سے کیے گئے سروے میں شامل ہوسکتی ہیں۔

نورالعین..........سرگودھا

جس طرح لوگ کرن کی جانب مائل ہو رہے یہ آپ کی محنت کا حاصل ہے بہت شکریہ! اس ماہ کا رسالہ بھی مزے کا تھا سچ یہ ہے کہ اس ماہ قسط وار سے زیادہ مکمل ناول پسند آئے صدف ریحان اور سدرہ جیلانی نے کمال کا اور بہت ہی پرلطف لکھا سدرہ بہت عرصے بعد آئی ہیں پلیز جلد لکھا کریں۔ تنزیلہ جی کے ناولٹ کی یہ قسط پہلے سے بھی ٹائٹ لگی۔ سپر فاسٹ ہلکی پھلکی کہانی پر مستقل سلسلے سارے ہی اچھے ہوتے ہیں خاص کر اشعار والا صفحہ اور اقتباسات بہت پسند آتے ہیں۔

ج: پیاری نورالعین! کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

ارم بشیر..........اسلام آباد

اس ماہ کا ٹائٹل بھی پچھلی بار کی طرح بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے عائشہ جہاں زیب کا انٹرویو پڑھا اچھا لگا۔ حماد اسمائیل اور اقراء جٹ کی باتیں بھی اچھی لگیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف رخ چوہدری صاحبہ کافی عرصے بعد آئی ہیں اور خوب آئی ہیں۔ خالص اردو اور خالص پنجابی کا ملاپ واہ مزا آئے گا آگے چل کر بھی ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' بھی اچھا جا رہا ہے۔ ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' یہ التمش کیا چیز ہے اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا بھائی صاحب! التمش کی ماں نے تو رشتے کی زبان دے کر کہانی میں ٹویسٹ پیدا کر دیا ہے اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اب ذرا بات ہو جائے ام طیفور کی ایک تو ان کے ناول کا نام بے حد پسند آیا ہے ''من عاجزم من بے کسم'' واہ! بہت ہی خوب صورت۔ کیا بات ہے جی لیکن ٹریجڈی بھی خوب دکھائی آپ نے برہان کی فیملی کے ساتھ جو ہوا اور مدیحہ رحمانی کے بے بسی سے بھرے آخری الفاظ میں تو سچ میں رو پڑی۔ افسانے سب ہی اچھے تھے لیکن ''زرینہ'' نے بہت بور کیا ''خاندان'' سب سے بیسٹ رہا باقی ''راز' اور ''بہت دیر کر دی'' میں رائٹرز نے اچھا میسج دیا ماورطلحہ نے بھی اچھا لکھا ''انکل پیار محبت والے انکل مجھے تو اچھے لگے آخر میں آیتہ نے اچھا فیصلہ کیا ''ڈھل گئی دھوپ'' بھی بہت زبردست تھا شکر ہے۔ عائزہ کو آخر میں اس کے صبر کا پھل ملا۔

ج: پیاری ارم! آپ کہاں غائب تھیں۔ اس ماہ کرن پر تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

اقراء ممتاز..........سرگودھا

اس دفعہ کرن کی ٹائٹل گرل نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ روبینہ عارف اور میری بھی سنیئے میں ''عائشہ جہاں زیب'' سے ملاقات کی۔ اب آدھی ملاقات سجل علی سے ہی کروا دیں۔

''مقابل ہے آئینہ'' اقراء جٹ کے جواب دلچسپ لگے۔ باپ رے باپ! اقراء جی تم اپنوں سے اتنی بیزار ہو چکی ہو اچھی لڑکی ہمیشہ خوش رہو۔

سب سے پہلے نیا ناول ''شب نم کی سحر'' پڑھا۔ پہلی قسط ہی سپر ہٹ تھی۔ شگفتہ کو اپنے نام کی طرح شگفتہ پایا۔ ظہیر یہ کہاں کی مردانگی ہے کہ عورت پر ہاتھ اٹھایا جائے۔ رقیہ تمہاری عظمت کو سلام۔ اتنا کچھ ہو جانے پر بھی ظہیر درانی کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ایک طرف ظہیر درانی جیسا آدمی اور دوسری طرف علیم الدین جیسا ہنس مکھ انسان۔ اگلی قسط بھی اسی طرح کی کھٹی میٹھی ہوگی۔

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' حمزہ کا دوبارہ آفس جانا اور ربیکا کے ساتھ گھومنا کچھ ہضم نہیں ہو رہا ہم تو شہرینہ کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ربیکا جیسی چڑیل کے ہوتے ہوئے حمزہ شہرینہ کو مل جائے۔ خزینہ تمہیں بھی مبارک ہو۔ ''اگر ہم ستارے ہوتے'' سدرۃ المنتہیٰ نے دو طرح کے لوگ دکھائے ہیں ایک طرف علینہ جیسی لڑکی جو کما کر بھی لاتی ہے پھر بھی اپنے میاں عدیل سے کبھی جھگڑا نہیں کیا اور دوسری طرف نینا جیسے لوگ' شک کی بنا پر اپنا گھر برباد کر بیٹھتے ہیں۔ یہ شک رشتوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے۔

''ڈھل گئی دھوپ'' اریزہ کی اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں، شکر ہے مناقب نے بروقت فیصلہ کر کے اپنے گھر کو بچا لیا۔

''غم ہے یا خوشی'' تنزیلہ ریاض کے کیا کہنے، یہ کمال کی اسٹوری لائی ہیں۔

افسانہ ''سب محبت کا پھیلاؤ'' عفان جی تمہاری محبت کا ہی یہ سب پھیلاؤ تھا۔ کرن تمہاری سوچ پر بہت افسوس ہوا۔ عفان کے گھر کو بھی اپنے میکے جیسا گھر سمجھتیں تو کیا ہی بات ہوتی۔ ''خاندان'' بھلی سی اسٹوری لگی۔

ج: پیاری اقراء ہمیشہ کی طرح آپ کا تبصرہ اچھا لگا اور ہر ماہ اپنی رائے کا اظہار کیا کریں۔

تبسم بشیر حسین..........ڈنگہ

اس دفعہ کا کرن کافی انتظار کے بعد 12 کو ملا ٹائٹل گرل کی چوڑیاں اچھی تھیں سب سے پہلے اداریہ پڑھا اس کے بعد حمد و نعت سے ایمان کو تازہ کیا۔ اس کے بعد چھلانگ لگائی ''نامے میرے نام'' پر۔ پر یہ کیا! میں اس ماہ بھی شامل نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری کیا غلطی ہے کہ میرا خط شامل نہیں ہوتا ہے؟ ''کرن کرن خوشبو'' پسند آیا۔ نگہت عبداللہ کا ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' بہت اچھا جا رہا ہے۔ ''شب نم کی سحر'' کی پہلی قسط ٹھیک تھی، آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا؟ تنزیلہ کی ''غم ہے یا خوشی'' کچھ متاثر نہیں کر پائی۔ افسانوں میں خاندان، محبت کا پھیلاؤ، دلہن وہی اور بہت دیر کر دی ہی پڑھے لاجواب لکھا ان ساری رائٹرز نے ابھی مصروفیات کی وجہ سے اتنا ہی پڑھ سکی ہوں اور پلیز مصباح علی سید سے پھر سے کچھ لکھوائیں ان کے بغیر مزا نہیں آ رہا ہے امید کرتی ہوں کہ اس دفعہ مجھے ''نامے میرے نام اور دیگر سلسلوں میں جگہ ملے گی؟

ج: پیاری تبسم! آپ کے خطوط دیر سے ملنے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ جو خطوط ہمیں اٹھائیس تک مل جاتے ہیں وہ ضرور شائع کیے جاتے ہیں آپ کرن کے مستقل سلسلوں شرکت کر سکتی ہیں۔

فائزہ بھٹی..........پتوکی

اپریل کا شمارہ 15 کو ملا، ٹائٹل اچھا لگا تھا ہم سب لوگ فہرست پر نظر دوڑائی افسانوں کی ایک لمبی لائن دیکھنے کو ملی حمد و نعت کے بعد سب سے پہلے ''مقابل ہے آئینہ'' کی اقراء جٹ کو پڑھا۔ اقراء سدا سلامت رہو، اچھا لگا پڑھ کر ''شب نم کی سحر'' رخ چوہدری کو کافی عرصہ بعد پڑھا ابھی پہلی قسط پڑھی ہے۔ آئندہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ شگفتہ بیگم کی باتیں سن کر اچھا خاصا غصہ آ سکتا ہے اگر کوئی نارمل انسان ہے تو اسماء، ثمینہ اللہ تم لوگوں پر رحم کرے۔ ایسے مرد برداشت کرنا بہت دل

کچن اور آپ

اس ماہ ''نادیہ علی'' کو ''کچن اور آپ'' میں انعام کا حق دار قرار دیا ہے۔ ادارے کی طرف سے نادیہ علی کو تین ماہ کے لیے ''ماہنامہ کرن'' مفت دیا جا رہا ہے۔

گردے کا کام ہے۔
''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔حمزہ تمہیں میں نے کہا تھا اس چڑیل سے جان چھڑاؤ اور تم کیا کرنے لگے ہو۔شہرینہ ذرا خبر رکھو۔
خزینہ، تیمور غزنی مبارک ہو تمہیں۔تیمور غزنی اب اچھے رہنا۔تم اچھے ہی، اچھے لگتے ہو۔
''غم ہے یا خوشی'' اچھا خوب صورت ناول ہے۔
التمش تمہاری اتنی بے ہودہ باتیں پڑھ پڑھ کر دل کیا، میں بھی تمہیں دل بھر کر یہ بددعا دوں کہ اللہ کرے تمہیں سونیا سے محبت ہو اور جان لیوا ہو پھر تجھے پوچھوں۔
''ہم ستارے ہوتے'' لومیرج کی غم ناک کہانی۔
''من عاجزم'' اس شمارے کی سب سے اچھی کہانی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اگر پوری پڑھنے لگ جاؤں تو خط رہ جائے گا۔امی شہر جا رہی ہیں بہنوں کا پیپر ہے اور دوسرا پیپر دس دن بعد ہے۔ اور اتنے دنوں میں خط بھیجنے کی تاریخ نکل جائے گی۔
ام طیفور اوزئے کا مطلب بتادیں، اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ پڑھ کر خوب مزا آرہا ہے۔
ایسی اچھی اچھی کہانیاں ہر ماہ ہونی چاہئیں۔صدف معذرت خواہ ہوں آپ کی کہانی پڑھ نہیں پائی۔ مانگے کا کرن ہے جو خط لکھنے کے لیے کزن سے ادھار لے کر آئی ہوں۔اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بیماری میں لکھے گئے خط کو آپ نے پذیرائی بخشی، اچھا لگا۔

ج: پیاری فائزہ! شکر اللہ کا آپ کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے اللہ آپ کو مکمل صحت و تندرستی دے آمین۔
'اوزئے' ہرن کے بچے کو کہتے ہیں۔

شبنم حنیف..........لاہور گاؤں شہزادہ
کرن اس بار 17 کو ملا ٹائٹل زبردست تھا۔ مستقل سلسلوں میں ''کرن کرن خوشبو''، ''یادوں کے دریچے سے'' اور ''مسکراتی کرنیں'' زیادہ پسند ہیں۔نگہت عبداللہ کے ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کی چھٹی قسط بھی زبردست تھی رخ چوہدری کے نئے ناول ''شب نم سحر'' کی پہلی قسط ہی انٹرسٹنگ تھی۔ باقی کا کرن ابھی مصروفیت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکی۔ان شاءاللہ پیپرز کے بعد بھرپور تبصرہ کیا کروں گی۔

ج: پیاری بہن شبنم! پہلے پڑھائی ہی اہم ہے ہماری دعا ہے کہ آپ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔اپنی تحریر کے بارے میں آفس نمبر پر فون کر کے معلوم کرلیں۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران آمنہ رئیس...... گجرات
اپریل کا شمارہ اس بار خاصا لیٹ ملا۔ٹائٹل بھی بس نارمل سا لگا۔روبینہ عارف سے ملاقات اچھی لگی۔ ''میری بھی سنیے'' میں عائشہ جہاں آئیں اور چھا گئیں۔سب سے پہلے ام طیفور کو پڑھا۔ناول کا نام مشکل تھا۔معنی بھی معلوم نہیں اور پھر اتنی اچھی تحریر اور باقی آئندہ۔اگلی قسط کا شدت سے انتظار لگ گیا ہے۔امیر حمزہ کے ایٹی ٹیوڈ سے اندازہ لگانا مشکل ہو رہا ہے کہ وہ سچ میں محبت کے دریا میں ڈوب چکا ہے یا دل پشوری کر رہا ہے۔دوسرا ناول اور ہم ستارے ہوتے'' سدرہ جی تسی تے ساڈا دل جیت لیا اے۔ناولٹ ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' لگتا ہے۔اب التمش بری طرح پھنس گیا۔سونیا نے اس غرور کے ایورسٹ کو پاش پاش کردینا ہے پھر دیکھتے ہیں کیسے تڑیاں لگاتا ہے میں التمش ہوں غرور سیتا ہے مجھ پر۔
''ڈھل گئی دھوپ'' روایتی کہانی، یہاں یہ تو ہے کسی نقصان کے بغیر عائزہ کے عقل ٹھکانے لگی۔چلو کوئی گل نہیں صبح کا بھولا شام نوں لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں بھولے بادشاہ کہتے ہیں۔نانی اور نواسی کی باتیں اچھی لگی۔

افسانوں کی تو اس بار [illegible] ''انکل پیار محبت'' مجھے بہت پسند آیا۔[illegible] نے اور سلسلے وار دونوں ناول ٹائم نہ ہونے کے باعث نہیں پڑھ سکی۔ سارے مستقل سلسلے پسند آئے۔ 17 تاریخ کو کرن ملا تھا۔قسم سے بڑی مشکل سے پڑھا ہے پلیز شامل ضرور کرنا۔

ج: پیاری فوزیہ! آپ تو ہماری مستقل قاری ہیں آپ کا خط ہم تک پہنچے اور شائع نہ کیا جائے ایسا تو ہوسکتا نہیں۔کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔